

# اسلام کی طرف دعوت

## (الدعوة الى الاسلام)

احمد محمود  
احمد محمود

کتاب الوعى (3)

پہلا ایڈیشن : 1415ھ - 1995م

اردو ترجمہ : 1445ھ - 2023ء

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

فَلِذَلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ  
أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ  
كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا  
وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ  
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ  
الْمَصِيرُ (الشورى: 15)

”لہذا (اے پیغمبر!) تم اُسی بات کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو، اور جس طرح  
تمہیں حکم دیا گیا ہے، (اسی دین پر) جے رہو، اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ  
چلو، اور کہہ دو کہ: میں تو اُس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے، اور مجھے  
حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا بھی رب ہے، اور تمہارا  
بھی رب۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے  
درمیان (اب) کوئی بحث نہیں۔ اللہ ہم سب کو جمع کرے گا، اور اسی کے پاس

آخر سب کو لوٹنا ہے۔“ (الشوری: 15)

## فہرست

6	تعارف
18	اسلام کی دعوت کو پہنچانے کی اہمیت
35	دعوت کے کام میں ایمان کی اہمیت اور ترجیحی فرائض
84	دعوت کی حامل جماعت کا وجوب
114	دارالاسلام قائم کرنے کی کیفیت
175	شرعی طریقہ کے مخالف پیش کئے جانے والے طریقے
203	احکامات کو سمجھنے کا اسلامی طریقہ
228	جماعت کی ثقافت
242	جماعتی کام کے لیے لازمی افکار کی تبنی کی فرضیت
251	کیا اسلام کی طرف دعوت دینے والی جماعتوں کا ایک سے زائد ہونا جائز ہے؟
286	تدرّج
317	مبداء (آئیڈیالوجی) کی بطور فکر اور طریقہ کے پابندی

- یہ بات کہ جمہوریت کیا ہے؟ زندگی میں اس کے نفاذ نے کیا نتیجہ نکالا؟ یہ ایک الگ داستان ہے  
333
- کفر نظام میں شامل ہونا اور حصہ دار بننا  
349
- سیدنا یوسف علیہ السلام اور کفریہ نظام کے ذریعے حکومت  
365
- مصلحت کے بہانے حرام کو حلال کرنا  
394
- حرام کو حلال کا وسیلہ نہیں بنایا جاسکتا  
430
- پیوند کاری اور بنیادی تبدیلی  
452
- کیا رسول اللہ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والے نجاشی کی جانب سے کفریہ قوانین کے ذریعے  
461
- حکمرانی کو قبول کیا؟!
- اعتدال پسندی اور شدت پسندی  
472

## تعارف

الحمد لله رب العالمين، والصلوة والسلام على خاتم الانبياء والمرسلين، المبعوث رحمة للعالمين، محمد بن الامين وعلى آله وصحبه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين، وبعد،

یہ کتاب - الدعوة الى الاسلام (اسلام کی طرف دعوت) - اسلام کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک موضوع کے بارے میں ہے جو وسیع پیچیدہ اور حساس ہے، ایسا موضوع جو پیچیدہ ہے سادہ نہیں۔ ماضی کے علماء اور مجتہدین (رضوان اللہ علیہم) نے اس موضوع پر اس طرح سیر حاصل بحث نہیں کی جس طرح انہوں نے دیگر اسلامی موضوعات مثلاً عبادات، معاملات، شادی اور وراثت وغیرہ پر گفتگو کی ہے اس موضوع یعنی 'اسلام کی دعوت' پر انہوں نے جو گفتگو کی ہے اکثر انفرادی دعوت یعنی تزکیہ نفس وغیرہ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر (انفرادی) کے گرد گھومتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ خلافت اسلامی کو جڑ سے اکھاڑ دیا جائیگا، اسلامی ریاست کو منہدم کیا جائے گا، شریعت اسلامی کو معطل کیا جائے گا اور تمام اسلامی خطوں کو دارالاسلام سے دارالکفر میں تبدیل کیا جائے گا۔ اس قسم کا کوئی خدشہ دل میں آ بھی جاتا تو اس مسئلہ کا حل اور علاج پیش کرنا ان کی بس کی بات نہیں تھی، کیونکہ مجتہد صرف واقع شدہ مسائل کا حل دے سکتا ہے وہ کسی خیالی مفروضہ یا متوقع امور کا جواب نہیں دیتا۔

اس لئے یہ کتاب اس موضوع میں صرف حصّہ ڈالنا ہے، ہمارا یہ دعویٰ نہیں کہ اس موضوع پر یہ ایک جامع اور مکمل کتاب ہے۔ تاہم یہ اس موضوع کو نمایاں کرنے، انحطاط اور خواہشات سے بلند کرنے اور کفار کی تقلید سے ہٹا کر صحیح اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔

یہ کتاب (الدعوة الى الاسلام) دعوت کے فرائض اور مندوبات کی تفصیل کی بہ نسبت دعوت کی کیفیت پر توجہ مرکوز کرتی ہے کیونکہ موجودہ حالات میں اس کی کیفیت کو سمجھنا سخت ضروری اور دوسرے پہلوؤں کو سمجھنے سے زیادہ اہم ہے۔

یہ کتاب (اسلامی خلافت کے قیام کی دعوت کی کیفیت) پر توجہ مرکوز کرتی ہے کیونکہ یہی پہلو اسلام کی طرف دعوت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت اسلام کی طرف جو بھی دعوت ان حالات میں جب اسلامی ریاست موجود نہیں اگر اسلامی ریاست کے قیام کی دعوت نہیں تو وہ دعوت جزوی اور راہِ راست سے بھٹکی ہوئی دعوت ہے۔

\* کتاب کا موضوع چونکہ (اسلام کی طرف دعوت) تک محدود ہے اور اس دعوت کی (کیفیت) پر ہی توجہ مرکوز رکھتی ہے خاص کر (خلافت کے قیام کی کیفیت) پر اور اسلام کی بنیادی باتوں سے بحث کا اگرچہ یہ کتاب محل نہیں مگر ان پر مختصر بحث کرتی ہے جیسا کہ:

1- اسلامی عقیدہ کی شفافیت اور سُستھراپن اسلام میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

2- اسلامی عقیدہ کے ارکان میں ظن (گمان) یا غلبة الظن (گمانِ غالب) کافی نہیں، بلکہ ان کا قطعی اور یقینی ہونا لازم ہے، مزید یہ کہ ان میں تقلید جائز نہیں ورنہ مسلمان توہمات میں مبتلا ہو جائیں گے اور شعبہ باز لوگوں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔

3- عقیدہ کے فروغ (شناخوں) سے متعلقہ افکار میں غلبہ الظن کافی ہے اور ان میں تقلید کی بھی گنجائش ہوتی ہے جس طرح شرعی احکام میں تقلید جائز ہے۔

4- شرعی احکامات صرف اس سے متعلقہ شرعی نصوص سے ہی اخذ کئے جاسکتے ہیں، یعنی قرآن، سنت، اجماع صحابہ اور قیاس جو شرعی نصوص میں موجود علّت شرعیہ پر مبنی ہو۔ شرعی نصوص سے شرعی حکم اخذ کرنے کا عمل صرف عالم و مجتہد ہی انجام دے سکتا ہے اور مقلد پر اس بات کی تسلی کر لینا واجب ہے کہ اس نے جس مجتہد کی تقلید کی ہے، اس کے قول کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

5- جب مختلف فرائض بیک وقت متوجہ ہوں اور ایک مسلمان کے لئے ان تمام کو انجام دینا مشکل ہو جائے تو اس پر یہ واجب ہو گا کہ وہ ان میں سے اس فرض کو مقدم کرے جس کی فرضیت شدید ہو اور یہ ترجیح ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر نہ ہو بلکہ خالصتاً شرعی نصوص اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ہو۔

\* جب مسلمان اپنی فطری حالت میں ہوں یعنی خلافت موجود ہو تو اسلامی ریاست کے اندر دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شکل میں ہوگی، نیز اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کیلئے ہوگی اور بیرونی دعوت کا مظہر غیر مسلموں کو دلیل اور قطعی دلائل کی بنیاد پر اسلام کی طرف بلاتے ہوئے اسلام قبول کرنے کی دعوت ہو گا اور جس وقت خلیفہ مناسب سمجھے تو بیرونی دعوت جہاد کے ذریعے ہوگی۔

مسلمانوں کے غیر طبعی حالات میں یعنی جب خلافت موجود نہ ہو، تو اندرونی طور پر اسلام کی دعوت مسلم اراضی میں خلافت کو قائم کرنے پر مرکوز ہوگی، جہاں تک امر بالمعروف اور نہی عن



المنکر جو کہ اصلاحی کام ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت کا تعلق ہے تو یہ عمل جاری رہے گا لیکن بہت کم، اس کی وجہ یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے علاقوں میں ایسی اسلامی ریاست موجود نہ ہو جو اسلامی شریعت کا نفاذ کرتی ہو تو وہ اراضی دار الکفر میں تبدیل ہو جاتی ہیں، منکرات عام ہو جاتے ہیں اور ایسی صورت میں جزوی اصلاحی کام غیر موثر اور غیر مفید ثابت ہوتے ہیں، اس صورت میں ایسا انقلابی اور بنیادی عمل فرض ہو جاتا ہے، جو نظام باطل کو بیخ و بن سے اُکھاڑ کر اسلامی نظام کو قائم کرے۔ جہاں تک خلافت کی غیر موجودگی میں بیرونی دعوت کا تعلق ہے، تو اس کی شکل یوں ہوگی کہ غیر مسلموں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔ دوسرا، غیر اسلامی افکار پر اس کے کھوٹے پن کو بے نقاب کرنے کیلئے حملہ کیا جائے گا۔ تیسرا، اسلامی سرزمین سے باہر موجود مسلمانوں کی کوششوں کو مجتمع کر کے اسلامی سرزمین میں اقامتِ خلافت کیلئے ان سے تعاون کا مطالبہ کیا جائے گا۔

\* ایسی کوئی بھی کتاب جو اسلام کی طرف دعوت کے موضوع سے متعلق ہو، ضروری ہے کہ اس دعوت سے متعلق بنیادی اصولوں کو طے کرے، جو حسب ذیل ہیں:

1- اس وقت خلافت کے قیام کیلئے پوری توانائی اور تیز رفتاری کے ساتھ کام کرنا فرض عین ہے۔

2- یہ عمل جماعت کے ساتھ مل کر انجام دینا ضروری ہے، اس کیلئے انفرادی کوششیں ناکافی ہیں۔

3- اس جماعت کیلئے ایک واجب الاطاعت امیر کا ہونا فرض ہے جسکے شرعی اختیارات کے حدود متعین کیے گئے ہوں۔

4- یہ جماعت مرد و خواتین دونوں پر مشتمل ہو کیونکہ دعوت کو انجام دینا دونوں ہی کے لئے فرض ہے۔

5- اس جماعت کے افراد کے درمیان ربط اسلامی عقیدہ اور اسلامی افکار ہوں۔

6- یہ واجب ہے کہ جماعت اس کام کی انجام دہی کے لئے اسلامی افکار، اسلامی احکام اور اسلامی آراء میں سے تمام ضروری اور لازمی امور کی تبنی کرے اور یہ تبنی اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ وفاداری صرف اسلامی افکار کیلئے ہو، نہ کہ کسی شخصیت کے لئے۔

7- اس جماعت کا سیاسی جماعت ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کا کام ایک سیاسی کام ہے، یعنی خلافت قائم کرنے کیلئے حصول اقتدار۔

8- جماعت کا کام فکری جدوجہد ہونہ کہ تشدد کا استعمال، کیونکہ یہ کام عام بیداری سے پیدا شدہ رائے عامہ کے بعد امت کے ذریعہ طاقت حاصل کرنے کا عمل ہے۔

9- جماعت کیلئے جائز نہیں کہ وہ موجودہ کفریہ نظاموں کے تحت اقتدار میں شرکت کرے۔

10- جماعت کیلئے جائز نہیں کہ وہ موجودہ کفریہ حکومتوں میں سے کسی حکومت کے پاس اپنے آپ کو گروی رکھے، یا ان پر کسی بھی قسم کا مالی وغیرہ امداد قبول کرے، ان کفریہ حکومتوں سے مالی تعاون یا کسی بھی قسم کی مراعات کا حصول اپنے آپ کو ان کے پاس گروی رکھنے کی ایک قسم ہے۔

\* اسی طرح جو کتاب (اسلام کی طرف دعوت) کے موضوع زیر بحث لاتی ہو اس پر لازم ہے

کہ وہ اس دعوت کو انجام دینے کی کیفیت کے احکام کا احاطہ کرے جیسے:

1- **عملی اصول:** یہ کام بے ساختہ نہ ہو بلکہ اس سے پہلے فکر موجود ہو، اور یہ فکر مفروضات پر مبنی نہ ہو بلکہ فکر کو امر واقع کے احساس نے جنم دیا ہو۔ یہ فکر اس عمل کے ساتھ مقصد کو حاصل کرنے کیلئے ہو۔ یہ فکر، یہ مقصد اور عمل تمام کے تمام اسلام سے اخذ شدہ ہوں۔ مسلمانوں کے لئے سب سے اعلیٰ ترین مقصد اسلامی عقیدہ پر ایمان کی بنیاد پر اللہ کی رضامندی کا حصول ہے، یہ مقصد داعی کو ایمانی فضاؤں میں محو پرواز رکھتا ہے، یہ ایمانی فضائیں اس کو متحرک رکھنے کا باعث اور چٹنگی، شائستگی و خوش اسلوبی سے مالا مال کرتی ہیں۔

2- **طریقہ اور اسلوب کے مابین فرق:** اس فرق کو بیان کرنا اس لئے ضروری ہے کیونکہ طریقہ کار وہ اٹل شرعی احکام ہیں جو تاقیامت مستقل ہیں، جو کبھی تبدیل نہیں ہو سکتے، جبکہ اسلوب دعوت وہ مباح اعمال ہیں جو ایک داعی وقت اور حالات کے تحت اختیار کر سکتا ہے۔

3- **سیاسی صورت حال کا علم ہونا:** یہ ویسا ہی لازم ہے جیسا کہ احکام شرعیہ کا علم ہونا۔ کیونکہ حکم شرعی کے انطباق کے لئے حکم شرعی اور اسکی مناط (وہ حقیقت جس کے لئے حکم نازل ہوا ہے) دونوں کا علم ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اگر ہم حکم شرعی کا علم رکھتے ہوں اور اس کی مناط معلوم نہ ہو، تو ہمارے لئے اس حکم شرعی کا نفاذ ممکن نہیں رہے گا۔ اور اگر حکم کی مناط متعین کئے بغیر اس کو نافذ کرنے کی کوشش کریں گے تو عین ممکن ہے کہ ہم اس کو کسی دوسرے واقع پر چسپاں کرنے کی غلطی کر بیٹھیں۔ چنانچہ جو بھی کفر یہ نظام کو تباہ کرنے اور اس سے اقتدار چھین لینے کی جدوجہد کرتا ہو، اس کے لئے نہ صرف اپنے ملک کی سیاسی صورتحال سے اچھی طرح واقفیت ضروری ہے بلکہ علاقائی و عالمی سیاست کی بھی کافی حد تک سمجھ بوجھ کا ہونا اشد ضروری ہے۔

4۔ اقتدار کا حصول اور خلافت کا قیام: اقتدار کا حصول اور خلافت کا قیام تنہا اہل قوت اور اہل اقتدار کے ذریعے انجام نہیں پاسکتا جیسا کہ کچھ اس خوش فہمی میں ہوتے ہیں، بلکہ اس سے پہلے دعوت کو عام لوگوں تک پہنچانا اور عام کرنا بے حد ضروری ہے۔ جب یہ دعوت تربیتی مرحلہ سے نکل کر تفاعل (سیاسی جدوجہد) کے مرحلہ میں داخل ہو جائے اور امت کے ساتھ دعوت کامیاب ہو جائے اور امت کے اندر عمومی بیداری سے پیدا شدہ رائے عامہ پایا جائے، تب پارٹی اہل قوت اور اہل اقتدار سے نصرہ طلب کرنے لگتی ہے۔

5۔ ایک سے زائد پارٹیوں کی اجازت: شریعت دعوت کی غرض سے ایک سے زائد گروپ یا پارٹی کی اجازت دیتی ہے، بشرطیکہ وہ پارٹیاں اسلامی عقیدے اور اسلامی نظام کی بنیاد پر قائم ہوں۔

6۔ آداب اختلاف: ایک سے زائد اسلامی جماعتوں کی موجودگی کی صورت میں ان پر ان شرعی احکامات کی پابندی واجب ہے جو اسلام میں آداب اختلاف کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ محض اختلاف رائے کی وجہ سے دوسرے مسلمان کو فاسق یا کافر قرار دے، جب تک کہ یہ اختلاف شرعی اجتہاد کے دائرے میں ہو۔ ہر وہ رائے جس کی مضبوط یا کمزور دلیل موجود ہو یا شبہ دلیل ہو وہ شرعی رائے ہے اس کا مذاق اڑانا یا اس رائے کے حامل کا مذاق اڑانا جائز نہیں۔ بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ آپ کی رائے غلط ہے یا آپ کی رائے کمزور ہے، اس کے ساتھ بحث بہترین انداز سے برہان اور دلیل سے کی جائے گی۔ لیکن اگر رائے کی کوئی شرعی دلیل نہ ہو نہ کوئی شبہ دلیل ہو تب وہ غیر اسلامی رائے (کفریہ رائے) ہے، اس صورت میں اس رائے پر ضرب لگانے اور اس رائے کے حامل کو خبردار کرنا ضروری ہے کہ وہ کفریہ رائے کا علمبردار ہے (تاہم کفریہ رائے کا علمبردار ہمیشہ کافر ہی نہیں ہوتا)۔

7۔ حکمرانوں کا معاملہ: وہ حکمران جو کسی کی جانب سے مجبور کیے بغیر اسلامی شریعت کو معطل کر کے دوسرے قوانین بناتے ہیں ان کی اکثریت کافر ہے چاہے نماز روزہ یا حج کا اہتمام کریں یا یہ دعویٰ کریں کہ وہ مسلمان ہیں، کیونکہ انہوں نے کفریہ قوانین کو اسلامی شریعت پر فوقیت دی۔ ہاں ان میں سے جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ شریعت اسلامی ہی بہترین قوانین ہیں اور انہوں نے شریعت کو نفسانی خواہشات کی بنا پر عارضی طور پر معطل کیا ہوا ہے، تو وہ کافر نہیں ہیں فاسق ہیں۔ اس بنا پر داعی یا کسی بھی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ایسے حکمران کو تسلیم کرے یا ان سے تعاون کرے یا ان کے بارے میں خاموشی بھی اختیار کرے، کیونکہ حدیث نبوی ﷺ ہے: «مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ، فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَلِكَ أضعف الإيمان» (مسلم) ”تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھوں سے روکے، اگر یہ اس کے بس میں نہ ہو تو پھر اسے زبان سے روکنے کی کوشش کرے اور اگر وہ ایسا کرنے کے بھی اہل نہیں ہے تو دل میں اس سے نفرت کرے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے“ (مسلم)

اس کتاب (اسلام کی طرف دعوت) میں اس بات پر تنبیہ کرنا ضروری ہے کہ دعوت میں رسول ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے چند امور کو مد نظر رکھنا ضروری ہے جیسے:

1۔ رسول ﷺ کفار کو اسلام میں داخل ہونے کے لئے دعوت دیا کرتے تھے، جبکہ موجودہ حالات میں زیادہ تر ہم مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔

2۔ رسول ﷺ جس وقت دعوت دے رہے تھے تب شرعی احکامات مکمل طور پر نازل نہیں ہوئے تھے، جبکہ آج ہمارے سامنے تمام احکامات موجود ہیں اسکے معنی یہ ہوئے کہ کچھ ایسے احکامات بھی ہیں جن پر مکہ میں رسول ﷺ نے عمل نہیں کیا کیونکہ اس وقت ان احکامات کا

نزول ہی نہیں ہوا تھا، لیکن آج نشاۃ ثانیہ کے لئے عمل کرنے والے داعیوں پر ان احکامات پر بھی عمل کرنا ضروری ہے۔ اسکے علاوہ ایسے بھی احکام ہیں جن پر رسول ﷺ نے عمل تو کیا لیکن بعد میں انہیں منسوخ کر دیا گیا، اس لئے ہمارا ان پر عمل کرنا ضروری نہیں، مثلاً مکہ میں جہاد کی اجازت نہیں تھی، لیکن آج اسکی اجازت ہے (خلافت کی غیر موجودگی میں بھی دفاعی جہاد آج بھی فرض ہے کیونکہ اس کا انحصار خلافت پر نہیں ہے)۔ مکہ میں دعوت دینا صرف رسول ﷺ پر فرض تھا لیکن صحابہؓ کے لئے وہاں یہ صرف مندوب عمل تھا، کیونکہ صحابہؓ نے صرف بیعت النساء (عورتوں والی بیعت) کے الفاظ پر بیعت دی تھی۔ یہ حالت اس وقت تک رہی جب تک اوس اور خزرج کے قبائل نے دوسری بیعت عقبہ دی۔ اس واقعہ کے بعد سے حضور ﷺ کے علاوہ مسلمانوں پر بھی اسلام کی دعوت فرض ہو گئی۔ جو احکام بعد میں منسوخ ہوئے ان میں مکہ سے مدینہ ہجرت کا حکم بھی تھا، جو کہ صحابہؓ پر فرض تھا لیکن فتح مکہ کے بعد اسکی فرضیت ختم ہو گئی۔

3۔ اسی بنا پر اعمال کو مکی دور کے اعمال اور مدنی دور کے اعمال کی درجہ بندی کا مقصد افراد کے اعمال اور حکمران (خلیفہ) کے اعمال میں فرق کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اسلام میں کچھ افعال صرف حکمران کی ذمہ داری ہیں، انہیں نہ تو انفرادی طور پر انجام دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی گروپ کی شکل میں انجام دیا جاسکتا ہے مثلاً حدود کا نفاذ، نئے علاقوں کی بازیابی کے لئے جنگ کی شروعات کرنا یا صلح اور جنگ بندی کے عمل کو انجام تک پہنچانا۔ اسی طرح کچھ افعال انفرادی ہیں، خواہ افراد دارالکفر میں رہتے ہوں یا دارالاسلام میں۔ مثلاً عبادات، اخلاقیات، مطعومات (کھانے پینے)، ملبوسات، معاملات۔ اس کے علاوہ کچھ افعال امیر اور غریب افراد

دونوں کی ذمہ داریوں میں سے ہوتے ہیں۔ مثلاً مسجدیں بنانا، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، قطعی دلائل کے ذریعے اسلام کی دعوت دینا۔

☆ اسلام کے داعیوں کو جب وہ ایک مخصوص مقصد مثلاً قیام خلافت کو پانا چاہتے ہیں اکثر ایک مسئلہ سے سابقہ پڑتا ہے اور وہ یہ کہ کیا اس مقصد تک پہنچنے کے لئے شریعت میں کوئی مخصوص میعاد متعین ہے (دس، بیس، یا تیس سال) یا ایسی کوئی میعاد مقرر نہیں ہے؟ اس نقطہ پر دو سوال سامنے آتے ہیں:

**اول:** اس عمل (یعنی امت کے عقیدے اور شریعت کی بنیاد پر ریاست کے قیام) کے لیے ایک، دو یا تین دہائیوں کی ضرورت ہے؟ کیونکہ ایک جماعت غیر متعین شکل میں کام نہیں کرتی، بلکہ وہ اپنے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور اس کو عملی شکل دینے کی بنیاد پر اتنی ہی مدت میں کام کرتی ہے جو اس منصوبے کے لئے درکار ہوتی ہے، ورنہ ایسی پارٹی غیر سنجیدہ ہوتی ہے یا پھر اس کا کام ہدایت والا نہیں۔

**دوم:** یہ کہ جب یہ جماعت اس معقول مدت میں بھی اپنے مقصد کے حصول اور اپنے منصوبے کو وجود دینے میں ناکام ہو جاتی ہے کیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اس کے مجوزہ پروگراموں میں کچھ خامیاں ہیں، چنانچہ انہیں اپنے منصوبوں پر نظر ثانی کرنی چاہئے؟ یا پھر اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ جماعت اللہ کے ساتھ مخلص نہیں اور یہی وجہ رہی کہ اللہ نے بھی اپنی نصرت ان کے سپرد نہ کی؟ تو اس قسم کے سوالات کا اس کتاب میں جواب دیا جانا ضروری ہے۔

اس کتاب "الدعوة الى الاسلام" میں کچھ دیگر سوالوں کا حل پیش کرنا اور اس دعوت سے متعلق بعض شبہات کو رفع کرنا اور تصورات اور مفاہیم سے متعلق بعض باتوں کو درست کرنا ہے مثلاً:

1- کچھ لوگ اس ارشاد باری تعالیٰ کے متعلق غلط فہمی میں مبتلاء ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مِّنْ ضَلٍّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ ”اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر ہو گے تو جو لوگ گمراہ ہیں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے“ (المائدة: 105)۔ چنانچہ وہ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مسلمان صرف اپنے اور اپنے اہل خانہ کا ذمہ دار ہے اور وہ دوسرے لوگوں تک دعوت پہنچانے کا ذمہ دار نہیں ہے۔

2- کچھ لوگ اس ارشاد رسول ﷺ سے متعلق غلط فہمی میں مبتلاء ہیں: ((لَا يَنْبَغِي لِمُؤْمِنٍ أَنْ يُذِلَّ نَفْسَهُ، يَتَعَرَّضَ لِلْبَلَاءِ لِمَا لَا يَطِيقُ)) ”ایک مومن کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ذلیل کرے اور کوئی ایسی مصیبت مول لے جس کو وہ برداشت نہ کر سکتا ہو۔“ چنانچہ وہ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ عمل جو مصیبت لاسکتا ہے یعنی قید یا نوکری سے برطرفی یا پھر ظالم حکمران کا عتاب وغیرہ، تو ایسے عمل سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہئے خواہ اس کی وجہ سے دعوت چھوڑنی پڑے، یا ظالم حکمران کا ساتھ دینا پڑے۔

3- اسکے علاوہ کچھ لوگ حذیفہ بن الیمان کی روایت جو حضور ﷺ سے مروی ہے، اُسکے متعلق غلط فہمی رکھتے ہیں: ((قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُمْ جَمَاعَةٌ وَلَا أَمِيرٌ؟ قَالَ: فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرْقَ كُلَّهَا وَلَوْ أَنْ تَعُضَّ بِأَصْلِ شَجَرَةٍ حَتَّى يَدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَأَنْتَ عَلَى ذَلِكَ)) وہ فرماتے ہیں ”میں نے کہا، جب مسلمانوں کی کوئی جماعت نہ ہو اور کوئی امام بھی نہ ہو تو؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب تم ایسے سارے گروہوں سے تعلق توڑ لو حتیٰ کہ تمہیں



دانتوں تلے درخت کی جڑیں بھی دبانی پڑے، اسی حال میں رہو جب تک تمہیں موت نہ آجائے۔“ اِس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اِس وقت جب مسلمانوں کا خلیفہ موجود نہیں ہے تب مسلمانوں پر واجب نہیں کہ وہ خلافت کے دوبارہ قیام کے لئے کام کریں بلکہ مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی موت تک خود کو اس سے لا تعلق کر لے۔

4۔ اسکے علاوہ کچھ افراد اِس عظیم حدیث کے متعلق غلط فہمی میں مبتلاء ہیں: ((لا یأتی علیکم عام ولا یوم إلا والذي بعده شر منه، حتی تلقوا ربکم)) ”تم پر کوئی سال اور کوئی دن نہیں گزرے گا مگر اس کے بعد آنے والا اس سے بھی بدتر ہو گا حتیٰ کہ تم اپنے رب سے جاملو۔“ چنانچہ یہ غلط فہمی انہیں مایوسی، ناامیدی اور عمل سے گریز کرنے پر مائل کر دیتی ہے۔

5۔ اسکے علاوہ ایسے بھی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کا کام امام مہدی کے ذمہ ہی ہے اور یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ بھی بالآخر اعمال سے سبکدوشی ہی ہوتا ہے۔

\* یہ کتاب اِس مقدمہ میں بیان شدہ نکات پر بحث کرتی ہے اور اس کے علاوہ دیگر معاملات پر بھی بات کرتی ہے، تو اگر اس میں کسی قسم کی کمی موجود ہو تو عیب سے پاک ہونا صرف اللہ کی شان ہے اور ان شاء اللہ اگلا ایڈیشن اللہ کی مدد سے مزید ضخیم اور مکمل ہو گا اور ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ وہ اس تصنیف کو مسلمانوں کے لئے خیر کا ذریعہ بنائے۔

درد و سلام ہو ہمارے آقا و قائد اعظم محمد ﷺ پر اور ان کی آل پر، ان کے اصحاب پر اور یوم قیامت تک جو اُن کی لائی ہوئی ہدایات پر چلا اور تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ (مجلہ الوعی)

# اسلام کی دعوت کو پہنچانے کی اہمیت

دعوت مائل کرنے اور ترغیب دلانے کا عمل ہے، اگر آپ کسی کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اُسے اسی چیز کی طرف مائل کر رہے ہیں، جس کی آپ اسے دعوت دے رہے ہیں اور اُس شخص میں اس کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ اسلام کی یہ دعوت گفتگو یا کلام تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ قول اور فعل کے ذریعے ہر وہ ممکن شے جو مدعو کو اسلام کی طرف مائل کر سکتی ہو اور اس کے متعلق دلچسپی پیدا کر سکتی ہو، اسلام کی دعوت میں شامل ہے۔ چنانچہ یہ دعوت قول و فعل کی شکل میں پہنچائی جاتی ہے، ایک مسلمان اپنے عمل کے ذریعے اُس بات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی وہ اپنی زبان سے دعوت دیتا ہے اور سچائی کے ساتھ حق پر کاربند ہو کر اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرتا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ (فصلت: 33) ”اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہو سکتا ہے، جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک اعمال کرے اور کہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔“

اور اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿فَلِذَلِكَ فَادَعُ وَاسْتَقِمَّ كَمَا أُمِرْتَ﴾ ”لہذا (اے پیغمبر!) تم اُسی بات کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہو اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے، (اسی دین پر) جیسے رہو۔“ (الشوریٰ: 15)

اسلام میں اللہ کی طرف دعوت ایک فرض امر ہے اور وہ عبادت ہے جس کے ذریعہ داعی اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے اور اُسے دعوت کے عظیم مرتبہ کا احساس ہوتا ہے جس کے ذریعے اللہ رب العزت اس دنیا اور آخرت میں داعی کے درجات کو بلند کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف دعوت درحقیقت انبیاء کا مشن ہو کر رہتا تھا جسے انبیاء نے سرانجام دیا اور دعوت ہی کے ذریعے اللہ کے دین کو دنیا میں قائم و نافذ کیا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (النحل: 36) "اور یقیناً ہم نے ہر ایک امت میں رسول بھیجا ہے (جو جتلائے)" تنہا اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت (جھوٹے خداؤں) سے اجتناب کرو۔"

اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ (سورة الاحزاب: 45-46) "اے نبی! یقیناً ہم نے آپ کو گواہ بنا کر بھیجا ہے بشارت دینے اور خبردار کرنے والا، اور وہ جو اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے، نور پھیلاتا ہو اچراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

پس ہمارے نبی کریم ﷺ نے اسلام لوگوں تک پہنچایا اور امت کی خیر خواہی کی۔ دنیا میں جس بات کی طرف لوگوں کو دعوت دی، اس پر آپ ﷺ گواہ بنے اور لوگوں کو بھی اس پر گواہ بنایا، اللہ سے بھی اس پر گواہ ہونے کا مطالبہ کیا یہ وہ بات تھی جو آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمائی: ((...ألا هل بلغت؟ اللهم فاشهد)) (رواہ البخاری) "کیا میں نے پہنچا دیا؟ اے میرے رب گواہ رہنا"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت امت کے واسطے چھوڑی ہوئی نبی ﷺ کی میراث ہے، چنانچہ اگر ہم نے اسلام کو اپنے درمیان محفوظ رکھنا ہے تو ہمیں بہر حال دعوت کو محفوظ رکھنا ہو گا۔

کیونکہ اس بات کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ اسلام کو وجود میں لانے کی دعوت کے بغیر اسلام دنیا میں فعال ہو جائے گا۔ نہ اس دعوت کے بغیر اسلام کے پیروکاروں کے دلوں سے تحریف شدہ اور من گھڑت افکار کو نکال کر اسلام کی شفافیت اُجاگر کرنے کا تصور کیا جاسکتا ہے، نہ ہی اس کو قائم کرنے کی دعوت کے بغیر اس کا قیام ممکن ہے، اور نہ ہی اسلام کی نشر و اشاعت کی دعوت کے بغیر اس کو بھرپور طریقے سے پھیلایا جاسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر اسلام کی دعوت نہ ہوتی دین کو قوت نہ ملتی اور نہ ہی اس کا پھیلاؤ ہو جاتا، نہ ہی اس کی حفاظت ممکن تھی اور نہ ہی مخلوق پر اللہ کی حجت قائم کی جاسکتی۔ لہذا اسلام کی طرف دعوت کے ذریعے ہی اسلام کی سابقہ عزت و شوکت (عظمتِ رفتہ) کو بحال کیا جاسکتا ہے۔ جس کی آج ہمیں شدید ضرورت ہے۔ اور اسی دعوت کے ذریعے ہی تمام لوگوں کے درمیان اسلام پھیلے گا اور دین سارا کا سارا اللہ کا ہو کر رہے گا، جس کی آج دنیا کو ضرورت ہے!

یہ اسلامی دعوت ہی ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان کی دلیل کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور کافر کی دلیل جڑ سے اکھڑ جاتی ہے، یوں اسلام سے روگردانی کرنے میں اس کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِّئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا﴾ (النساء: 165) ”یہ سب وہ رسول تھے جو (ثواب کی) خوشخبری سنانے اور (دوزخ سے) ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، تاکہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے، اور اللہ سب پر غالب بڑی حکمت والا ہے۔“

ان وجوہات کی بنا پر مسلمانوں نے دعوت کی اہمیت کو سمجھا اور قرون اولیٰ کے مسلمان سب سے پہلے خود رسول اللہ ﷺ اس کو دین کے طور پر مضبوطی سے تھامے رہے، دعوت کا کام کرتے رہے اور جتنی توجہ انہوں نے دین اسلام پر دی اتنی ہی توجہ انہوں نے اس کی دعوت پر بھی دی۔ تو اگر مسلمانوں نے اسلام کی طرف دعوت کا کام نہ کیا ہوتا، اسلام ہم تک نہ پہنچ جاتا اور لاکھوں کروڑوں لوگ اس کو گلے نہ لگا لیتے۔ بلکہ آپ ﷺ کی ذات تک ہی محدود ہو کر رہتا۔ چنانچہ اللہ جل شانہ کا پہلا ارشاد یہ تھا جو حضور ﷺ پر نازل ہوا: ﴿افْرَأْ﴾ ”پڑھو“ (العلق: 1)

اللہ رب العزت نے حضور ﷺ کو حکم دیا کہ وہ خود پڑھیں اور پھر لوگوں کو پڑھ کر سنائیں۔ ابتدا کی اُن اولین آیتوں میں سے ایک آیت میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں: ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ (المدثر: 2) ”اُٹھو اور خبردار کرو“۔

رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے اسلام کے تمام کے تمام پہلوؤں کو وجود ملا اور اسی دعوت نے وہ اولین مسلمان پیدا کئے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے بعد پیغام ہدایت کو سب سے زیادہ بہتر انداز میں پہنچایا۔ اور ان ہی کی دعوت سے ان کے بعد آنے والے انسانوں تک اسلام کا پیغام پہنچا یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے اور صبح قیامت تک یہ دعوت جاری رہے گی۔

کیونکہ اسلام اور دعوت کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا پانی اور بہاؤ کا تعلق ہے جس طرح پانی آب پاشی کے ذریعے بنجر زمین کو زرخیر بناتا اور پیاس بجھاتا ہے، لوگوں تک خوشحالی و بھلائی لاتا ہے اور جس طرح پانی کی ترسیل کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے، بالکل اُسی طرح اسلام جو ایک دین حق اور زندگی گزارنے کا صحیح اور مکمل طریقہ ہے، اس کی خیر و بھلائی لوگوں تک پہنچانے کے لئے ذرائع کی

ضرورت ہوتی ہے، تاکہ لوگ اسلام سے سیراب ہو سکیں، اُن کی پیاس بجھائی جاسکے اور رضائے الہی کے طلبگار ہدایت پا سکیں، یہ ذریعہ دعوت ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور دعوت کے درمیان کتنا مضبوط رشتہ و تعلق ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر دعوت کا عمل اسلام کا رکن رکین اور ایک ناگزیر امر ہے، یہ اسلام کے ساتھ ایسے جڑی رہی جیسے کہ اس کی قوت تاثیر اور پھیلاؤ اس کے ساتھ رہا، تو دعوت اور اسلام کی عمروں میں یکسانیت ہے، یہ دعوت ظہور اسلام سے لے کر اس وقت تک جاری رہے گی جب اللہ تعالیٰ زمین کی میراث کا وارث ہو جائے۔

اس لئے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کی زندگیوں میں دعوت کو اہمیت حاصل ہو اور انہیں ہمیشہ اس کی فکر لگی ہوئی ہو، اس کے لئے اپنے اوقات، اپنی توانائیاں اور اپنی کوششیں صرف کریں۔

### معروف کا حکم اور منکر کو روکنا دعوت پہنچانے کا حصہ ہے:

اس معاملہ میں امام نوویؒ نے شرح صحیح مسلم میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان کے تحت لکھا ہے: ”یہ جان لیں کہ یہ باب یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام عرصہ دراز سے لوگوں میں عام رہا لیکن اس زمانہ میں اس کے بہت کم نشانات باقی ہیں۔“

اسلام کے اندر دعوت ایک عظیم عمل ہے، جس کے ذریعے ہی اسلام کی نگہداشت ہوتی ہے، اور یہ اسلام کا اصل روح اور جوہر ہے۔ اور جب منکرات عام ہو جائیں تو اللہ کی سزا نیک و بد تمام افراد کو

اپنے نرغہ میں لے لے گی اور پھر جب وہ ظالموں کو ظلم سے نہ روکیں تو اللہ تمام لوگوں کو عنقریب سزا دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ ”لہذا جو لوگ اُس کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اُن کو اس بات سے ڈرنا چاہئے کہ کہیں اُن پر کوئی آفت نہ آپڑے، یا انہیں کوئی دردناک عذاب نہ آپکڑے“۔ (النور: 63)۔

جب تک روئے زمین پر زندگی، اس کی بقاء اور امن و سلامتی کی ضرورت ہے تب تک بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ضرورت باقی رہے گی، چنانچہ بلاشبہ اسلامی دعوت کا پہنچانا درحقیقت اِس روئے زمین پر بقائے حیات اور امن و سلامتی کی ضمانت ہے۔ رسول ﷺ نے امت کے لئے اس کی ضرورت کو اِس مثال کے ذریعے یوں واضح کیا ہے: ((مَثَلُ الْقَائِمِ عَلَى حُدُودِ اللَّهِ وَ الْوَاقِعِ فِيهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اسْتَهَمُوا عَلَى سَفِينَةٍ فَأَصَابَ بَعْضُهُمْ أَعْلاَهَا وَ بَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا. وَ كَانَ الَّذِينَ أَسْفَلُهَا إِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَاءِ مَرَوْا عَلَى مَنْ فَوْقَهُمْ. فَقَالُوا: لَوْ أَنَا خَرَقْنَا فِي نَصِيبِنَا خَرْقًا وَ لَمْ نَأْذِ مَنْ فَوْقَنَا؟ إِنْ تَرَكَهُمْ الَّذِينَ فِي الْأَعْلَى وَ مَا أَرَادُوا هَلَكُوا جَمِيعًا، وَ إِنْ أَخَذُوا عَلَى أَيْدِيهِمْ نَجَوْا جَمِيعًا)) (بخاری) ”جو لوگ اللہ کی قائم کردہ حدود کی نگہداشت اور لحاظ کرتے ہیں اور وہ جو اُن کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، اُن کی مثال ایسی ہے جیسے کہ کچھ لوگ کشتی میں سوار ہو جائیں اور وہ آپس میں قرعہ اندازی کریں کچھ افراد کے نام کشتی کا بالائی حصہ نکلے اور کچھ افراد کے نام کشتی کا نچلا حصہ، نچلے حصہ میں سوار افراد کو پانی حاصل کرنے کے لئے اوپری حصہ سے گزرنا پڑتا ہے لہذا وہ آپس میں کہتے ہیں کیوں نہ ہم نچلے حصہ میں ہی ایک سوراخ کر لیں اور یہیں سے پانی حاصل کیا کریں تاکہ اوپری حصہ والوں کو کوئی دقت نہ ہو؟، تو اگر اوپری حصہ کے سوار لوگوں نے انہیں چھوڑا اور ایسا کرنے

دیا تو کشتی مع تمام سوار یوں کے ڈوب جائیگی، البتہ اگر وہ ایسا کرنے سے روک دیں تو کشتی کے تمام سوار محفوظ ہو جائیں گے۔“ (بخاری)

اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا دراصل معاشرے کی بقاء اور اسکی حفاظت کرنے کے مترادف ہے اور یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اس کام کی انجام دہی میں کسی بھی قسم کی سستی اور کوتاہی کا اگر کوئی نتیجہ ہے تو یہی کہ معاشرہ کی یہ کشتی مع تمام سواروں کے سمندر کی تہوں سے جا لگے گی اور سب کے سب غرق ہو جائیں گے۔

قرآن کریم نے بکثرت آیات میں دعوت کی اہمیت اور لوگوں کی خاطر اس کی ضرورت کو بتلایا ہے قرآن نے اس کے لیے صرف دعوت ہی کے لفظ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے لیے کئی الفاظ و معانی استعمال کیے ہیں جو دعوت کے موضوع کے گرد ہی گھومتے ہیں، احادیث رسول ﷺ بھی اسی طرح کی ہیں۔ ان میں سے صرف چند آیات و احادیث کو بطور مثال یہاں پیش کرتے ہیں:

پس قرآن نے دعوت کو امر بالمعروف والنہی عن المنکر سے تعبیر کیا۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ ”(مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“ (آل عمران: 110)

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تم



میں سے ایک امت (گروہ) ضرور نکل کر آئے جو تمام خیر (اسلام) کی دعوت دے، بھلائی کا حکم دے اور برائی سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔“ (آل عمران: 104)

رسول ﷺ کا فرمان ہے: (( و الذي نفسي بیده لتأمرن بالمعروف و تنهون عن المنکر أو لیوشکن الله أن یبعث علیکم عقاباً منه ثم تدعونه فلا یستجاب لکم )) - (رواہ الترمذی) ”قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے تم ضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہنا ورنہ اللہ عنقریب تم پر عتاب نازل کرے گا پھر تم دعا مانگتے رہو گے اور وہ سنی نہ جائیں گی۔“

اور رسول ﷺ کا فرمان ہے: (( من رأى منکم منکراً فلیغیره بیده, فإن لم یستطع فبلسانه, فإن لم یستطع فبقلبه و ذلك أضعف الإیمان )) (رواہ مسلم) ”تم میں سے جو کوئی بھی برائی دیکھے اُسے چاہیے کہ ضرور اسکو اپنے ہاتھوں سے روکے اور اگر ایسا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسکو روکے اور اس کے بھی قابل نہ ہو تو اپنے قلب میں اس سے نفرت کرے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے۔“

**تبلیغ دعوت کے پہنچانے کا حصہ ہے:**

اسی طرح قرآن نے دعوت کو لفظ ’شہادت علی الناس‘ سے تعبیر کیا ہے یعنی ’لوگوں کے متعلق گواہی‘۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ”(مسلمانو!) اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو اور رسول ﷺ تم پر گواہ بنے۔“ (البقرہ: 143)

رسول ﷺ فرماتے ہیں: (( . . و المؤمنین شهود الله في الأرض ))  
 .... مومنین زمین پر اللہ کے گواہ ہیں (رواہ ابن ماجہ)

اور رسول ﷺ فرماتے ہیں: (( لِيُبَلِّغَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ )) "حاضرین غائبین تک پہنچائیں۔"

داعیوں کا آپس میں حق کی تلقین دعوت کا حصہ ہے:

اسی طرح قرآن نے بھی دعوت کو لفظ "تبلغ" (پہنچانا) سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ {مائدہ: 67} ”اے رسول! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو (اس کا مطلب یہ ہوگا) کہ تم نے اللہ کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تمہیں لوگوں (کی سازشوں) سے بچائے گا۔“ (المائدہ: 67)

اور رسول اللہ ﷺ بھی فرماتے ہیں: (( بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً )) ”میری طرف سے پہنچاؤ، خواہ ایک آیت ہی ہو۔“ (رواہ البخاری)

قرآن و سنت نے دعوت کو آپس میں ایک دوسرے کو حق کی تلقین کرنا، بشارت، خبردار کرنا، لوگوں پر حق کو واضح کرنا، نصیحت اور یاد دہانی کروانا اور اہل کتاب سے احسن طرز پر مباحثہ کرنا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، دین کو غالب کرنے کی جدوجہد جیسے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ إِنَّ الْإِنْسَانَ لِفِي خُسْرٍ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ ”زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں، اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔“ (العصر: 1-3)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾ ”اور (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں سارے ہی انسانوں کے لئے ایسا رسول بنا کر بھیجا جو خوشخبری بھی سنائے اور خبردار بھی کرے، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھ رہے۔“ (النبأ: 28)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ ”اور ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا، خود اُس قوم کی زبان میں بھیجا، تاکہ وہ ان کے سامنے حق کو اچھی طرح واضح کر سکے۔“ (ابراہیم: 4)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ﴾ ”یہ تو دنیا جہاں کے لوگوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔“ (التکویر: 27)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْأَلُونَ﴾ ”اور بے شک یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے ایک نصیحت کا ذریعہ ہے اور تم سب سے عنقریب پوچھا جائے گا (کہ تم نے اس کا کیا حق ادا کیا؟)۔“ (الزخرف: 44)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَجَادِلْهُمْ بَالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ ”.... اور ان سے بحث ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔“ (النحل: 125)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ ”اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے، اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔“ (الانفال: 39)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ﴾ ”وہی تو ہے جس نے اپنے رسول ہدایت اور سچائی کا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اسے تمام دوسرے دینوں پر غالب کر دے چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی بری لگے۔“ (الص: 9)

اور اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: ((أَلَا إِنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ قَالَ قُلْنَا لِمَنْ يَا رَسُولَ اللَّهِ ؟ قَالَ لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ)) ”خبردار! دین ایک خیر خواہی ہے، راوی نے کہا: پوچھا گیا، یا رسول اللہ کس کی؟ انہوں نے فرمایا: اللہ، اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول، مسلمانوں کے حکمرانوں اور عام لوگوں کی۔“ (مشفق علیہ) اور ((كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَقْرَأَ أَمِيرًا عَلَى جَيْشٍ أَوْ سَرِيَّةٍ أَوْ صَاهُ فِي خَاصَّتِهِ بِتَقْوَى اللَّهِ وَ مَنْ مَعَهُ مِنَ الْمُسْلِمِينَ خَيْرًا ثُمَّ قَالَ: أَغْزَوْا بِاسْمِ اللَّهِ وَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ. قَاتِلُوا مَنْ كَفَرَ بِاللَّهِ ... وَ إِذَا لَقِيتَ عَدُوَّكَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ فَادْعُهُمْ إِلَى ثَلَاثِ خَصَالٍ (أَوْ خِلَالٍ) فَأَيَّتُهُنَّ مَا أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَ كَفَّ عَنْهُمْ. ثُمَّ ادْعُهُمْ إِلَى الْإِسْلَامِ فَإِنْ أَجَابُوكَ فَاقْبَلْ مِنْهُمْ وَ كَفَّ عَنْهُمْ ...)) ”سُليمان بن بُريدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا: نبی کریم ﷺ جب کسی شخص کو لشکر یا مہم (سریہ) کا امیر مقرر کرتے تو اُسے خصوصیت سے تقویٰ اور اس کے ساتھ جانے والے مسلمانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیتے۔“ پھر فرماتے: اللہ کے نام کے ساتھ اللہ کی راہ میں قتال کرو، اُن سے قتال کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے..... اور جب مشرک دشمنوں سے تمہارا آمنہ سامنا ہو تو ان کے

سامنے تین شرطوں پر دعوت پیش کرو، اگر وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی مان لیں تو ان سے قبول کر لو اور خود کو انہیں کوئی نقصان پہنچانے سے باز رہو۔“ (رواہ مسلم)

اللہ کے رسول ﷺ سے روایت ہے: ((نضر اللہ عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها و أداها، فزب حامل فقه غير فقيه، و زب حامل فقه إلى من هو أفقه منه)) ”اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی، پھر اُسے اچھی طرح یاد (محفوظ) رکھے، پھر لوگوں تک پہنچائے، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ کسی کے پاس فقہ (علم) موجود ہو اور وہ فقیہ نہ ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس فقہ (علم) کو کسی ایسے شخص کے پاس لے جائے جو اس سے زیادہ فقیہ ہو۔“ (رواہ الترمذی)

ان جیسی کئی آیات اور احادیث ایک دوسرے کی مؤید ہیں، بلکہ ان میں سے ہر ہر آیت اور حدیث بجائے خود دعوت ہے۔ یہ دعوت تمام لوگوں کے لئے ہے، البتہ عملی طور پر اپنی وسعت کے مطابق اس کو مسلمان انجام دیتے ہیں۔

اگر ہم صرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق آیات پر غور کریں تو یہ آیتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ اسلام کے اس عظیم الشان رُکن کی ادائیگی تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے، نبی کریم ﷺ کی نسبت سے جو ہمارے لئے نمونہ ہیں، ان آیات میں آیا ہے: (يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ) ”جو انہیں اچھی باتوں کا حکم دے گا، برائیوں سے روکے گا، اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے گا۔“ (الاعراف: 157)

یہ آیت بیان کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کامل ہے۔ آپ ﷺ کی زبانی اللہ تعالیٰ نے ہر معروف کا حکم دیا اور ہر منکر سے منع کیا، ہر پاکیزہ چیز کو حلال اور ہر گندی اور خبیث چیز کو حرام قرار دیا۔

اُمت کے حوالے سے یہ آیات کہتی ہیں: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ ”(مسلمانو!) تم وہ بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“۔ (آل عمران: 110)

اُمت تمام مسلمانوں کو شامل ہے، افراد اور جماعتوں سے لے کر اصحاب اقتدار تک، غرض کسی بھی حیثیت میں ہوں یہ آیت ان تمام طبقات سے اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ ہر ایک معروف کا حکم کرے اور ہر ایک منکر سے روکے۔

ایسی آیات بھی ہیں جو خاص کر افراد سے دعوت کا کام کرنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ مثلاً: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ”اور مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ وہ نیکی کی تلقین کرتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں“۔ (التوبہ: 71)

قرطبیؒ فرماتے ہیں: پس اللہ نے مسلمانوں اور منافقین کے درمیان فرق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بنایا ہے۔ چنانچہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ مسلمانوں کی خاص الخاص صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے، جس کا اعلیٰ درجہ اسلام کی طرف دعوت ہے (تفسیر القرطبی 4/47)۔

یہ آیات پارٹیوں اور گروہوں کے کام کی نوعیت یوں بیان کرتی ہیں: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ اور وہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں“ (آل عمران: 104)

حکمران سے متعلق:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ﴾ ”یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں، تو وہ نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور لوگوں کو نیکی کی تاکید کریں اور برائی سے روکیں۔ اور تمام کاموں کا انجام اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔“ (الحج: 41)

مزید قرآن نے صاف صاف واضح کیا ہے کہ دعوت صرف اسلام کی دی جاسکتی ہے: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ اور وہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں“ (آل عمران: 104) ﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ ...﴾ ”اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جبکہ اُسے اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو۔“ (الصّف: 7) ﴿وَإِنَّكَ لَتَدْعُوهُمْ إِلَىٰ

صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿﴾ ”اور حقیقت یہ ہے کہ آپ تو انہیں سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں۔“ (المؤمنون: 73)

اسکے علاوہ قرآن نے مزید واضح کیا کہ دعوت کو اللہ کی طرف ہونا چاہیے: ﴿وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَقَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ ”اور اس شخص سے بہتر کس کا کلام ہو سکتا ہے کہ جو اللہ کی طرف دعوت دے اور نیک اعمال کرے اور کہے کہ میں مومنوں میں سے ہوں۔“ (فصلت: 33) ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ ”اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں، اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے۔“ (یوسف: 108)

قرآن نے مزید وضاحت کی کہ دعوت اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے کی خاطر دی جانی چاہئے: ﴿وَإِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ ”اور جب انہیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ (رسول) ان کے درمیان فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے۔“ (النور: 48) ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ”مومنوں کی بات تو یہ ہوتی ہے کہ جب انہیں اللہ اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کریں تو وہ کہتے ہیں ہم نے سن لیا اور مان لیا۔“ (النور: 51) ﴿يُذْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ﴾ ”.... انہیں اللہ کی کتاب کی طرف دعوت دی جاتی ہے، تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس کے باوجود ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ کر انحراف کر جاتا ہے۔“ (آل عمران: 23)



امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے، اس کی کچھ اقسام ایسی بھی ہیں جو فرض عین ہیں۔ جو اسے انجام دیتا ہے اُسے اس کا اجر ملے گا اور چھوڑنے والے کا عذر قبول نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کو قائم کرے، کیونکہ اللہ نے اس کے کرنے پر نجات اور نہ کرنے پر عذاب ذکر فرمایا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنْجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ ”جب انہوں نے بھلا دیا جو انہیں یاد دلایا گیا تھا تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جنہوں نے برائی کو روکنے کی کوشش کی لیکن جنہوں نے برائی اختیار کی ہم نے ایک آفت میں انہیں دبوچ لیا کیونکہ وہ زیادتیاں کرنے والے تھے۔“ (الاعراف: 165)

چونکہ ایمان ہی سب سے پہلا معروف اور ہر معروف کی اساس ہے اور اسکے برعکس منکرات میں کفر سب سے پہلا منکر اور ہر منکر کی اساس ہے۔ اسی لیے اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری پہلے معروف یعنی ایمان ہے جس میں سے تمام فرمانبرداری کے اعمال اخذ ہوتے ہیں اور اسکے برعکس سب سے پہلی نافرمانی منکر یعنی کفر ہے جس سے تمام نافرمانی کے باطل اعمال اخذ ہوتے ہیں۔

چونکہ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنا اطاعت گزاری کے افعال کی وہ اعلیٰ ترین قسم ہے جس کے ذریعہ ایمان اور اطاعت گزاری کے تمام افعال محفوظ و قائم رہ پاتے ہیں، اور اسکے ذریعے دعوت کو انجام دیا جاتا ہے اور اسلام کی تبلیغ کی جاتی ہے، اسکے برخلاف اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت نہ کرنا اللہ کی نافرمانی کی وہ بدترین قسم ہے جس کے ذریعے نفسانی خواہشات کی پیروی، گمراہی اور ذلالت اختیار کی جاتی ہے۔

چنانچہ امت پر فرض ہے کہ وہ اس فرض کو قائم کرنے کے لئے اکٹھے ہو کر کھڑے ہو جائے اور ایک مسلمان جسے اپنے دین کی فکر ہو، یہ جان لے کہ قرآن کی جن آیتوں یا احادیث کو وہ پڑھتا ہے، تو ان کا مخاطب وہ تنہا نہیں ہے بلکہ یہ خطاب تمام انسانیت کو کیا گیا ہے۔ بلکہ اگر خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے بھی تو یہ رسول اللہ ﷺ کے توسط سے پوری امت سے خطاب ہے جب تک کہ کوئی ایسی دلیل موجود ہو جائے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس خطاب کی تخصیص کرتی ہو۔ لہذا جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ مسلمان کو ایمان کے متعلق حکم دیتے ہیں تو یہ حکم اُس کے لئے اور دوسروں کے لئے اللہ کا فرمان ہے، جب حکم عبادات سے متعلق ہو تو یہ حکم اس کے لئے اور دوسروں کے لئے اللہ کا فرمان ہے، جب حکم اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت کرنے کے متعلق ہو تو یہ حکم اس کے لئے اور دوسروں کے لئے بھی اللہ کا فرمان ہے۔

# دعوت کے کام میں ایمان کی اہمیت اور ترجیحی فرائض

اسلام ان تمام معاریف (جمع معروف) پر محیط ہے جنہیں اللہ نے قائم کرنے کا حکم دیا ہے ان منکرات کا بھی احاطہ کرتا ہے جنہیں اللہ نے مٹا دینے کا حکم دیا ہے اور ان سے باز رہنے کا مطالبہ فرمایا ہے۔

تمام معروفات کی جڑ، اعلیٰ ترین معروف اللہ پر ایمان اور اسلامی عقیدہ کے تمام ارکان پر ایمان لانا ہے، اسی طرح تمام منکرات کی جڑ اور اولین منکر کفر اور اسکی دیگر تمام صورتیں ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ کفر سے خود باز رہیں، دوسروں کو اس سے متنفر کریں اور اس کے جال میں پھنسنے سے ڈرائیں۔

پھر معاریف میں ایمان کے بعد تقویٰ سرفہرست ہے اور یہ تقویٰ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی اطاعت کے نتیجہ میں حاصل ہوتا ہے۔ یہ ایمان کا پھل ہے، اس سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے۔ پس تقویٰ یہ ہے کہ اللہ کے غضب سے اجتناب کیا جائے اور یہ صرف شرعی احکامات کی پابندی سے ہوتا ہے، یہ پابندی اور اطاعت ایمان سے مربوط ہوتی ہے، تو جب ایک مسلمان کا ایمان مضبوط ہوتا ہے، نیکی کے کاموں پر اس کی پابندی بھی مستحکم ہوتی ہے۔ اور اگر ایمان میں کمزوری پیدا ہوتی ہے تو اطاعت (اعمال صالحہ) بھی کمزور ہوتی ہے۔ لہذا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائیں اور اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کریں اور کفر اور اس کی تمام شکلوں اور گناہ کی تمام اقسام سے اسے منع کیا گیا ہے۔

مسلمان کے ایمان و تقویٰ کی بقاء، کفر اور معصیتوں سے اس کا اجتناب نیز ایمان کا پھیلاؤ صرف ان امور کی طرف دعوت دینے، لوگوں کے پاس لے کر جانے اور اس ریاستی وجود کے قیام سے ہی ممکن ہے، جو مسلمانوں کے عقیدے، ان کے تقویٰ اور ان کی جانوں کی حفاظت کرے اور ان کو کفر و معصیت کے جالوں میں پڑنے سے بچائے رکھے۔ اسی پر رسول اللہ ﷺ کی زندگی اور عمل دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے صرف تقویٰ اور ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ آپ ﷺ نے ان اصحاب کے ساتھ مل کر اس ریاست کو قائم کیا جو پورے معاشرے کو اسی رُخ پہ چلاتی ہے جس طرف فرد کا ایمان و تقویٰ گامزن ہوتا ہے۔ اس کے قیام سے ہی ایمان و تقویٰ کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ تب ہی ہو جب رسول ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔

چنانچہ وہ معروفات جن کا ہونا ضروری ہے ان بھلائیوں کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کی طرف دعوت دینا ہم پر لازم آتا ہے اور ایسے سیاسی ڈھانچے کا قیام لازم ہو جاتا ہے جو ان معروفات کی حفاظت و نگرانی کرتا رہے۔ اور وہ منکرات جن سے فرد کے لئے پرہیز ضروری ہے، ان برائیوں کا مقابلہ کرنا، ان کا تعاقب کرنا، ان سے لوگوں کے اندر نفرت پیدا کرنا، ان کا ارتکاب کرنے والوں کا محاسبہ کرنا ہم پر فرض ہے اور اس ڈھانچے کا خاتمہ جو ان منکرات کا سبب بنتا ہے یا ان منکرات کرنے والوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے، ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔

لہذا مسلمانوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام فرض ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ بھلائی کا حکم دینے سے قبل وہ خود اسکی پابندی کریں اور منکرات سے روکنے سے قبل وہ خود اس سے اجتناب کریں۔

## پہلا پہلو: معروف پر عمل اور منکر سے اجتناب:

مسلمان سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے، اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور تمام اسلامی عقائد پر ایمان لائے یعنی اللہ پر، اللہ کے فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر، اللہ کے انبیاء اور رسولوں پر، قیامت پر، قضاء و قدر پر اس طرح ایمان رکھنا کہ خیر اور شر دونوں اللہ کی جانب سے ہیں اور کتاب و سنت میں وارد قطعی امور پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

پس ایمان ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور اجمالی طور پر ہر مسلمان سے اس کا مطالبہ کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ ایمان کی بنیاد کو پالے، چنانچہ اس سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے وجود پر یقین رکھے، جو ہر شے کا خالق ہے اور اس کی مثل اور اس کے برابر کا کوئی نہیں۔ وہی ہر کمال کی ہر صفت سے متصف ہے ہر قسم کے نقص اور عیب سے منزہ ہے اور یہ کہ اس کائنات میں موجود تمام اشیاء اور جن اشیاء پر زندگی قائم ہے اور تمام انسانی ضروریات اللہ القدیر کی طرف سے انسانوں کو مہیا کی گئی ہیں۔ وہ ذات جسے زمین و آسمان کی کوئی شے بے بس نہیں کر سکتی، وہ ذات جس کے علم اور ارادے سے کوئی شے باہر نہیں۔ وہی تنہا حقیقی معبود ہے، صرف وہی پناہ دینے والا ہے اور صرف اسی کے سامنے گڑ گڑایا جاتا ہے۔ اور صرف اسی کی رضامندی ہی سکون کا باعث ہے۔ جب مسلمان اس بنیاد کو پالیتا ہے تب یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کا اللہ پر ایمان ہے۔ اسی طرح اس سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا ہے کہ وہ ایمان رکھے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں جو دین اسلام لے کر آئے جو ان کی ذہانت اور عقلمندی کا ثمر بالکل نہیں ہے بلکہ اس کی وحی اللہ کی طرف سے کی گئی، آپ ﷺ پر ایمان میں یہ بھی ضروری ہے کہ جو دین اللہ کی طرف سے آپ ﷺ نے انسانوں کو پہنچایا، اس میں آپ ﷺ معصوم عن الخطا ہیں۔ یعنی آپ ﷺ کی جانب سے اس میں کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ اسی طرح تمام انبیاء اور کتابوں پر اجمالی ایمان لائے، فرشتوں پر، آخرت کے دن پر اور قضاء و قدر پر ایمان لائے۔ یہی ایمان کے اصول ہیں جو بھی ان

کا اقرار کرے وہ مومن بن جاتا ہے خواہ بعض تفصیلات کو وہ نہ جانتا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا ایمان تب ہی صحیح ہو گا جب کوئی ایسا کام یا ایسا عقیدہ اختیار نہ کر لے جو اس کے ایمان سے متناقض ہو۔ بہر حال یہ ایمان مضبوط اور کمزور ہوتا رہتا ہے، تو ایمان کی کمی بیشی اس کا تقاضا کرتی ہے کہ اطاعت پر پابندی اختیار کی جائے اور درست رویہ اپنایا جائے۔ چنانچہ کارزارِ حیات میں ایمان کی تاثیر اس وقت بڑھتی ہے اور اس میں قوت آتی ہے جب ایک مومن آفاقی نشانوں اور اللہ کی نازل کردہ آیات میں بکثرت غور و تدبر کرتا رہتا ہے۔ پس ایک مومن جتنا ہی اللہ کی مخلوقات، اس کی دقتِ انتظام، اس کے خالق کی قدرت اور علم و حکمت میں سوچتا رہتا ہے، اتنا ہی اس عظیم خالق پر اس کا ایمان مستحکم اور گہرا ہوتا جاتا ہے، اور اس کے دل میں اتنا ہی اس خالق کی تعظیم و تقدیس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جس قدر وہ اُن نعمتوں پر غور کرتا ہے جو خالق کی طرف سے ان پر ہوئی ہیں اور ان کو شمار کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور پھر وہ ہر اس امر اور شے کی طرف اپنا احساس اور اپنی توجہ لگانا شروع کرے، جس سے وہ غافل ہو کر رہا تھا تو اس کے نتیجے میں وہ اس کریم رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کا شکر بجالاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کا فرمانبردار بن جاتا ہے، جس قدر ایک مسلمان خالق کے علاوہ اشیاء کی عاجزی، کمزوری اور محتاجی میں غور کرتا ہے، اتنا ہی اپنی بندگی و اطاعت اور عجز و نیاز کو خالق جلّ و علا کے ساتھ خاص کرنے میں جلدی کرے گا۔

اس طرح رسول اللہ ﷺ پر ایمان قوی اور کمزور ہوتا رہتا ہے، جب ایک مسلمان کی قرآن سے شناسائی اور لگن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو اسے اس بات کا پختہ یقین ہوتا جاتا ہے کہ اس قرآن کا اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہونا محال ہے، اور اس کا یہ یقین بھی مضبوط ہو جاتا ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اسی طرح جب وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت، آپ ﷺ کی زندگی، اور اللہ کے راستے میں آپ ﷺ کو پہنچنے والی تکالیف کے متعلق غور و فکر کرتا ہے تو اس عظیم نبی ﷺ کے ساتھ

اس کی محبت اور آپ ﷺ کی شخصیت کے ساتھ اس کا تعلق بڑھتا ہے۔ چنانچہ ایسا مسلمان ساری زندگی خالق کو راضی کرنے، اور اس کی اطاعت میں کوشاں رہتا ہے اور وہ غم جو آپ ﷺ اٹھائے رہے وہی غم اٹھانے کا حریص ہوتا ہے۔

یہی حال آخرت کے دن پر ایمان کا ہے، تو ایک مسلمان جتنا قیامت کے دن کی ہولناکیوں پر غور کرتا ہے، کہ جس دن جو ان خوف کے مارے بوڑھے ہو جائیں گے، دودھ پلانے والیاں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی، حاملہ عورتیں اسقاط حمل کر بیٹھیں گی، لوگ پیش آنے والے ہولناک حالات کو دیکھ کر ایسے لگیں گے جیسے نشے میں چلے گئے ہوں، اس قسم کے غیبی مناظر جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے ان کا تصور کر کے دہشت زدہ ہو جاتا ہے، نتیجتاً وہ اس دن کی گھبراہٹ سے اپنے آپ کو بچانے اور اس دن امن پالنے کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح جب ایک مومن اُن آیات و احادیث میں غور و فکر کرے گا جن میں جنت اور مؤمنین کے لئے اللہ کی تیار کی ہوئی ہمیشہ کی نعمتوں اور لازوال خوش قسمتی کے تذکرے ہیں، تو اس کی نظر میں دنیوی لذتیں حقیر اور بے وقعت دکھائی دینے لگتی ہیں اور اس عالیشان جنت کا شوق بڑھتا جاتا ہے، پھر جب وہ اُن آیات و احادیث پر غور کرتا ہے جو جہنم کی آگ اور کافروں اور گناہگاروں کے لئے تیار کئے گئے نہ ختم ہونے والے دردناک عذابوں اور دائمی آگ کا ذکر کرتی ہیں، تو اس کا آخرت کا خوف بڑھتا جائے گا، یوں دنیوی سزاؤں اور تکالیف کا خوف ہلکا ہو گا، جبکہ جہنم کی آگ اور عذاب سے خود کو بچانے کی پوری کوشش کرے گا، خواہ اس کی وجہ سے اسے ظالموں کی قید میں جانا پڑے اور ان کے کوڑوں کے لئے اپنی پیٹھ پیش کرنی پڑے۔ اس طرح جب دل ایمان کے ساتھ بندھ جاتا ہے تو اعضا و جوارح فراست کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور پائیدار پابندی کے لئے دل کی تصدیق کرتے ہیں، جب مومن کی نظر میں آخرت بڑی دکھائی دیتی ہے تو دنیا و مافیہا اس کی نظروں میں چھوٹی دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ جب مسلمان کا ایمان پختہ ہو جاتا ہے اور جتنا جتنا ایمان قوی

اور مضبوط ہو اتنا ہی اطاعت کی پابندی مضبوط ہوتی ہے، ایسے مسلمان کو اللہ کی طرف سے غیبی تائید حاصل ہو جاتی ہے، جس کی بدولت اسے اپنے قول و عمل پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ملتی ہے، خواہ کتنا ہی مشکلات اور مشقتوں سے دوچار ہونا پڑے۔

اللہ پر ایمان کے ساتھ اللہ کے سوا ہر قسم کے طاغوت سے کفر کرنا لازم ہے، جو حق کے بالمقابل کھڑا ہو، جو کسی بھی شکل و صورت میں سامنے آئے، چاہے وہ پتھر کے بت کی صورت میں ہوں یا باطل افکار و نظریات ہوں۔ کیونکہ قرآن نے بت پرستوں اور اس قسم کے تصورات رکھنے والوں کی زبردست مخالفت کی ہے۔ ﴿قَالَ أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ \* وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ ”اُس نے کہا: کیا تم ان (بتوں) کو پوجتے ہو جسے تم خود تراشتے ہو؟ حالانکہ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم بناتے ہو، اُس کو بھی“۔ (الصَّفّت: 95-96)

اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ ۖ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۚ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ۚ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ﴾ ”بھلا کیا تم نے لات و عزیٰ (کی حقیقت) پر بھی غور کیا ہے؟ اور اُس ایک تیسرے کو جس کا نام منات ہے؟ کیا تمہارے لیے توبیخے ہوں اور اللہ کے لئے بیٹیاں؟ پھر تو بڑی بھونڈی تقسیم ہوئی!“ (النجم: 19-22)

اور اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۚ وَإِذَا تَنَلَّىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا اتُّوَابَاتُنَا بِآبَائِنَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۚ قُلِ اللَّهُ يُخَبِّئُكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ: ”جو کچھ زندگی ہے، بس یہی ہماری دُنیوی زندگی ہے، (اسی میں) ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی اور



نہیں، زمانہ ہلاک کر دیتا ہے۔ حالانکہ اس بات کا انہیں کچھ بھی علم نہیں ہے، بس وہی انداز لگاتے ہیں۔ اور جب ہماری آیتیں پوری وضاحت کے ساتھ ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو یہ کہنے کے سوا ان کی کوئی دلیل نہیں ہوتی کہ: "اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو (زندہ کر کے) لے آؤ۔ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تمہیں زندہ کرتا ہے پھر تمہیں مارتا ہے اور پھر قیامت کے دن تمہیں اکٹھا کرے گا جس میں کوئی شک نہیں مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔" (الجاثیہ: 24-26)

چنانچہ اللہ کے علاوہ کسی غیر پر ایمان لانا باطل ہے، ایسے تمام باطل کو جھٹک کر ان کا انکار کرنا ضروری ہے۔ اور جیسا کہ ایمان فکر و نظر کا تقاضا کرتا ہے، اسی طرح کفر سے بچنے اور اس کو اتار پھینکنے کے لئے بھی سوچ سمجھ اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سچھلی مذکورہ آیات لوگوں کی عقلوں کو جھنجھوڑتی ہیں اور ان سے مطالبہ کرتی ہیں کہ وہ کفار کے تمام عقائد کی حقیقت پر غور کریں تاکہ انہیں یقین ہو جائے کہ یہ تمام کفریہ عقائد باطل اور جھوٹے ہیں اور تاکہ طاعوت سے ان کا انکار بھی حقیقی انکار کہلایا جاسکے، چنانچہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرة : 256) ”پس جو شخص طاعوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط کڑے کو تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں اور اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

جس طرح غور و فکر اللہ پر ایمان لانے کا ذریعہ ہے، اسی طرح یہ طاعوت سے انکار کرنے کا ذریعہ بھی بنتا ہے ایک مسلمان سے یہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں تاکہ ایمان کے مضبوط کنڈے کو پکڑ سکے اور صحیح ہدایت حاصل کر سکے۔

یہ ایمان جو ہر مسلمان سے مطلوب ہے اس کو اپنے مطابق پابند کرتا ہے، پس جو اللہ پر ایمان لائے اور اس کے سوا سب کچھ چھوڑ دے، تو وہ دیکھے گا کہ اس کا قلب و دماغ اس عظیم معبود خالق و قدیر کی طرف مائل ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ سے محبت کرتا ہے، اس کی دل میں اللہ کی خشیت گھر کر لیتی ہے، اللہ کی رحمت کا طالب ہوتا ہے، اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ کے تمام احکامات کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اسکے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر اُس چیز سے محبت کرنے لگتا ہے جس سے اللہ محبت کرتا ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگتا ہے جس چیز سے اللہ نفرت کرتا ہے۔ اور اللہ کی طرف سے اس مسلمان پر ہوئی نعمتوں اور مہربانیوں پر اُس کی ستائش کرتے ہوئے اُس کی توجہ کا مرکز ذات خداوندی ہوتی ہے اور وہ ایسا کیوں نہ کرے جب اسے اپنے ناقص اور کمزور ہونے کا مکمل احساس ہو چکا ہے اور ایک ایسی ہستی کی ضرورت محسوس کر چکا ہے جو اس کا کارساز ہوا کرے اور اگر اللہ موجود نہ ہوتا، تو نہ ہی یہ مسلمان ہدایت پاتا اور نہ ہی اس کی حالت درست ہوتی۔ پس اللہ کے احکامات کی پابندی کر کے خوشگوار زندگی گزارتا ہے اور اگر وہ اللہ کے ذکر سے رُخ موڑ لے تو اس کی زندگی ویران اور تنگ و تاریک بن جاتی ہے اور اپنی دنیا اور آخرت کو تباہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ ایمان انسان کو حقیقی طور پر پابندی اور تقویٰ کی طرف لے جاتا ہے اور پھر یہ ایمان انسان کو خالق کی عبادت اور اس کی اطاعت کی طرف موڑ دیتا ہے اور وہ ہر ایسی بات سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بنتی ہو اور اللہ کی رضا کے حصول کی خاطر معروف اعمال کی انجام دہی کے لئے اُسے بے چین کئے رکھتا ہے۔ اب وہ کیا چیز ہے جو اللہ کی رضا کا ذریعہ بنتی ہے؟ یا اللہ کے غضب کا باعث بنتی ہے... بے شک اللہ کی خوشنودی کا سبب اللہ کی اطاعت ہے، اور یہ اطاعت وہ متعدد معروفات ہیں جن کو شارع نے مسلمانوں کے لئے متعین کیا ہے اور انسانوں کو ان معروفات کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ اللہ کی ناراضگی کا سبب اللہ کی نافرمانی ہے اور یہ وہ منکرات ہیں جن کا شارع نے تعین کیا ہے اور انسانوں کو ان سے باز رہنے کا حکم دیا ہے۔

## فرض عین اور فرض کفایہ:

فرائض الہی میں غور کرنے والا یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کچھ احکامات انفرادی ہیں اور کچھ احکامات اجتماعی ہیں۔ فرض عین وہ فرض ہوتا ہے جس کی ادائیگی فرداً فرداً ہر ایک مکلف پر ذاتی طور پر لازم ہوتی ہے، یعنی ایک شخص اگر اس فرض کو ترک کر دے اور باقی تمام لوگوں نے اسے ادا کیا بھی ہو تب بھی اس شخص سے ساقط نہیں ہو گا اور اگر صرف اس ایک ہی شخص نے اس فرض عین کو ادا کیا، باقی تمام لوگوں نے اسے نظر انداز کر دیا تو وہ شخص اللہ کی بارگاہ میں اس کے گناہ سے بری الذمہ ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ تمام فرض عین امور کی تحقیق کرے اور ان کا پابند بنے، تاکہ خالق کے حضور اس کی ذمہ داری اتر جائے۔ فرض عین کا یہی اصول ممنوعہ اعمال میں بھی کارفرما ہے کیونکہ یہ سب عین ہیں اور ایک ایک فرد سے ان کو نہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، چنانچہ ایک مسلمان پر لازم ہے کہ وہ نماز ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، استطاعت رکھتا ہو تو وہ بیت اللہ کا حج کرے، صاحب نصاب ہو تو زکوٰۃ ادا کرے، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے، حلال اور پاکیزہ غذا کھائے اور ناپاک و حرام غذا سے دور رہے، زنا، جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے باز رہے جن کے متعلق مسلمان کو معلومات حاصل کرنی ضروری ہے چنانچہ مسلمان ہر وہ عمل انجام دے گا جو معروف ہے اور ہر اس عمل سے باز رہے گا جو منکر ہے۔

## فرض کفایہ:

بعض فرائض کو کفایہ کہا جاتا ہے۔ ایسے فرائض کا وجود مطلوب ہوتا ہے، قطع نظر اس سے کہ کون اس ذمہ داری کو پورا کر رہا ہے۔ ہر مسلمان پر فرداً فرداً ان کی ادائیگی واجب نہیں ہے، بلکہ ایسے

فرائض کی ادائیگی مطلوب ہوتا ہے، خواہ تمام مسلمان اس کی ادائیگی میں شریک ہو جائیں یا تھوڑے۔ اگر انہیں کسی کی طرف سے بھی انجام نہ دیا گیا تو تمام مسلمان اس گناہ میں شریک ہونگے اور گناہ سے صرف وہی افراد بچ پائیں گے جنہوں نے اس کو انجام دیے جانے اور اسکے قیام کے لئے جدوجہد اختیار کی ہو اور اس فعل کی انجام دہی میں سنجیدگی کے ساتھ شامل اور سرگرم ہوئے۔ کوئی یہ گمان نہ کر بیٹھے کہ فرض کفایہ کو انجام نہ دیئے جانے کی صورت میں چونکہ تمام مسلمان اس گناہ میں شریک ہونگے اسلئے اس پر گناہ کا بوجھ کم ہو جائے گا چنانچہ فرض کفایہ کو نظر انداز کرتا رہے۔ حقیقت ایسی نہیں کیونکہ قیامت کے دن ایسا شخص اکیلا اپنے سر پر اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائے آئے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَكُلُّهُمْ آتِيهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا﴾ ”اور قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک شخص اُس کے پاس اکیلا آئے گا۔“ (مریم: 95)۔

دنیا میں تو اس بات سے طفل تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ اکیلا گناہ گار نہیں بلکہ دیگر مسلمان بھی اس گناہ میں شریک ہیں، مگر یہ امر آخرت میں اس کا بوجھ ہر گز ہلکا نہیں کرے گا، اس لئے جو مسلمان اب تک فرائض کفایہ کی ادائیگی میں لاپرواہی اور کوتاہی برتتے رہے ہیں اور اب تک ان فرضوں کو وجود نہیں ملا ہے، انہیں چاہئے کہ سنجیدگی کے ساتھ اس کو انجام دیں تاکہ جناب باری تعالیٰ میں اس کی گلو خلاصی ہو، یہ کام قیامت کا دن آنے سے پہلے پہلے کیا جائے، جس دن دل اور آنکھیں اُلٹ جائیں گے۔ چنانچہ ایک مسلمان جس کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور اُس کی وعید سے ڈرتا ہے، اس کے وعدہ رحمت کی آرزو رکھتا ہے، اُسے اللہ کو راضی کرنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے، وہ جنت کی کامیابی اور جہنم سے نجات پانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ ایسا مسلمان اجتماعی فرائض (فرض کفایہ) کا قیام واجب سمجھتا ہے اور اگر یہ فرائض اب تک قائم نہیں ہیں تو اگر وہ ان کو قائم کرنے کے لئے عملی قدم نہیں اٹھائے گا تو وہ گناہ گار ہو جائے گا۔ اس کی یہ سوچ اس کو عمل کے لئے کھڑا کر دیتی ہے۔ اور اگر اس فرض کفایہ کو انجام دیا جا

چکا ہو تو اس پر کسی قسم کا الزام نہ ہو گا۔ چنانچہ اللہ کے ہاں بری الذمہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ذاتی طور پر فرض کفایہ کا بھی وہی اہتمام کرے جیسے فرض عین کا اہتمام کرتا ہے۔

مثال کے طور پر اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنا، اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، اجتہاد کرنا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا۔ یہ تمام فرض کفایہ میں شمار ہوتے ہیں جن کا قیام تمام مسلمانوں پر اجتماعی طور پر فرض ہے ورنہ تمام مسلمان گناہگار ہونگے۔ پس اگر امت کے اندر اجتہاد موجود نہ ہو تو ہر ایک شخص گناہگار ہو گا، سوائے اُن لوگوں کے جو مجتہدین پیدا کرنے کا کام کر رہے ہوں۔ اور امت کے اندر مجتہدین پیدا کرنے کے لئے ان لوگوں کی موجودگی اور ان کی کوشش دوسرے مسلمانوں سے گناہ ساقط نہیں کرتی، تاوقتیکہ امت کے اندر مجتہدین اور اجتہاد کے کام کو وجود ملے۔ جب امت میں اجتہاد کا شعبہ زندہ ہو جائے تو اس کے بعد تمام لوگوں کے سروں سے عدم موجودگی کا گناہ اُتر جائے گا، یہی قضیہ اسلامی ریاست کے قیام کا ہے، ہر وہ شخص جو اس فرض کو انجام دینے کی جدوجہد میں شریک نہیں ہے اللہ کی عدالت میں گناہگار ہو گا اور یہ خیال نہ کیا جائے کہ اس فرض کے قیام کے لئے کچھ مسلمان دوڑ دھوپ میں لگے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی کوشش اور ان کی موجودگی سے اس کا گناہ نہیں اُترتا، جب تک اسلامی ریاست کو وجود میں نہ لایا جائے۔ کتاب ”الفکر الاسلامی“ میں ”الفرض علی الکفایۃ فرض علی کل مسلم“ کے عنوان کے ذیل میں آیا ہے: ”فرض عمل کسی بھی صورت میں ساقط نہیں ہوتا جب تک کہ اسے قائم نہ کیا جائے۔ فرض کو چھوڑنے والا سزا کا مستحق ہو گا۔ وہ تب تک گناہگار رہے گا جب تک وہ اس فرض کو انجام نہ دے۔ فرض کفایہ کے انجام نہ ہو پانے کی صورت میں فرض کفایہ اور فرض عین میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ تمام فرائض تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر عائد فرائض ہیں، چنانچہ اللہ رب العزت کا فرمان: ﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا﴾ ”جہاد کے لئے نکل کھڑے ہو، چاہے تم ہلکے ہو یا بوجھل“ (التوبہ: 41)

یہ حکم ایک فرض کفایہ ہے، ایسے تمام فرائض کفایہ میں فعل کی طلب جازم پائی جاتی ہے، چنانچہ کسی بندہ کا فرض کفایہ اور فرض عین کے درمیان اس کی فرضیت سے متعلق تفریق کرنا اللہ کے نزدیک گناہ ہے اور یہ تفریق اللہ کے راستے سے روکنا شمار کیا جائے گا۔ اور یہ ایسا مغالطہ ہے جس کا مقصد اللہ کے فرض کردہ احکامات میں سستی برتنے کا باعث ہے۔ وہ شخص جس پر فرض کفایہ کی انجام دہی واجب ہوئی ہو، اُس کی ذمہ داری ختم ہونے کے معاملہ میں بھی فرض کفایہ اور فرض عین میں کوئی تفریق نہیں۔ کسی بھی فرض کی ادائیگی کی ذمہ داری اُس وقت تک رہتی ہے، جب تک شارع کا مطلوبہ حکم قائم نہ کیا جائے، چاہے فعل کی طلب ہر مسلمان سے کی گئی ہو، جیسے پانچ وقتوں کی نمازیں، یا حکم کی طلب بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں سے ہو مثلاً خلیفہ کی بیعت۔ ان میں سے کسی بھی فرض کی ذمہ داری اس وقت رہتی ہے جب تک وہ عمل انجام نہ دیا جائے یعنی جب تک کہ نماز قائم کی جائے اور خلیفہ کا انتخاب کیا جائے، اور بیعت دی جائے۔ چنانچہ کچھ افراد کا فرض کفایہ کو انجام دینے کی جدوجہد میں لگے رہنے سے باقی مسلمانوں سے یہ فرض ساقط نہیں ہوگا، جب تک کہ اس فرض کفایہ کی تکمیل نہ ہو جائے۔ چنانچہ ایسے تمام مسلمان جو فرض کفایہ کی ادائیگی سے بیٹھے رہے اُس وقت تک گناہگار ہوں گے، جب تک اس فرض کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچایا جائے، چنانچہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ فرض کفایہ ایسا فرض ہے کہ جسے کچھ لوگ اس کے لئے کام کریں تو تمام لوگوں سے اس کی ذمہ داری زائل ہو جاتی ہے، بلکہ فرض کفایہ وہ ہے جو بعض کے قائم کر دینے سے باقی لوگوں کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے، یقیناً اُس وقت تو اس فرض کا سقوط امر واقع ہو گا کیونکہ مطلوبہ فرض قائم ہو چکا، اور اب کسی کے ذمہ اس کو قائم کرنا باقی ہی نہیں رہا۔ چنانچہ گناہ کی پھر کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے فرض کفایہ اور یہ بالکل فرض عین کی طرح ہے۔ اس بنا پر اسلامی ریاست کا قیام تمام مسلمانوں پر فرض ہے یعنی یہ ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ یہ فرض کسی بھی مسلمان کے ذمہ سے نہیں اُترتا، جب تک کہ اسلامی ریاست کا قیام نہیں ہو جاتا۔

یعنی ہر مسلمان پر یہ فرض اور نہ کرنے کا گناہ باقی رہے گا تا آنکہ ریاست کو قائم کیا جائے، اور باقی مسلمانوں سے اس کو قائم نہ کرنے کا گناہ صرف اس وقت ہی ساقط ہو گا جب وہ بھی اس کے قیام تک مسلسل اُن اعمال کی انجام دہی میں لگے رہیں جو اس کے قیام کے لئے ناگزیر ہیں۔ اس طرح ہر فرض کفایہ ہر ایک مسلمان فرد کے ذمہ فرض رہتا ہے اور اس کے ذمہ سے تب تک نہیں اترتا جب تک کہ مطلوبہ عمل کو انجام نہ دیا جائے۔

اس طرح ہم پر فرض عین اور فرض کفایہ کی حقیقت واضح ہونے کے بعد یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے خالق کی بارگاہ میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ فرض عین کو ذاتی طور پر ادا کریں اور فرض کفایہ کو قائم کرنے کے لئے دوسروں کو ساتھ ملا کر کام کریں۔

## فرائض کی ترجیح:

فرائض میں فرض عین کو انجام دینا شرع کی اولین ترجیحات میں سے ہے۔ پس جب ایک مسلمان فرض عین و فرض کفایہ سب انجام دے سکتا ہو تو اس سے مطالبہ تمام فرائض کو انجام دینے کا ہے، چنانچہ ایسے شخص کے لئے کسی تکلیف و پریشانی کی بات نہیں ہے۔ البتہ اگر دونوں ہی قسم کے فرائض بیک وقت متوجہ ہوں اور وہ صرف کسی ایک کو انجام دے سکتا ہو تو ایسی صورت میں فرض عین کو فرض کفایہ پر ترجیح حاصل ہے اور وہ سب سے پہلے فرض عین کو انجام دے گا۔ اگر بیک وقت کئی فرض عین اعمال اس کی طرف متوجہ ہوں تو ان مختلف عین فرائض کے درمیان تعارض کی صورت میں ترجیح کا فیصلہ عقل کی بنیاد پر نہیں بلکہ شرع کی بنیاد پر کیا جائے گا، جس نے تمام فرائض کے درمیان ترجیح کا تعین کر رکھا ہے۔ چنانچہ اہل خانہ کا نان نفقہ قرض کی ادائیگی پر مقدم ہے اسی طرح قرض کی ادائیگی کو حج کے

اخراجات پورے کرنے پر ترجیح حاصل ہے۔ رمضان کے روزے نذر و نیاز کے روزوں پر ترجیح رکھتے ہیں، نماز جمعہ کی ادائیگی کسی سے کئے ہوئے وعدہ پر ترجیح رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح اگر دو یا دو سے زائد فرض کفایہ بیک وقت متوجہ ہوں اور بیک وقت ان افعال کو انجام دینا ناممکن ہو تو اس صورت میں بھی ترجیح کا فیصلہ عقل کی بنیاد پر نہیں ہو گا بلکہ شرع متعین کرے گی، شرع نے ایسی صورت میں کچھ فرائض کو دیگر فرائض پر فوقیت دے کر ان کی ترجیحات متعین کی ہیں یہ موضوع کافی وسیع اور پیچیدہ ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ فرض کفایہ بہت زیادہ ہیں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کافی دشوار ہیں، بعض ایسے ہیں جنکی انجام دہی کی خاطر کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، تو کہیں ایسے فرض کفایہ ہیں جن کی خاطر مسلسل انتھک جدوجہد اور کثیر وقفہ درکار ہوتا ہے، یہ فرائض اتنے کثیر ہیں کہ ایک مسلمان ان سب کو انجام نہیں دے سکتا۔ چنانچہ مسلمان کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ کچھ فرائض کو انجام دے اور ان کی خاطر کچھ فرائض کو چھوڑ دے۔ کن فرائض کو انجام دینا ہے اور کن کو نہیں؟ یہ فیصلہ ذاتی خواہشات، عقلی اندازوں شخصی دلچسپی کی بنیاد پر ہر گز نہیں کیا جائے بلکہ اس کی بنیاد صرف فقہی ترجیح ہونا چاہئے اور شرع یہ بتائے گی کہ کس فرض کو مقدم کیا جائے گا۔ اس کو شرعی قرائن سے جو کسی فرض کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں، اخذ کیا جائے گا۔

### اہم ترین فرائض کفایہ:

مثال کے طور پر ہم نے یہ طے کر لیا ہے کہ فرائض کفایہ میں سے اولین درجہ پر ریاست اسلامی کا قیام آتا ہے، یہ فیصلہ ہم نے قرآن و سنت کی نصوص سے اخذ کیا ہے۔



ایسی آیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے کو واجب قرار دیتی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ کافر ہیں۔“ (المائدہ: 44) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔“ (المائدہ: 45) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ فاسق ہیں۔“ (المائدہ: 47) ﴿يُرِيدُونَ أَن يُتَحَكَّمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ﴾ ”ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لئے طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔“ (النساء: 60) ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ ”نہیں (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔“ (النساء: 65) ﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾ ”اور (ہم حکم دیتے ہیں) کہ تم ان لوگوں کے درمیان اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔“ (المائدہ: 49) ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ ”بھلا کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ یقین رکھتے ہوں ان کے لئے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟“ (المائدہ: 50)

ان تمام نصوص اور دیگر متعلقہ نصوص پر عمل درآمد کا انحصار ایک ایسی اسلامی ریاست کی موجودگی پر ہے جو خالص اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے۔

ایسی آیات بھی بہت زیادہ ہیں جو حدود کو قائم کرنے کا حکم دیتی ہیں، مثال کے طور پر اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا﴾ ”اور چور خواہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو“۔ (المائدہ: 38) ﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ﴾ ”زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد دونوں کو سو کوڑے لگاؤ“ (النور: 2) ﴿وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً﴾ ”اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں، پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، تو ان کو اسی کوڑے لگاؤ“۔ (النور: 4) ﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لَوْلِيَّهِ سُلْطَانًا﴾ (الاسراء: 33) ”اور جو شخص مظلومانہ طور پر قتل ہو جائے تو ہم نے اس کے ولی کو (قصاص کا) اختیار دیا ہے“۔ ﴿إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ﴾ (المائدہ: 33) ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑائی کرتے اور زمین میں فساد مچاتے پھرتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا انہیں جلا وطن کر دیا جائے“۔

مختلف احادیث ایسی آئی ہیں جو شراب پینے والوں کو کوڑے لگانے کا ذکر کرتی ہیں اور شادی شدہ مرد یا عورت جو زنا کاری کے مرتکب ہوں ان کو سنگسار کر دینے کا حکم دیتی ہیں۔ دانت کے بدلہ دانت ہے، زخمی کرنے کی صورت میں مجرم سے ویسا ہی بدلہ یا اتنا ہی قصاص لینا، قصاص نہ دیئے جانے کی شکل میں مظلوم کو خون بہا (آرش) دلانے کا انتظام اور ان امور کے لئے تعزیرات کا قیام جن کے لئے شرع نے کوئی حد نہ بتلائی ہو، اس قسم کے تمام احکامات اور حدود جو اللہ نے وضع کئے ہیں ان پر عمل

درآمد دراصل اسلامی ریاست کے وجود پر منحصر ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے۔

جہاد فی سبیل اللہ کا حکم دینے والی آیات بہت زیادہ آئی ہیں، ان میں سے چند بطور مثال یہ ہیں:

﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾  
 (التوبہ: 41) ”(جہاد کے لئے) نکل کھڑے ہو، چاہے تم ہلکے ہو یا بوجھل، اور اپنے مال و جان سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو“ ﴿قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ﴾ (التوبہ: 29) ”وہ اہل کتاب جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، نہ یوم آخرت پر، اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے، اور نہ دین حق کو اپنا دین مانتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، اُن سے جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔“ ﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً﴾ (التوبہ: 36) ”اور تم سب مل کر مشرکین سے اُسی طرح لڑو جیسے وہ سب تم سے لڑتے ہیں۔“ ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ (الانفال: 39) ”اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔“ ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِنْ دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ﴾  
 ”اور (مسلمانو!) جس قدر طاقت اور گھوڑوں کی جتنی چھاؤنیاں تم سے بن پڑیں، ان سے مقابلے کے لئے تیار کرو، جن کے ذریعے تم اللہ کے دشمن اور اپنے (موجودہ) دشمن پر بھی ہیبت طاری کر سکو، اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جنہیں ابھی تم نہیں جانتے، (مگر) اللہ انہیں جانتا ہے۔“ (الانفال: 60)

تو یہ اور اس مضمون کی متعدد آیات واحادیث پر عملدرآمد ریاستِ اسلامی کی موجودگی پر منحصر ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ کئی احادیث ایسی ہیں جو بتلاتی ہیں کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور کسی عادل کا عدل اور ظالم کا ظلم اسے روک نہیں پائے گا۔ یعنی جب جہاد کی ضرورت ہو تو مسلمان پر فرض ہے کہ وہ جہاد میں حصّہ لے، چاہے اسلامی ریاست موجود ہو یا نہ ہو۔ یعنی کسی بھی امیر کی امارت میں جہاد جاری رہے گا، امیر چاہے نیک ہو یا بد۔ البتہ آج ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ یہ فاسق و فاجر حکمران نہ تو جہاد کرتے ہیں اور نہ ہی وہ اللہ کی راہ میں جہاد کی دعوت دیتے ہیں۔ بلکہ وہ ایسی جنگ کے احکامات دیتے ہیں جو مسلمانوں کے درمیان ہو۔ ان کے ہتھیار صرف مسلمانوں ہی خلاف استعمال ہوتے ہیں اور وہ اپنا یہ باطل عمل تب تک جاری رکھیں گے جب تک کہ ایسے لوگ جو اللہ اور یومِ آخرت پر حقیقی ایمان رکھنے والے ہوں، ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور ان چھوٹی چھوٹی کفر یہ سلطنتوں کا قلع قمع کر کے ان کی جگہ ایک واحد اسلامی ریاست قائم کر لیں، جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے گی۔

اسکے علاوہ متعدد آیات ایسی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ اسلام کے آفاقی پیغام کو تمام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری امتِ مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہ کہ اس امت کو تمام اگلی پچھلی اقوام عالم کے مقابلے میں افضلیت حاصل ہے۔ مثلاً: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ﴾ ”(مسلمانو!) تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے فائدے کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کی تلقین کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“ (آل عمران: 110) ﴿وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ ”حالانکہ عزت تو اللہ ہی کو حاصل ہے اور اُس کے رسول کو، اور ایمان والوں کو لیکن منافق لوگ نہیں جانتے۔“ (المنافقون: 8) ﴿وَلَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى

المُؤْمِنِينَ سَبِيلًا ﴿ اور اللہ کافروں کے لئے مسلمانوں پر غالب آنے کا ہر گز کوئی راستہ نہیں رکھے گا۔ (النساء: 141)

”لوگوں کے متعلق گواہی“ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ ”اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل اُمت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔“ (البقرة: 143)

آج جبکہ مسلمانوں کی کوئی ریاست موجود نہیں تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اہل ایمان کو عزت ملے اور کفار کا ان پر غلبہ نہ ہو؟ اور جبکہ اپنے گھر کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ادائیگی میں ان سے کوتاہی سرزد ہو رہی ہے تو وہ کس طرح اقوام کو معروف کا حکم دے سکیں گے اور منکر سے روک سکیں گے۔ چنانچہ ایک ایسی اسلامی ریاست کی غیر موجودگی میں ان تمام افعال کو انجام دینا غیر ممکن ہے جو خالصتاً اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرتی ہو۔

اسکے علاوہ متعدد احادیث ایسی وارد ہیں کہ تمام مسلمانوں کا ایک امام ہونا چاہئے جس کو وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی شرط پر بیعت دیں۔ ((وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةُ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) ”اور جو اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں (خلیفہ کی) بیعت کا طوق نہ ہو تو وہ گویا جاہلیت کی موت مرا“۔ ((إِنَّمَا الْإِمَامُ جُنَّةٌ يُقَاتِلُ مِنْ وَرَائِهِ وَيَتَّقِي بِهِ)) ”امام ہی وہ ڈھال ہے جس کے پیچھے رہ کر لڑا جاتا ہے اور اسی کے ذریعے تحفظ حاصل کیا جاتا ہے۔“ ((مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئًا فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ فَإِنَّهُ لَيْسَ أَحَدٌ مِنَ النَّاسِ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شَبْرًا فَمَاتَ عَلَيْهِ إِلَّا مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً)) ”جس نے اپنے

امیر کی کسی چیز کو ناپسند کیا تو لازم ہے کہ وہ اس پر صبر کرے۔ کیونکہ لوگوں میں سے جس نے بھی سلطان (یعنی شرعی اتھارٹی) کی اطاعت سے باشت برابر بھی خروج کیا اور وہ اس حالت میں مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔ (ان تمام احادیث کو مسلمؒ نے روایت کیا ہے)

صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) نے اس بات پر اجماع کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد رسول اللہ کے خلیفہ (جانشین) کا تقرر کرنا فرض ہے، چنانچہ انہوں نے ابو بکر الصدیق کو رسول اللہ ﷺ کا جانشین (خلیفہ) مقرر کیا، اسی طرح حضرت ابو بکر الصدیقؓ کی وفات کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ (نائب) مقرر کرنے پر اجماع کیا، پھر عمر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد عثمانؓ کی خلافت پر، پھر عثمان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجماع کیا۔ تمام صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) تاحیات امت کے امیر یعنی خلیفہ کے انتخاب اور تقرر کی فرضیت پر متفق رہے۔ اگرچہ ان میں اس معاملہ میں اختلاف ضرور ہوا کہ خلیفہ کسے منتخب کیا جائے لیکن خلیفہ کو مقرر کرنے کی فرضیت کے متعلق ان میں اختلاف کبھی بھی رونما نہیں ہوا۔

اسی طرح اسلامی معاشرہ میں زندگی گزارنے کے لئے درکار ضروریاتِ زندگی مثلاً صنعتیں، علاج و معالجہ، ہسپتال بنانے، کارخانے، اور لیبارٹریوں کا قیام، فوجی قوت و طاقت کو تیار کرنا اور اسی طرح کی دیگر ضروریاتِ زندگی فرائض کفایہ ہیں، جن کی فراہمی کی ذمہ داری مسلمان آپس میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ لیکن کامل طور پر اس فراہمی کا بندوبست اس شان سے کرنا جس کے نتیجے میں ایک خوشحال اسلامی زندگی حاصل ہو جو ایک طرف اللہ کی بندگی پر استوار ہو اور دوسری طرف دعوت کو پھیلانے کے لئے مسلمانوں کی قوت کی تیاری میں مصروف ہو، یہ صرف اور صرف ایک ایسی ریاست کے ذریعے ہی منظم ہو سکتا ہے جو ان فرائض کے قیام کی نگرانی کرے اور اس کے لئے ایسا موثر نظم و ضبط قائم کرے جو

اسلام کی فطرت اور اس کے مقاصد سے کلی طور پر ہم آہنگ ہو، (یعنی تمام انسانوں کی زندگیاں اسلامی طرز پر چلنے لگیں اور صرف معبود حقیقی الہ العالمین کی عبادت کا نظام دنیا میں قائم ہو۔)

اسی طرح اسلام نے ایک حاکم پر یہ ذمہ داری عائد کر رکھی ہے کہ وہ تمام لوگوں کو ان اسلامی احکام کا پابند بنائے جنہیں شرع نے ان پر فرض قرار دیا ہے۔ خلافت ناپید ہونے کی صورت میں وہ تمام احکامات معطل ہو جاتے ہیں جو حکمران کی موجودگی پر منحصر ہیں، اسی طرح جب عام لوگ بھی ان احکام سے روگردانی کر لیں جو خود انہیں سے متعلق ہیں تو عوام اپنے معاشرہ میں سے ایسے حاکم کبھی بھی نہیں پاسکیں گے جو ان کو ان احکام کی پابندی کرواتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہونے کی صورت میں لوگوں سے متعلق اکثر احکامات تعطل کا شکار ہو جائیں گے، اس بنا پر زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسلام کا عملی وجود قائم ہونے کے لئے اسلامی ریاست کی موجودگی بنیادی امر بن کر سامنے آتی ہے، اور جب یہ بنیاد ڈھے جاتی ہے تو اسلامی احکامات کا بہت بڑا مجموعہ ڈھے جاتا ہے، یا یوں کہئے کہ اسلامی شرعی نصوص کی بہت بڑی تعداد معطل ہو جاتی ہے، مسلمان اپنی شناخت، عزت اور وقار کھو بیٹھتے ہیں اور مسلمانوں کی زمینیں (اراضی) غصب ہو جاتی ہیں اور ان پر ان کے دشمنوں کا تسلط قائم ہو جاتا ہے اور ان کے اندر منکرات عام ہو جاتے ہیں، جس کا مشاہدہ ہم آج کھلی آنکھوں کر رہے ہیں۔

**اسلامی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا قیام نہیں ہو سکتا:**

عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے جدوجہد کیے بغیر اسلام کے قیام کے لئے سرگرم دکھائی دیتے ہیں۔

مزید حیران کن امر یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو اسلامی ریاست اور اس کے قیام کو ایک عام شرعی حکم کی حد تک تسلیم کرتے ہیں مگر ان کے نزدیک اس کو دیگر احکام پر کوئی ترجیح یا فوقیت حاصل نہیں۔

اسی طرح یہ بھی حیران کن ہے کہ آپ کو مسلمانوں میں سے کچھ افراد موجودہ حکومتوں اور نظاموں کے راستے اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں، اور اس کے لئے اسلامی ریاست کے قیام کی شرعی جدوجہد کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ وہ اسلامی ریاست جو کہ خالصتاً اسلام کے تمام ہی احکامات کو انجام دیتی ہے جس کے لئے شرع نے اسے ذمہ دار بنایا ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام فرض کفایہ احکام میں سب سے اہم اور ناقابل تاخیر فرض ایسی اسلامی ریاست کا قیام ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ آج اگر اس فرض کو مسلمانوں میں سے متعدد افراد نے سر دست لیا ہوا ہے، لیکن ان کا کام کفایت نہیں کرتا کیونکہ ریاست اسلامی اب تک قائم نہیں ہو پائی ہے اس بنا پر یہ فرض کفایہ بالکل فرض عین جیسا بن چکا ہے، جیسا کہ اس امر کو اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، اور وہ یہ کہ آج ہر مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی وسعت و طاقت کے بقدر اسلامی ریاست کو قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دے۔

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ صحیح ترین اور نہایت باریکی سے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء یہ ہے کہ ایک مسلمان سب سے پہلے اُن فرض عین کا مطالعہ کرے جن کا اللہ جل و شانہ نے حکم دیا ہے، اس کے ساتھ ان انفرادی قسم کے حرام افعال کا بھی مطالعہ کرے جن کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اور حرام سب عینی ہوتے ہیں۔ بعد ازاں اسے چاہئے کہ وہ فرض کفایہ کا مطالعہ کرے جنہیں اللہ نے قائم کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ مسلمان اسے انجام دیں اور بقدر استطاعت اس کے قیام میں حصہ لے سکیں۔ الحمد للہ،



اس موضوع پر مطالعہ کے بعد اللہ نے اس اہم ترین فرض کفایہ کے متعلق ہمیں ہدایت نصیب کی ہے اور وہ یہ کہ ریاست اسلامی کے قیام کے لئے عمل فرض ہے، وہ اسلامی ریاست جو اکثر اسلامی احکامات کے نفاذ کا طریقہ کار ہے، خواہ وہ فرض عین ہوں یا فرض کفایہ۔

اس طرح مسلمان خود کو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کے لئے تیار کر لیتا ہے، جہاں اس سے یہ پوچھا جائے گا کہ کون سے کام وہ دنیا میں کر آیا ہے اور کون سے کام جو اس نے کرنے تھے چھوڑ آیا ہے، کیونکہ اس نے فرض عین کو انجام دیا اور انفرادی قسم کے حرام افعال سے گریز کیا، اس کے علاوہ اس نے سب سے اہم ترین فرض کفایہ کو بھی انجام دیا ہے جس کے قائم ہو جانے پر اس سے منسلک تمام فرائض کے گناہ بھی اس سے دھل جاتے ہیں، ایسے فرائض بے شمار ہیں۔ اس کارکردگی کی بنا پر ایک مسلمان نے گویا حقیقت کا احاطہ کر لیا۔ کیونکہ اس نے وہ تمام افعال انجام دیئے ہیں جو خود اسکی ذات کے اندر اسلام کو انفرادی طور پر قائم کرتے ہیں اور ان کے ساتھ اس نے وہ بھی فعل انجام دیا ہے جو اسلام کو معاشرہ میں اجتماعی طور پر قائم کرے گا۔ اب اگر کچھ چھوٹ جاتا ہے تو یہ وہ تھوڑے بہت ایسے فرض کفایہ ہونگے کہ جن کی انجام دہی کے عمل کی نوعیت اجتماعی نہیں ہوتی صرف ذاتی ہے مثلاً ایک مسلمان کو چھینک آجائے تو اسکو دعا دینا، کسی فرد واحد کا نماز جنازہ میں شریک ہونا۔

### معروف اور منکر کا علم:

معروف پر عمل کرنے اور منکر سے بچنے کی بحث ہمیں معروف اور منکر کے بارے میں علم کے حصول کی راہ دکھاتی ہے، کیونکہ علم عمل سے پہلے ہوتا ہے۔ کسی بھی حکم پر عمل صرف تب ہی ہو سکتا ہے جب اس کے بارے میں علم ہو، دیکھنا یہ ہے کہ از روئے شرع ایک فرد مسلم سے جس علم کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کی حدود کیا ہیں؟

یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ کسی بھی عمل سے پیشتر عمل اس کے بارے میں معلومات کا حصول ہوتا ہے اور یہ کہ عمل کا شرعی معلومات کے مطابق ہونا ضروری ہے، ورنہ ایسا عمل عبادت میں شمار نہیں ہوگا، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو معروفات کی انجام دہی کا حکم دیا ہے تو ہر ایک فردِ مسلم پر لازم آتا ہے کہ وہ ان معروفات کا علم حاصل کرے تاکہ انہیں انجام دے سکے اسی طرح چونکہ اللہ نے منکرات سے باز رہنے کا حکم دیا ہے چنانچہ ہر ایک مسلمان پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ان منکرات کا علم حاصل کرے تاکہ ان سے بچ سکے۔

مطلب یہ ہے کہ عبادت، اطاعت و پابندی اصل ہیں اور ان کا علم بھی لازم ہے، یعنی علم ان ہی کے لئے ہے۔ علم بذاتِ خود مطلوب نہیں، البتہ عبادت، اطاعت اور احکامات کی پابندی اس کے بغیر ہو بھی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ (النساء: 64) ”اور ہم نے کوئی رسول اس کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“

جیسا کہ عبد اللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ”ہم نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، مگر علم نے خود انکار کیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی اور مقصد کے لئے ہو، اصل مقصد اللہ کی عبادت اور اطاعت ہے، ان دونوں کے بارے میں علم کا ادنیٰ ترین درجہ تقلید اور اس کا اعلیٰ ترین درجہ اجتہاد ہے۔ یہ دونوں ہی طریقے اچھے ہیں، مقصود حکم شرعی کی پابندی اور فرمانبرداری ہے۔ چنانچہ جب کوئی اس طرح نماز پڑھتا ہے کہ اسکی شرائط اور ارکان کا خیال رکھے اور اس کو باطل کر دینے والی چیزوں سے باز رہتا ہے تو اس نے یقیناً اللہ کی عبادت کی اور عین وہ کچھ انجام دیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا ہے اور یہی اس سے مطلوب ہے۔ مگر عبادت کی اس طور پر ادائیگی کہ اس کے لئے اس نے اجتہاد اور اور تلاش

و جستجو نہیں کی، بہت بڑی خیر سے محرومی کی بات ہے۔ اس خیر سے مراد ایسا علم ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ و تعالیٰ مسلمان کے درجات میں اضافہ کرتے ہیں، کیونکہ اس نے فقط اتنا ہی کیا کہ ایک مقلد کی حیثیت سے عبادت انجام دی اور حکم کو ایک ایسے عالم سے حاصل کیا جس کو وہ علم، تقویٰ و پرہیزگاری میں بہترین تسلیم کرتا ہے، چنانچہ اس عالم کے بتلائے ہوئے حکم کے برحق اور عین اللہ کی اطاعت ہونے کا اسے غالب گمان حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ جو متبع کی حیثیت سے عبادت انجام دیتا ہے، یعنی حکم کسی اور سے حاصل کرتا ہے، مگر وہ اس کی دلیل کا علم بھی رکھتا ہے ایسا شخص بھی مقلد ہے، البتہ وہ درجات میں اُس مقلد عالمی سے بہتر درجہ رکھتا ہے جو دلیل کو پہچانے بغیر حکم حاصل کرتا ہے۔ یہ دونوں کسی دوسرے شخص سے ہی حکم حاصل کرتے ہیں اور عبادت و اطاعت اختیار کرتے ہیں۔ جبکہ مجتہد کی حالت ان دونوں سے بہت بہتر ہے، اس کا انجام اور اس کے درجات سب سے بڑھ کر ہیں، کیونکہ وہ خود حکم اختیار کرتا ہے، نصوص کی تلاش کرتا ہے اور اُن نصوص سے اپنے لئے اللہ کا حکم اخذ کرتا ہے۔

**ہر مسلمان پر فرض عین ہے کہ وہ اپنے افعال کے متعلق احکام کی معرفت حاصل کرے:**

ہر مکلف کے متعلق شرع کا حکم یہ ہے کہ ہر بالغ اور عاقل مسلمان پر فرض ہے کہ وہ دین کے ان امور کے بارے میں سمجھ حاصل کرے جو زندگی میں اس کے لئے لازمی ہیں، کیونکہ اسے حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے تمام افعال کو اللہ کے اوامر و نواہی کے مطابق انجام دے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اعمال کے متعلق شرعی احکامات کی پہچان حاصل کر لے۔ اس بنا پر ایک مسلمان کے لئے زندگی گزارنے کے متعلق لازمی احکامات کیا علم حاصل کرنا فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض عین ہے۔ اور اس سے زائد علم حاصل کرنا مستحب ہے چنانچہ اگر وہ عبادت کرے تو اس کا جاننا لازم ہے کہ عبادت کس طرح

انجام دینی ہے، اگر اس کا سرمایہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر ایک سال گزر جائے تو اس پر فرض ہے کہ وہ اُس کی زکوٰۃ ادا کرے چنانچہ اس پر یہ جان لینا لازم ہے کہ اُسے اس کے سرمایہ کی مناسبت سے زکوٰۃ کتنی مقدار میں ادا کرنی ہے۔ اگر اس کی دولت سونے اور چاندی میں ہو تو اُس پر یہ جاننا لازم ہو گا کہ سونے و چاندی کی زکوٰۃ کیسے اور کسے ادا کرنی ہے اور اگر وہ پھلوں اور مویشی پر زکوٰۃ ادا کرنے کے حکم کی معلومات نہ بھی رکھتا ہو تو اس پر کوئی گرفت نہیں ہو گا البتہ اگر وہ ان کے متعلق زکوٰۃ کا حکم جانتا ہو تو اس کے درجات کے بلند ہونے اور اجر کا باعث ہے۔ اگر وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لئے کوشش کرتا ہے تب اس پر لازم ہے کہ وہ ایسی ضروری معلومات حاصل کر لے جو اسلامی ریاست کے قیام کے متعلق ہیں۔ چنانچہ اس کے ذمہ جو بھی فرض عائد ہو گا، تو اس کی مناسبت سے اس کا علم بھی اس پر لازم ہو گا۔

چنانچہ استطاعت رکھنے والا مسلمان جب اس طرز پر فرائض کو انجام دے کہ فرائض کے حکم کی معرفت اسے حاصل ہو تب وہ اپنے ایمان کی دُرنگی اور مکمل اطاعت اور حکم کے کامل التزام کے متعلق مطمئن ہو سکتا ہے۔

اور اگر اس کی نیت خالص اپنے رب کی رضامندی ہو اور اسے راست عمل کی ہدایت ملی ہو تو وہ دیکھے گا کہ اس کا رب کتنا رحیم ہے جو اس کے عمل کو قبول کرتا ہے۔ اور اپنی رحمت سے قیامت کے دن اس کو اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے گا۔

**دوسرا پہلو: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر**

ہم نے کہا کہ اسلام نے ہر ایک معروف اور ہر ایک منکر کی وضاحت کی ہے اور مسلمان پر لازم ہے کہ ہر وہ معروف جو اسکے ذمہ ہے اسے انجام دے اور ہر منکر سے اجتناب کرے۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ ہر اُس معروف کا حکم دے جس پر وہ خود عمل پیرا ہے یا اس سے زیادہ یا کم؟ اسی

طرح یہ سوال کہ جن جن منکرات سے وہ خود اپنے آپ کو بچاتا رہتا ہے کیا وہ دوسروں کو بھی ان تمام سے روکے یا اس سے زیادہ یا اس سے کم؟

اس سے پہلے کہ ہم اس موضوع پر بات کریں ہمیں یہ سمجھ لینا ہو گا کہ شریعت کا ہم سے کیا مطالبہ ہے اور وہ حقیقت حال میں کس حد تک انجام دیا جاتا ہے۔ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم ہو جہاں نہ تو کوئی بھی تصور شرعی مفہیم (تصورات) کے دائرے سے باہر ہو اور نہ ہی اس معاشرہ میں کوئی ایسا عمل انجام پائے جسے شرع تسلیم نہیں کرتی۔ اسی طرح ہر وہ منکر جسے شرع نے ناپسند کیا ہو اس معاشرے میں اسے روکا جائے اور اس کا تعاقب کیا جائے۔ بہ الفاظ دیگر اللہ کا ہر ایک فرمان جو احکام ہو یا عقیدہ، اسے معاشرہ میں قائم کیا جانا ضروری ہے، اور کسی بھی وقوع پذیر یا متوقع منکر (جس کے واقع ہونے کا امکان ہو) کا تعاقب کیا جائے۔ اللہ نے مسلمانوں سے اس ذمہ داری کو انجام دینے کا مطالبہ کیا ہے اور اس عمل کو اعلیٰ ترین عمل قرار دیا ہے اور اس میں اجر عظیم رکھا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" میں فرماتے ہیں: ”انما بعد: تو بے شک دین میں سب سے اعلیٰ و عظیم ستون امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے، یہی وہ مشن ہے جس کی تکمیل کے لئے اللہ نے تمام انبیاء کرام کو بھیجا تھا، اگر اس کی بساط لپیٹ دی جائے اور اسکے متعلق علم و عمل کو نظر انداز کیا جائے تو نبوت کے کام کا سلسلہ رُک جائے گا، دینداری لڑکھڑائے گی اور بے دینی کا دور دورہ ہو گا، مگر ابھی پھیلنے لگے جہالت عام ہو گی، فساد و بد عنوانی اپنی انتہا کو پہنچ جائے گی، دراڑیں وسعت اختیار کریں گی اور ممالک تباہ و برباد اور لوگ ہلاک ہونگے۔“

## اقامتِ دین کا کام کس کے سپرد ہے:

اس موضوع پر تفصیلی گفتگو میں جانے سے پہلے ہمیں یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہئے کہ وہ کون ہیں جنہیں شرعی احکام کو نافذ کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی ہے۔ یہ اس لئے کیونکہ امت میں افراد، حکام اور جماعتیں ہیں۔ شرع نے ان میں سے ہر کو بعض احکام کے حوالے سے ذمہ داری دی ہے جن کی پابندی ان پر لازم ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اُن کو نصیحت، اُن کا احتساب کیا جاتا ہے، اُن کی اصلاح اُن پر عائد کی گئی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی کی مناسبت سے کی جاتی ہے۔ لہذا اگر ہمارے لئے اس معاملے کا امر واقع غیر واضح ہو گا تو نتیجتاً ہمارے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دینا نہایت ہی دشوار ہو جائے گا، چنانچہ اس امر کی وضاحت کے لئے ہم مندرجہ ذیل نکات بیان کرتے ہیں:

یقیناً شرعی احکامات کا ایک مخصوص حصہ خلیفہ یا امیر سے متعلق ہے جن پر امیر کے علاوہ کسی کو بھی عمل درآمد کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا ہے، اسی طرح شرعی احکامات کا کچھ حصہ افراد کے ذمہ لگایا گیا ہے، اور اگر افراد ان کی ادائیگی میں کوتاہی برتتے ہیں تو خلیفہ انہیں انجام دیتا ہے، ان کے علاوہ کچھ احکام ایسے ہیں جو شرع نے خلیفہ کے ذمہ کیے ہیں لیکن مخصوص حالات میں افراد کے لئے اس کو انجام دینے کی اجازت ہوتی ہے اور کچھ احکامات ایسے ہیں جو شرع نے جماعت یا گروہ کے ذمہ مقرر کئے ہوئے ہیں۔

جہاں تک افراد پر عائد احکامات کا تعلق ہے تو ان میں عبادات، روزہ، حج، زکوٰۃ اور منکرات سے اجتناب مثلاً شراب وغیرہ، جو بازی، سود، چوری، قتل، زنا، فحاشی، جھوٹ، دھوکہ بازی، غیبت اور اسی قسم کے تمام منکرات سے گریز وغیرہ ایسے احکامات شامل ہیں۔ یہ ایسے احکامات ہیں جن کا مطالبہ ہر

مسلمان سے کیا گیا ہے، چاہے وہ دارالکفر میں ہوں یا دارالاسلام میں رہتے ہوں اور چاہے وہ اسلامی ممالک میں رہتے ہوں یا کفریہ ممالک میں مقیم ہوں۔ ان جیسے احکامات میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ رسول ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے صرف مکہ مکرمہ میں یا صرف مدینہ منورہ میں کون سا فعل انجام دیا تھا۔ تو عبادات، معاملات، مطبوعات، ملبوسات، اخلاق اور تمام اسلامی عقائد جیسے شرعی احکامات کا مطالبہ افراد سے کیا گیا ہے۔ ہر ایک فرد اپنے خاندان کے ان افراد کا ذمہ دار ہے، جن کا وہ سرپرست ہے۔ کوئی مسلمان اگر دارالکفر میں رہتا ہے اور وہاں کی اتھارٹی اُسے ان انفرادی شرعی احکامات کو انجام دینے سے روکتی ہو تو اس پر اس جگہ سے کسی دوسری جگہ ہجرت اختیار کرنا لازم ہو گا جو یا تو دارالاسلام ہو یا دارالکفر جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا﴾ (النساء: 97-98) ”جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور اسی حالت میں فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئے تو بولے ”تم کس حالت میں تھے؟“ وہ کہنے لگے کہ ”ہم تو زمین میں بے بس بنائے گئے تھے۔“ فرشتوں نے کہا ”کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟“ لہذا ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ نہایت برا انجام ہے، البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے (اس انجام سے مستثنیٰ ہیں) جو (ہجرت کی) کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور نہ (نکلنے کا) کوئی راستہ پاتے ہیں۔“

بلکہ ایک مسلمان کے لئے مستحب یہ ہے کہ وہ دارالکفر سے دارالاسلام کی جانب ہجرت کرے چاہے دارالکفر میں اسے ان شرعی احکامات پر عمل کی اجازت ملی ہوئی ہو۔ البتہ اگر وہ اُس دارالکفر کو جہاں وہ رہتا ہے، دارالاسلام میں تبدیل کرنا چاہتا ہو تو اس صورت میں وہاں رہ سکتا ہے۔ یہ امر ذہن نشین رہے کہ

دارالاسلام وہ جگہ ہے جس کی حکومت اسلامی ہو اور اس کی امان (تحفظ) مسلمانوں کی اپنی طاقت اور اپنے اختیار کے بل بوتے پر ہو۔

جہاں تک افراد کے سپرد کئے گئے ان شرعی احکامات کا تعلق ہے جنہیں افراد کی طرف سے ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں خلیفہ انجام دے سکتا ہے تو جیسے افراد کو نان و نفقہ فراہم کرنا، بشرطیکہ وہ اپنے زیر کفالت لوگوں کی پرورش سے بے بس ہو جائیں، یا افراد کے ذاتی کاموں کی دیکھ بھال کرنا، جبکہ وہ نہ کر سکتے ہوں، یا جیسے دیہات اور بستیوں میں مسجدوں کی تعمیر کروانا، جبکہ بستی کے مکین اسکی تعمیر سے بے بس ہوں۔

جہاں تک خلیفہ کے سپرد ان شرعی احکامات کا تعلق ہے جو صرف خلیفہ ہی انجام دے سکتا ہے اور خلیفہ کے علاوہ کسی کو انہیں انجام دینے کی اجازت نہیں تو یہ جیسے حدود کا نفاذ، اعلان جنگ، صلح کے معاہدات کرنا، جبری قوانین کا اجراء، یا جبری کاموں کی دیکھ بھال۔ ان تمام معاملات اور ان جیسے دیگر امور کی انجام دہی کی ذمہ داری شرع نے صرف خلیفہ کے ساتھ محدود کر رکھی ہے۔

وہ شرعی احکامات جو خلیفہ کے سپرد ہوتے ہیں، لیکن مخصوص حالات کے تحت افراد بھی انہیں انجام دے سکتے ہیں جیسے جہاد۔ تو جہاد خلیفہ کے فرائض میں سے ہے، البتہ اگر دشمن مسلمانوں پر اچانک حملہ کر دیں تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ قتال کریں چاہے خلیفہ انہیں قتال کا حکم یا اجازت نہ دے یا مسلمانوں کا خلیفہ موجود نہ ہو اور ایسا واقعہ رونما ہو چکا ہو جس کی خاطر جہاد واجب ہو چکا ہو۔ ایسی صورت میں افراد اس جہاد کو انجام دیں گے چاہے ان کا حاکم فاجر ہی کیوں نہ ہو یا امیر کے ماتحت افراد کی تعداد جہاد کے لئے کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ مگر اصل یہ ہے کہ مسلمان مؤخر الذکر حالت پر راضی نہ ہوں یعنی ان کا خلیفہ کے بغیر رہنا اور فاسق و فاجر حکمرانوں کی ماتحتی پر راضی اور مطمئن ہو جانا۔



جہاں تک ان شرعی احکامات کا تعلق ہے جو گروہ یا جماعت کے سپرد ہیں، تو یہ جیسے خلافت کے قیام کا عمل یا حکمرانوں کا احتساب کرنا اور انہیں مجبور کرنا کہ وہ حق کو اختیار کریں۔ حزب (پارٹی)، گروہ، تنظیم، بلاک یا کوئی بھی اسلامی جمعیت کا دائرہ کاریہ اعمال ہیں۔

یقیناً یہ وضاحت نہایت اہم ہے کہ شرعی احکامات کی انجام دہی کس کے سپرد کی گئی ہے؟ کیونکہ احکامات کی مناسبت (امروا قعہ) سے لاعلمی یا تجاہل کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر ایسے افراد اور تحریکیں جنم لیتی ہیں جو شرع کے نفاذ میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی جہالت سے مسلمان شرعی احکام کو باریک بینی سے سمجھنے کی قابلیت کھو بیٹھتے ہیں اور نتیجتاً درست طور پر اسلام کی تنفیذ نہ کر پائیں گے۔ یوں ایک مسلمان اپنے ذمہ عائد فرائض شناخت واضح نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ بیٹھے گا اور ان فرائض کو داؤ پر لگا کر مستحبات کی ادائیگی میں لگ جائے گا، چونکہ افراد ہی جماعت کا حصہ ہوتے ہیں لہذا جماعتیں یا گروپ بھی ان شرعی احکامات کی طرف متوجہ ہونگے اور مطالعہ کرنے لگیں گے جو احکام افراد کے ذمہ عائد ہوتے ہیں اور پھر جماعتوں سے متعلق ان شرعی احکامات کو نظر انداز کر دیں گے جو اس کے ممبران پر بحیثیت گروپ یا جماعت کے عائد ہوتے ہیں یا ایک جماعت ریاستی امور اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے اور یہ تب ہوتا ہے جب اس تقسیم کار کی سمجھ بوجھ موجود نہ ہو جسے شرع نے ملحوظ رکھا ہے اور جن کی رعایت کرنا ہم پر بھی فرض ہے۔ ایسے میں ایک عالم دین بھی جب لوگوں کے درمیان وعظ کرے گا تو کچھ فرض عین احکام کو تو بڑی شدت کے ساتھ بیان کرے گا مثلاً عبادات، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ اور ان کے علاوہ دیگر احکامات کو بیان کرنا چھوڑ دے گا مثلاً مسلمانوں کی زندگی سے متعلق تجارت یا لین دین کے احکام، غیبت کے احکام، حتیٰ کہ فرض کفایہ جو اجتماعی فرائض ہیں انہیں بھی وہ نظر انداز کر دیتا ہے جس میں اہم ترین فرض اسلامی ریاست کا قیام ہے۔ چنانچہ وہ ایک عابد وزاہد اور واعظ کے روپ میں رونما ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے ایک ایسے سیاستدان عالم دین کے طور پر سامنے نہیں آتا

جسے اُمت کے مسائل کی فکر ہو اور ان کے حل کی فکر بھی رکھتا ہو، جو امت کے سامنے ان کے مسائل کے حل کا ایک مکمل خاکہ لے کر جائے۔

ان تمام طبقوں کے ذمہ جو بھی مختلف احکامات متعین ہیں انہیں ان پر پابندی کرنا لازمی ہے، اور ان کے ذمہ جو کام سپرد ہیں، ان کی ادائیگی میں کوتاہی کی صورت میں ان کو معروف کا حکم دیا جائے اور منکر سے روکا جائے، لیکن ان کا احتساب کسی ایسے امر پر نہیں کیا جائے گا، جو ان کی ذمہ داری نہیں ہے، اس طرح شرع کے نفاذ کی ذمہ داری کسی ایک طبقے کی نگرانی میں محدود نہیں کر دی گئی ہے بلکہ شرع کے نفاذ کی ذمہ داری کے لئے شرع نے مختلف ذمہ دار نگران مقرر کئے ہیں جہاں ہر ایک اپنی ذمہ داری کو انجام دیتا ہے اور اس طرح تمام امت مل کر شریعت کا مکمل نفاذ کرتی ہے۔ تو جب مسلمان افراد کی حیثیت سے اپنی شرعی ذمہ داری انجام دیتے ہیں، گروپ اور جماعت کی حیثیت میں اپنی ذمہ داری انجام دیتے ہیں اور مسلمان خلیفہ خود پر عائد ذمہ داریاں انجام دیتا ہے تو امت کے ذریعے اس طرح دین اسلام کا مکمل نفاذ عمل میں آئے گا۔

ہمیں اس حقیقت کی جانب توجہ کرنی ہوگی کہ مسلمانوں کو کامل طور پر اسلام پر ایمانی ایمان رکھنا ضروری ہے، مگر وہ پیش کی گئی تفصیل کے مطابق تبی کرے گا جو اس کے لئے ضروری ہے اور جو بحیثیت فرد یا کسی جمعیت اور پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے اس سے مطلوب ہے، اس فعل کی انجام دہی کے معاملہ میں کسی بھی کوتاہی کا اسے اللہ کی جناب میں حساب دینا ہو گا۔

اسی طرح خلیفہ اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں جو ابدہ ہے، چنانچہ بحیثیت فرد خلیفہ بھی عبادت کرتا ہے، روزہ رکھتا ہے، حج کو انجام دیتا ہے، ساتھ ہی اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے، زنا اور سود خوری سے اجتناب کرتا ہے۔ ان انفرادی اعمال کے ساتھ خلیفہ اپنی وہ ذمہ داریاں بھی

انجام دیتا ہے جو شرع نے بحیثیت خلیفہ اس پر عائد کر رکھی ہیں۔ چنانچہ وہ قوانین کا اجراء کرتا ہے، جہاد کا اعلان کرتا ہے، اور مسلمانوں کی اراضی کی حفاظت کرتا ہے، اللہ کے نازل کردہ کے مطابق حکومت کرتا ہے اور حدود اللہ کو نافذ کرتا ہے۔ اور اس معاملہ میں کوتاہی کرنے پر اللہ آخرت میں اس کا حساب لے گا، اور امت اس دنیا میں اس کے متعلق خلیفہ کا محاسبہ کرے گی۔

یہ صورت حال مسلمانوں کے سامنے بالکل واضح ہونی چاہیے تاکہ افراد یا فرد کا احتساب ان سے غیر متعلق ذمہ داریوں پر نہیں ہوگا اور اسی طرح جماعت یا گروپ سے لا تعلق ذمہ داریوں کے لئے جماعت کا احتساب نہیں کیا جائے گا اسی طرح خلیفہ کا احتساب ان فرائض کے لئے نہیں ہوگا جن کے لئے وہ ذمہ دار نہیں بنایا گیا ہے۔

شرع نے تمام مسلمانوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی انجام دہی کا ذمہ دار بنایا ہے، ہر فرد اپنے علم و استطاعت کے مطابق ذمہ دار ہے۔ شرع نے مسلمانوں کے ذریعے اس فریضہ کے قیام کو یقینی بنانے کا حکم دیا ہے، خواہ افراد ہوں یا گروپ اور حکمران کی حیثیت میں ہوں اور اسے ہر حال میں فرض قرار دیا ہے، چاہے اسلامی ریاست موجود ہو یا نہ ہو۔ اور چاہے مسلمانوں پر نافذ نظام حکومت کفریہ ہو یا اسلامی، حکمران ان پر اسلامی قوانین کا صحیح نفاذ کرے یا ان کے نفاذ میں غلطی کرے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا عمل رسول ﷺ کے دور میں انجام دیا جاتا تھا دور صحابہ میں بھی یہ عمل نہایت مضبوط انداز میں موجود تھا، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی یہ عمل برقرار و قائم تھا اور یہ ایسا حکم ہے جو روز قیامت تک برقرار رہے گا۔

جب بھی افراد اور جماعتوں اور حکمران کی جانب سے کوئی منکر فعل انجام دیا جائے جس کی وجہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہوتا ہو تو افراد، جماعتوں، اسلامی ریاست پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اس کے متعلق مندرجہ ذیل تفصیل کو دھیان میں رکھ کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر انجام دیں۔

بحیثیت افراد مسلمانوں پر لازم ہے کہ جب ان کے سامنے کوئی ایسا واقعہ رونما ہو جو امر یا نہی کا تقاضا کرتا ہو چنانچہ ان سے مطالبہ یہ ہے کہ اس معروف کا امر کریں جس پر وہ ذاتی طور پر عمل پیرا ہوں اور اس منکر فعل سے روکیں جس سے وہ ذاتی طور پر اجتناب کرتے ہوں، اور یہ مطالبہ ان کے پاس موجود علم کے بقدر ہو گا۔ نتیجتاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس کے لئے ایک فرض عین کے حکم میں ہو جاتا ہے کہ جس پر جلد از جلد عمل نہ کرنے پر ایک مسلمان گنہگار ہو گا اور اس کو انجام نہ دینے پر اس کا کوئی عذر بھی عند اللہ مقبول نہیں ہو گا۔ تو اپنی روزمرہ زندگی میں جن لوگوں کے ساتھ مسلمان کا تعلق ہوتا ہے، یعنی اپنی بیوی، اولاد، رشتہ دار، پڑوسی، گاہک، جان پہچان کے لوگ یا ملاقاتی وغیرہ، ان میں سے ہر ایک پر یہ لازم ہے کہ اگر وہ اعمال کی ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے یا گناہوں میں مبتلا ہو رہا ہے تو اس کو نصیحت کرے اور اسے روکے۔ یہ اس لئے کہ کچھ گناہ ایسے ہیں جن پر اس کے سوا دوسروں کو اطلاع ہی حاصل نہیں ہوتی۔ مثلاً اس کے روبرو کوئی گناہ انجام دیا جا رہا ہو اور اس مجلس میں گناہ کرنے والے اور اسکے علاوہ کوئی اور موجود نہ ہو۔ اس صورت حال میں اگر وہ مسلمان اس شخص کو نصیحت نہ کرے تو وہ بھی گناہگار ہو گا، البتہ معاشرہ کے دوسرے افراد گناہگار نہ ہونگے کیونکہ منکر کھل کر ان کے سامنے واقع نہیں ہوا اور انہیں اس گناہ کی اطلاع بھی نہیں ہے۔ اس موقع پر کوئی اور شخص اُس کی جگہ لینے کے لئے موجود ہے نہ ہی اس دائرہ کے اندر کوئی دوسرا فرد آکر اس کی تلافی کر سکتا ہے۔ تو اس کے اپنے دائرے میں وقوع پذیر ہونے والے کسی بھی منکر کی مسؤلیت اسی کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے اس حوالے سے اس کے علاوہ کسی اور کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جائے گا۔

توجہ مسلمان خود اپنی ذات میں ہر اُس عمل کی پابندی کرتا ہے جسکے متعلق اللہ نے حکم دیا ہے یعنی وہ اپنی ذات سے متعلق ہر معروف کی پابندی کرے، ہر منکر سے اجتناب کرے، تو اس مسلمان کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ وہ اپنے متعلق عائد حکم پر عمل کر کے دوسرے مسلمانوں کو منتقل کرے۔ اب اگر اس نے احکامات علم اور دلیل سے اخذ کئے ہیں تو وہ دوسروں تک اُس عمل کو علم اور دلیل کے ذریعے منتقل کرے گا۔ اگر وہ شیعہ ہو کر احکامات پر عمل کر رہا ہو تو اسی درجے میں دوسروں کو منتقل کرے گا، اگر اس نے اس عمل کو عامی کی طرح تقلید کے ذریعے قبول کیا ہو تب اس شخص کے ذریعے معاشرہ میں عمل کی یہ منتقلی مقلد عامی ہی کے درجے کی ہو گی۔ اس صورت میں اگر وہ دوسروں کو اپنی دعوت پر قائل کرنے کی قدرت نہیں پاتا اور اسے محسوس ہو کہ اس کے اندر اپنی بات باور کروانے کی صلاحیت موجود نہیں ہے تو اس کے لئے جائز ہو گا کہ وہ ان کو قائل کرنے کے لئے کسی ایسے شخص کے حوالے کر دے جو یہ صلاحیت رکھتا ہو مثلاً کسی مفتی، عالم یا شباب میں سے کوئی ایسا داعی جس کی فکر اور فہم پر اسے اعتماد ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ﴾ {التوبہ: 71} ”مومن مرد اور مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں۔ ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔“ مزید فرمایا: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ {5:2} ”نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں آپس میں تعاون کیا کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں آپس میں تعاون نہ کیا کرو۔“

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((بلغوا عني و لو اية)) ”میری طرف سے پہنچاؤ،

خواہ ایک آیت ہی ہو۔“ (رواہ بخاری)

اسکے علاوہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((نضر اللہ عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها و أداها، فرب حامل فقه غير فقيه، و رب حامل فقه إلى من هو أفقه منه)) ”اللہ اس بندے کو تروتازہ رکھے جس نے میری بات سنی، پھر اُسے اچھی طرح یاد (محفوظ) رکھے، پھر لوگوں تک پہنچائے، کیونکہ ایسا ممکن ہے کہ کسی کے پاس فقه (علم) موجود ہو اور وہ فقیہ نہ ہو۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اس فقه (علم) کو کسی ایسے شخص کے پاس لے جائے جو اس سے زیادہ فقیہ ہو۔“ (رواہ الترمذی)

اس طرح ایک فرد نے وہ کچھ انجام دیا جو ایک فرد کی حیثیت سے ذاتی طور پر معروف کی پابندی اور منکر سے اجتناب کرنے کی ذمہ داری اس پر عائد تھی اور ساتھ ہی معروف کا حکم کرنے اور منکر سے روکنے کی ذمہ داری کو انجام دیا جس کا اس سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

## علم کی اہمیت:

معروف اور منکر سے متعلق افکار کے حوالے سے علم اور علماء کا بہت بڑا کردار ہے، علماء نے اپنے اپنے زمانے میں ان افکار کو بیان کیا اور عوام کو ترغیب دلائی کہ وہ معروف کو انجام دیں اور منکر سے گریز کر لیں۔

علماء دراصل وہ لوگ ہیں جنہوں نے وہ علم بھی حاصل کیا جس کی ضرورت دوسروں کو ہوتی ہے، انہوں نے دونوں کام کئے فرض عین کو بھی حاصل کیا یعنی جس علم کا تعلق خود ان کے ساتھ ہے جو امت کے دیگر افراد کی طرح ان پر ذاتی حیثیت سے فرض ہے اور فرض کفایہ علم بھی حاصل کیا جس کا حصول اجتماعی فرض یعنی امت کی ذمہ داریوں میں سے ہے، مگر امت کی جگہ انہوں نے ہی وہ علم حاصل

کر کے گویا امت کی طرف سے یہ ذمہ داری سنبھال لی تو اس پر ان کو عظیم اجر ملے گا۔ علم کے اس بلند رتبہ کے باوجود علماء دیگر فرائض میں سے کسی فرض کی ادائیگی سے مستثنیٰ نہیں ہیں بلکہ جو فرائض افراد امت پر عائد ہیں ان کی ذمہ داری کا حکم بحیثیت فرد علماء پر بھی عائد ہے۔ اور اس حوالے سے ایک عالم اور غیر عالم یکساں ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں سے ہی ایک ذمہ داری خلافت کے قیام کے لیے کوشش ہے۔ کچھ علماء علم میراث کے ماہر ہوتے ہیں، کوئی عالم قرآن کریم کی تفسیر کا ماہر ہے اور کوئی عالم شرعی قاضی ہے جو نکاح و طلاق وغیرہ کے مسائل بتلاتا ہے، تو یہ سب اور ان جیسے دیگر علماء اپنے انفرادی فرائض کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ نہیں ہیں اور ایسے کفائی فرائض سے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں جن کا تعلق پوری امت سے ہے۔ چونکہ علماء بھی امت کے افراد ہیں لہذا جو ذمہ داری افراد تک کی ہوگی وہی ذمہ داری علماء کی بھی ہے۔ آج کل مشاہدہ میں جو یہ بات سامنے آرہی ہے کہ علماء مختلف قسم کے تخیلاتی اور بھونڈے دلائل دے کر اس اہم فریضے سے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں یہ عذر لنگ کے سوا کچھ نہیں ہیں، اور یہ دلائل شرعاً ہرگز مقبول نہیں ہیں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ ان کا محاسبہ ضرور کرے گا اور امت کو بھی چاہیے کہ وہ لوگوں کے درمیان ایسے علماء کا محاسبہ کرے۔

پس علم کا مقصد اطاعت اور عبادت ہے، علم وہ ہے جو تقویٰ پیدا کرے اور تقویٰ خوف خدا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (فاطر: 28)  
 ”یقیناً اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔“

اس ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق ایسے مجاہد علماء پیدا ہوتے ہیں جو ہمیشہ صف اول میں دیکھے گئے، خواہ نماز میں ہو یا جہاد میں، خواہ دعوت کا موقع ہو یا حکمرانوں کو نصیحت کا یا کفر والحاد کے افکار

و مفاہیم کے مقابلے کا۔ تم انہیں ہم ہمیشہ صف اول میں دیکھتے ہیں جو لوگوں کو صحیح علم اور عمل کی تعلیم دیں اور راہ حق میں ان کی راہنمائی کرتے نظر آتے ہیں۔

لہذا کوئی یہ گمان نہ کرے کہ اسلام میں علماء کا منصب کسی دفتر شاہی عہدہ دار کے عہدہ کا ہے، یا پروہتوں کی طرح اسلام میں ان کا کوئی مذہبی رتبہ ہے یا ان کی کوئی منفرد پہچان ہے۔ نہ ہی یہ سمجھنا چاہیے کہ علماء تو اپنے علم کی بناء پر صرف لوگوں کو حکم کریں گے جبکہ اُن کے احکامات کو عملی جامہ پہنانا باقی لوگوں کا کام ہے، بلکہ جس طرح ایک امت کے عام فرد پر فرض ہے کہ وہ ان شرعی احکامات پر عمل کرے بالکل اسی طرح علماء پر بھی فرض ہے کہ وہ شرعی احکامات پر عمل کریں، اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کے مخاطب یہ بھی ہیں جس طرح کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کبھی مخاطب ہو کر تے تھے۔

شرع نے حق کی معرفت اور اس کے قیام کے لیے علم اور علماء کی موجودگی کو فرض قرار دیا ہے، علماء حق کو سمجھنے کا ذریعہ ہیں، ایک مسلمان اُن کے ذریعے اپنے رب کے حقوق کو پہچانتا ہے۔ علماء کی موجودگی یا امت میں انہیں پیدا کرنا فرض کفایہ ہے، اگر علماء موجود نہیں ہوں گے تو پوری امت گنہگار ہو جائے گی، کیونکہ امت پھر اللہ تعالیٰ کے احکامات کو اپنے زمانے کے لحاظ سے سمجھ نہیں پائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اجتہاد فرض کفایہ ہے اور یہ فرض ہے کہ امت کے اندر مجتہدین کے وجود سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہونا چاہئے، تو ان کی موجودگی ہر وقت ہونی چاہئے ورنہ پوری امت گناہوں کا شکار ہو جائیگی۔

چونکہ لوگ طبعی طور پر علماء کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ان سے علم حاصل کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں جو علماء کے لئے ایک آزمائش بنتی ہے چنانچہ ایک عالم کو اپنے علم کے بارے میں کسی فتنے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، کہ کوئی خاص منصب یا بدلے کا طلب گار بن جائے اور بغیر علم کے (بغیر دلائل) لوگوں کی خواہشات کے مطابق فتویٰ دینا شروع کر دے یا حکمران کو خوش کرنے کے لیے



شرع کے حقائق کو چھپائے۔ شرعی علم ایک معروف ہے جبکہ اس کے متعلق ریاکاری، حب جاہ اور اس کا اجر طلب کرنا یہ تمام منکرات ہیں، یہی وجہ ہے کہ حکمران علماء سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ علماء ان کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں خصوصاً موجودہ زمانے میں حکمرانوں کے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال ہونا، ان کا ایجنٹ بننا جس کی وجہ سے حکمران ان پر بے دریغ دولت صرف کرتے ہیں اور لوگوں کے سامنے ان کو بڑے معزز اور جلیل القدر علماء کے طور پر پیش کرتے ہیں اور ان کی عوام میں مقبولیت کے لیے بڑا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ علماء لوگوں کے لئے مرجع اور مفتی بن جاتے ہیں اور لوگ بڑے بڑے مسائل میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پھر یہ علماء ایسے فتوے صادر کرتے ہیں جن سے حکمران خوش ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتا ہے۔ یہ علماء نصوص کو حکمرانوں کی خواہشات کے تابع کر دیتے ہیں اور انہی کی مرضی کے مطابق شرع کی تشریح کرتے ہیں۔ غور کریں جب حکمرانوں نے سود کو جائز قرار دیا تو انہوں نے بھی اس کو حلال قرار دیا، انہوں نے اس کے حق میں دلائل پیش کرنے کے لیے نصوص کو توڑ مروڑ کر من گھڑت طور پر پیش کیا۔ حکمرانوں نے جب کفار ممالک سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تو انہی علماء نے اس کی موافقت کی اور اتفاق کیا اور جب حکمرانوں نے یہود کے ساتھ صلح کرنا چاہا تو ان علماء نے اس کی زبردست حمایت کی اور غاصب یہودیوں کے ساتھ امن کو فریضہ قرار دیا۔ یہ علماء ایجنٹ ہیں یہ علماء بُھو ہیں، جن کو نصیحت کرنا فرض ہے۔ امت پر فرض ہے کہ وہ علماء کے ان کاموں پر نظر رکھیں اور ان کے ایسے افعال کے خلاف سخت رویہ اپنائیں اور ان سے بے رخی اختیار کریں اور شرع کو داؤ پر لگا کر ان کو اپنا مقتداء نہ بنائیں۔ حکمرانوں کے سامنے تعاون کا ہاتھ پھیلا کر شرع کی تذلیل کرنے والے ان علماء پر رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد صادق آتا ہے: ((إِنْ أَخَوْفَ مَا أَخَافَ عَلَى أُمَّتِي كُلِّ مَنَافِقٍ عَلِيمٍ اللِّسَانُ)) ”میں اپنی امت کے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ ڈر محسوس کرتا ہوں وہ منافق چرب زبان علماء ہیں“۔ (رواہ احمد بن حنبل)

ان جیسے علماء کی خوب تشہیر ہونی چاہیے اور ان کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنا چاہیے تاکہ لوگ ان کے فتاویٰ کے جال میں نہ پھنس جائیں، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو اختیار کیا نہ معلوم کس چیز نے جہنم کے بارے میں ان کو اس قدر لاپرواہ کر دیا۔

جی ہاں جب مسلمان اٹھیں اور معروف پر عمل اور اس کا امر شروع کریں گے اور منکر سے اجتناب کر کے دوسروں کو بھی اس سے روکیں گے تو ان کی انفرادی زندگی میں دین کا مسئلہ حل ہو جائے گا اگر مسلمان اپنے گھر میں اسکا پابند ہو گا اور دوسروں کو بھی پابند کرے گا، اپنی تجارت اور دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات میں بھی اس پر کاربند ہو گا تو اس کے دین کا ایک اہم حصہ درست ہو جائے گا۔ مگر جیسا کہ ہم نے کہا کہ دین کا مقصد اللہ کی اطاعت ہے، اس لیے پورے کا پورا معاشرہ معروف پر عمل کرنے والا اور منکر سے اجتناب کرنے والا ہونا چاہیے، اس معاشرہ کی خاصیت اور پہچان امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے ہوتی ہو، معاشرہ کا کوئی بھی جزو یا کوئی بھی پہلو اللہ کے حکم کے خلاف نہیں ہونا چاہیے، خواہ یہ پہلو انفرادی زندگی کا ہو یا اجتماعی زندگی کا، کیونکہ معاشرہ صرف افراد کا مجموعہ نہیں، بلکہ معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہوتا ہے جن کو ایسے عقیدہ نے اکٹھا کیا ہو جس میں سے زندگی کے تمام امور کے لئے نظام نکلتا ہے۔ پس اگر معاشرے کی زندگی کا صرف انفرادی پہلو درست ہو گیا ہو تو اس کا ایک ہی پہلو درست ہو گیا جبکہ اس کے ابھی کئی اور پہلو بھی ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہونا فرض ہے۔ معاشرہ کے انہی افراد کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اپنے اوپر ایک ایسا خلیفہ مقرر کریں جو ان کی زندگیوں میں اسلام نافذ کرے، اور جو چیز مسلمانوں کے اندر صرف تقویٰ کے ذریعے وجود میں نہیں آئے گی وہ معروفات و بھلائی خلیفہ کی تلوار کے زور پر معاشرہ میں پیدا کی جائیگی۔ "إِنَّ اللَّهَ لِيَنْزِعَ بِالْإِسْلَامِ مَا لَا يَنْزِعُ بِالْقُرْآنِ" بلاشبہ جو قرآن کے ذریعے نہیں رکتا اس کو اللہ سلطان (خلیفہ) کے ذریعے منع کر دے گا۔" شرع نے اس عقیدہ کو نافذ کرنے، عقیدہ کی حفاظت کرنے

اور اس عقیدہ کو تمام لوگوں تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور اسلامی ریاست کو اس کی دعوت کے لیے میکانزم اور طریقہ قرار دیا ہے۔ شرع نے اس نظام کی وضاحت کی ہے اور اس نظام کی تنفیذ کی کیفیت کو بھی بیان کیا، یہ ذمہ داری اسلامی ریاست کے کاندھوں پر ڈال دی گئی ہے اور وہی اس کی نگرانی کرے گی۔ چنانچہ جہاد جسے اسلام کا کہان کہا گیا ہے، شرع نے اس کو انجام دینے کا ذمہ دار ریاست کو قرار دیا ہے، لہذا ریاست دعوت کو پھیلانے کے طریقہ کے طور پر جہاد کو اپناتی ہے۔ امام غزالیؒ نے کیا خوب فرمایا: ”قرآن اور سلطان دو جڑواں بھائی کی طرح ہیں قرآن اگر عمارت کی ایک بنیاد ہے تو سلطان اس کا محافظ ہے جس (عمارت) کی بنیاد نہیں ہوگی وہ با آسانی گرائی جاسکے گی اور جس کا کوئی محافظ نہیں ہوگا تو وہ کھوجائے گی اور ضائع ہو جائے گی۔“

### حکمران کا محاسبہ:

شرع جس کو اللہ نے نازل کیا اور واضح بیان کیا ہے، اس کو ایسا نہیں چھوڑا کہ یہ صرف واضح افکار کی صورت میں پڑی رہے، بلکہ اس کو ایک مجسم عملی شکل دی۔ لہذا ایسے عملی احکامات نازل فرمائے جو اس کے عملی وجود کے تحفظ کو یقینی بنانے کے متعلق ہیں اور ان چیزوں سے روکتے ہیں جو شرع کے لئے رکاوٹ بنتی ہوں، اس مقصد کے لیے ایک طریقہ وضع فرمایا جو کہ ریاست اسلامی ہے۔ چنانچہ خالق کائنات نے شرع کی حفاظت کے پیش نظر اس ریاست کے قیام کا حکم دیا، اور اللہ تعالیٰ نے حکمران کے متعلق احکامات بیان فرمائے، اسے بھی معروف کا حکم دیا اور منکر سے منع فرمایا، اس سے یہ مطالبہ کیا کہ دین کو قائم کرے اور اس کی نگہبانی کرے، اسی طرح اُمت کو حکم دیا کہ اس مقصد کے راستے میں حکمران کی اطاعت کریں اور حاکم کے ذمہ عائد کئے گئے احکامات کی عدم ادائیگی یا ان سے غفلت کی

صورت میں حاکم کا محاسبہ کریں، اللہ ذوالجلال کا یہ مطالبہ امت کے افراد اور احزاب (جماعتوں) دونوں سے ہے چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ((سید الشهداء حمزہ بن عبد المطلب و رجلٌ قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله)) (رواہ الحاکم) ”شہداء کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص بھی جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہو کر اس کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، پھر اس کے نتیجے میں حکمران اس کو قتل کرے۔“

مزید فرمایا: ((أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر)) - (رواہ ابن ماجہ والنسائی) ”جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لتأمرن بالمعروف و لتنهون عن المنکر و لتأخذن على يد الظالم و لتأطرنه على الحق أطراً و لتقصرنه على الحق قصراً)) (رواہ ابو داؤد و الترمذی) ”تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو، اور ظالم کا ہاتھ روکو اور تم ضرور اس کو حق ہی کے چوکھٹے میں رکھا کرو اور حق تک ہی محدود رکھو۔“

اور ظالم حکمران کو کون حق پر کاربند اور حق ہی تک محدود رکھ پائے گا سوائے اس کے جو قوت و طاقت رکھتا ہو یعنی جماعت یا حزب کیونکہ افراد یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔

ماضی میں صحابہؓ اور فقہاءؒ یہ جانتے تھے کہ اسلامی ریاست شرع کے لئے اصل اور بنیادی چیز ہے، جب اسلامی ریاست ہوگی تو احکامات نافذ ہوں گے اور اگر ریاست اسلامی نہ ہوگی تو شرعی احکامات ضائع ہو جائیں گے، یہی وجہ تھی کہ جب ابو بکرؓ سے یہ پوچھا گیا کہ اسلام کیسے قائم و دائم رہ سکے گا؟ تو فرمایا: ”جب تک حکمران سیدھے ہوں گے (یعنی ریاست خالصتاً اسلامی ہو)۔“ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے

فضیل سے نقل کیا ہے وہ عیاض اور احمد بن حنبل سے نقل کرتے ہیں کہ ”اگر ہماری کوئی ایک دعا ایسی ہو جو مقبول ہو تو ہم وہ دعا سلطان (امیر) کے لیے کرتے۔“

اسلام تمام انسانوں کا دین ہے جو تمام بنی نوع انسان کے لیے اپنے دامن میں خیر لیے ہوئے ہے۔ یہ دین کسی قوم کے لئے خاص نہیں کر دیا گیا ہے۔ اس کا عقیدہ عالمی و آفاقی ہے اور اس کا نظام بھی آفاقی و عالمی ہے، پورے عالم میں اس کو پھیلانے کا طریقہ بھی اس دین نے خود متعین کیا ہے یہ طریقہ ایک ایسی اسلامی ریاست کا وجود ہے، جو دین کو نافذ کرے گی اور پورے عالم تک دین کو پھیلانے گی، نتیجتاً اسلامی ریاست سب سے اہم معروف ہے جس کا وجود لازمی ہے تاکہ یہ اس پر عائد فریضہ کو ادا کرے۔

اب ریاست کی اپنی ذمہ داریاں کون سی ہیں؟ اگر یہ ریاست موجود نہیں ہوگی تو وہ کون لوگ ہیں جو اس کو قائم کریں؟ اگر ریاست ہی راہ حق سے بھٹکنے لگے تو اس کی کجی کی کون مرمت کرے گا؟

اللہ نے ریاست پر جو ذمہ داری ڈالی ہے، وہ پورے کے پورے دین کو نافذ کرنا ہے۔ ریاست ہی زندگی کے تمام امور میں دین کی تطبیق کی ذمہ دار ہے، خواہ انفرادی نوعیت کے فرائض ہوں یا اجتماعی نوعیت کے ہوں، فرائض عین ہوں یا کفایہ فرائض ہوں ان تمام کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے ریاست ذمہ دار ہے چنانچہ ریاست ہی دین کے قیام یعنی معروف کے قیام اور منکر کو عملی طور پر ختم کرنے کی ذمہ دار ہے۔ لہذا اگر ریاست میں کوئی مسلمان نماز نہ ادا کرتا ہو تو ریاست اس کو ادائیگی کا حکم دے گی اور تعمیل نہ کرنے کی صورت میں اس کو سزا دے گی۔ اسی طرح اگر وہ زکوٰۃ نہ دے، حج نہ کرے یا روزہ نہ رکھے تو مسلمان سے ان جیسے تمام عینی فرائض کی پابندی بھی ریاست ہی کروائے گی اور اس میں کوئی تاہی کرنے والوں کا محاسبہ کرے گی اور ان معروفات کو معاشرہ میں تحفظ عطا کرے گی اس طرح ان کی

زندگیوں میں دین کو قائم رکھے گی اور یہی کیفیت کفائی فرائض کی بھی ہے۔ تو اگر امت کے ان تمام مفادات کی جو اس کی ضرورت ہیں ضمانت نہ دی جائے جیسے طب اور انجینئرنگ اور تعلیم وغیرہ جن کو حاصل کرنے کے لئے حکمت عملی، نظم و ضبط اور متعلقہ ذمہ داریوں کی تقسیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح جن فرائض کی ذمہ داری امت پر تقسیم کی جاتی ہے، جیسے جہاد اور اجتہاد کا وجود تو ان سبھی امور کو شرع نے خلیفہ کے ذمہ عائد کئے ہیں اور اسے ان کے قیام کا امر دیا ہے۔ خلیفہ ان امور میں کسی قسم کی کوتاہی کا مظاہرہ کرے تو اس کا محاسبہ کرنا امت پر فرض ہے اور امت خلیفہ پر دباؤ ڈال کر اس کی تلافی کرے گی۔ شارع نے اس کے بارے میں نہایت دقیق (باریک) احکامات بیان فرمائے ہیں، چنانچہ اللہ نے مسلمانوں پر حرام قرار دیا ہے کہ حاکم کے خلاف خروج (بغاوت) کریں سوائے اس کے کہ وہ کفر بواح (کھلم کھلا) کا اظہار کرے۔

اسلامی ریاست میں بنیادی طور پر حکمران کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کے مطابق لوگوں کے معاملات کی نگرانی کرے، حاکم ہی شرعی طور پر منکرات کو روکنے کا ذمہ دار ہے، خواہ یہ منکرات افراد سے سرزد ہوں یا جماعتوں سے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((الإمام راع وهو مسؤول عن رعيته))۔ (متفق علیہ) ”امام نگہبان ہے اور وہ اپنی رعایا کے بارے میں مسؤول ہے۔“

امام کے ذمہ جو کام سپرد کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ افراد اور جماعتوں کو ان تمام فرائض کا پابند بنائے جو اللہ کی طرف سے ان پر لازم کئے گئے ہیں۔ اگر کسی معروف کو قائم کرنے کے لئے طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑے تو اس پر لازم ہے کہ وہ طاقت کا استعمال کرے۔ اسی طرح منکرات کو روکنے کے لیے بھی طاقت کے استعمال کی ضرورت پڑے تو طاقت کا استعمال اس پر فرض ہے۔ ریاست کا اصل

کام منکرات کو مٹانے یعنی ان کو ہاتھ اور قوت سے روکنا ہے، کیونکہ شرعاً وہی اسلام کو نافذ کرنے اور احکامات کی ادائیگی کو لوگوں پر لازم کرنے کے بارے میں مسؤل ہے۔

لیکن اگر حکمران خود منکر کا ارتکاب کرے، ظلم کرے یا باطل طریقے سے لوگوں کا مال ہڑپ کرے یا کسی کی حق تلفی کرے یا رعایا کی پرورش میں کسی قسم کی سستی کرے یا اپنے فرائض کو انجام نہ دے، اسلام کے کسی قانون سے اختلاف کرے یا کسی اور منکر کا ارتکاب کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ سب کے سب ایسے حاکم کے محاسبے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں اور حاکم کے اس عمل پر ناراضگی کا اظہار اور اس کا انکار کریں اور انفرادی اور جماعتی طور پر کوشش کریں تاکہ وہ اپنے اس عمل کو تبدیل کرے اگر اس صورت میں مسلمان خاموش رہیں یا منکر کو ختم نہ کریں تو سب کے سب مسلمان گنہگار ہوں گے۔

کس منکر کے ارتکاب پر حکمران کا انکار و احتساب زبانی محاسبہ کی شکل میں کیا جائے گا۔ کیونکہ مسلم نے ام سلمہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ستكون أمراء فتعرفون وتنكرون، فمن عرف برئ، و من أنكر سلم، و لكن من رضي وتابع)) ”عنقریب ایسے امراء ہوں گے (جن کے خلاف شریعت اعمال) کو تم پہچان لو گے اور (بعض اعمال) نہ پہچان سکو گے پس جس نے اس کے اعمال بد کو پہچان لیا وہ بری ہوا جو نہ پہچان سکا وہ محفوظ رہا لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور تابعداری کی (وہ نہ بری ہوا نہ محفوظ رہا)“

اس طرح ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((... كلا والله لتأمرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر، و لتأخذن على يد الظالم و لتأطرنه على الحق أطراً و لتقصرنه على الحق قصراً)) ”سنو! اللہ کی قسم تم ضرور

بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تم ظالم کا ہاتھ روکو، اس کو حق پر کار بند رکھو اور حق تک ہی اس کو محدود رکھو۔“

ایک اور روایت میں ہے کہ: ((أَوْ لِيُضْرِبَ اللَّهُ قُلُوبَ بَعْضِكُمْ عَلَى بَعْضٍ أَوْ لِيَلْعَنَكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ))۔ (رواہ ابوداؤد) ”سنو! اللہ کی قسم تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو تم ظالم کا ہاتھ روکو، اس کو حق پر کار بند کرو اور حق تک ہی اس کو محدود رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب میں ایک دوسرے کے لیے نفرت بھر دے گا اور سابقہ لوگوں کی طرح تم پر بھی لعنت کریگا۔“

اس طرح رسول اللہ ﷺ نے جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے کو افضل ترین جہاد قرار دیا جب کسی سائل نے عرض کیا کہ کونسا جہاد افضل ہے؟ فرمایا: ((أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ))۔ (رواہ ابن ماجہ والنسائی) ”جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنا افضل ترین جہاد ہے۔“

یہ ذہن میں رہے کہ حاکم کے خلاف مسلح بغاوت صرف اس وقت جائز ہے جب حکمران کھلم کھلا کفر کا ارتکاب کرے اور اس کفر کی شرعی دلیل موجود ہو اور وہ ایک واضح کفر ہو جس میں کوئی شبہ موجود نہ ہو۔ یا یہ حکمران اللہ کے نازل کردہ اسلامی احکامات چھوڑ کر کھلم کھلا واضح کفر کے احکامات کو اپنی حکومت میں اختیار کرے۔ عوف بن مالک الاشجعیؒ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: ((خِيَارُ أُمَّتِكُمُ الَّذِينَ تَحِبُّونَهُمْ وَيَحِبُّونَكُمْ وَيَصْلُونَ عَلَيْكُمْ وَتَصْلُونَ عَلَيْهِمْ وَشَرَارُ أُمَّتِكُمُ الَّذِينَ تَبْغُضُونَهُمْ وَيَبْغُضُونَكُمْ وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ قِيلَ يَا رَسُولَ اللَّهِ أَفَلَا نُنَابِذُهُم بِالسِّيفِ فَقَالَ لَا مَا أَقَامُوا فَيْكُمُ الصَّلَاةُ))۔ (مسلم) ”تمہارے اچھے حکمران وہ ہوں گے جن سے تم محبت کرو اور وہ تم



سے محبت کریں تم ان کے لیے دعائیں کرو اور وہ تمہیں دعائیں دیں اور تمہارے برے حکمران وہ ہیں جن سے تم بغض رکھتے ہو اور وہ تم سے بغض رکھتے ہوں تم ان پر لعنت بھیجتے ہو اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہیں۔ کہا کہ اے رسول اللہ ﷺ کیا اس حال میں ہم ان کو تلوار سے نکال باہر نہ کریں، فرمایا: نہیں جب تک وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔“

یہاں نماز کو قائم کرنے کا مطلب اسلام کا قیام یعنی شریعت کا نفاذ ہے، پس یہاں جزو کہہ کر کل مراد لی گئی ہے (من باب تسمية الكل باسم الجزء)۔ ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ستكون أمراء فتعرفون و تنكرون، فمن عرف برىء، و من أنكر سلم، و لكن من رضي و تابع، قالوا: أفلا نقاتلهم؟ قال: لا ما صلوا))۔ ”عنقریب تمہارے حکمران ہونگے (جن کے خلاف شریعت اعمال) کو تم پہچان لو گے اور (بعض اعمال) نہ پہچان سکو گے پس جس نے اس کے اعمال بد کو پہچان لیا وہ بری ہوا جو نہ پہچان سکا وہ محفوظ رہا لیکن جو ان امور پر خوش ہوا اور تابع داری کی (وہ نہ بری ہوا نہ محفوظ رہا)“ عرض کیا ہم ان سے قتال نہ کریں؟ فرمایا: نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں۔“ یعنی جب تک وہ شرعی احکامات کی ادائیگی کرتے رہیں جن میں نماز بھی ایک اہم جز ہے یہاں بھی جز کہہ کر کل مراد ہے۔

عبادہ بن الصامتؓ سے روایت ہے کہ: ((بایعنا رسول اللہ ﷺ علی السمع و الطاعة في العسر و اليسر، و المنشط و المكروه و علی أثرة علينا، و علی أن لا ننازع الأمر أهله قال: إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله تعالى فيه برهان، و علی أن نقول الحق أينما كنا لا نخاف في الله لومة لائم))۔ (مسلم) ”ہم نے تنگی اور کشادگی، پسند اور ناپسند کی حالت میں اور ہم پر کسی اور کو ترجیح دینے کی صورت میں بہر حال سننے اور اطاعت کرنے پر رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی، اس بات پر بھی کہ ہم اولوالامر سے نزاع نہیں کریں گے فرمایا: ہاں صرف اس صورت میں کہ جب تم (ان حکمرانوں

کی طرف سے) ایسا کفر بواح دیکھو جس کی اللہ کی طرف سے تمہارے پاس دلیل موجود ہو، اس بات پر بھی بیعت کی کہ ہم جہاں بھی ہونگے حق بات کہیں گے اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔“

ان احادیث سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حکمران کے خلاف مسلح بغاوت اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ شرع کے مطابق حکومت کر رہا ہے یعنی یہ صرف اس وقت جائز ہے کہ وہ کھلم کھلا کفریہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے لگے، جن احکامات کے کفر ہونے کی ایسی دلیل موجود ہو کہ اس میں کسی قسم کا شک باقی نہ رہے۔

ذرا سوچئے کہ یہ تمام بغاوت اس وقت ہیں جب ایک مسلمان حکمران موجود ہو اور وہ اپنی ذمہ داری میں غفلت برتے یا اگر ایسے حالات ہو جائیں کہ وہ کفر بواح (کھلم کھلا کفر) کے ذریعے حکومت کرنے لگے خواہ ایک حکم ہی ایسا دیدے، تو پھر امت پر فرض ہے کہ انفرادی اور جماعتی طور پر اس حکمران کے سامنے کھڑے ہوں اور اس کو روکیں خواہ اس کے لیے اسلحے کے استعمال کی ضرورت پڑے۔ یہاں اس سوال کے متعلق سوچئے کہ اگر سرے سے شرعی حکمران ہی موجود نہ ہو اور دارالسلام ہی موجود نہ ہو تو کیا ہوگا؟ لازمی بات ہے کہ حکمران سے متعلقہ جتنے بھی احکامات ہیں معطل ہو جائیں گے، فساد عام ہو جائے گا، برائی عام ہوگی، بد اخلاقی کا دور دورہ ہوگا۔ لوگوں کے تعلقات فاسد قسم کے ہوں گے منکر عام ہوگا، معروف ناپائیدار اور تحلیل ہو رہا ہوگا، مسلمان کمزور ہوں گے ان کی ہیبت کم ہوگی اور ان کی عزت و وقار ختم ہو جائے گا۔ وہ بغیر دانتوں اور بغیر پنچوں والے شیر کی طرح ہونگے، یا ایک تصویر کی مثل جس کی کوئی حقیقت نہ ہو، کھاتے ہوئے شخص کی تصویر نہ تو بھوک مٹا سکتی ہے اور نہ ہی شیر کی تصویر سے کوئی ڈرتا ہے۔

ان جیسے حالات میں جیسا کہ آج ہمارا حال ہے، امت کو چاہئے کہ ایک ایسے خلیفہ کا تقرر کریں جو اللہ کے احکامات کے مطابق حکومت کرے کیونکہ امت میں ایسے خلیفہ کی موجودگی امت پر فرض ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کون اس خلیفہ کو وجود میں لائے گا اور یہ کس طرح انجام دیا جائے گا؟ یہ وہ مقام ہے جہاں ہم اسلامی جماعتوں کی موجودگی کی فرضیت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سلسلے میں ان کے کام کے بارے میں بحث کریں گے۔

## دعوت کی حامل جماعت کا وجوب

جماعت سے شرعاً مطلوب عمل کا تعین ہونے کے بعد جماعتوں سے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعین خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں ان جماعتوں کے بارے میں گفتگو نہیں کر رہے ہیں جو جزوی شرعی احکام کی اقامت کے لئے کام کرتی ہیں جیسے فقراء اور مساکین کے ساتھ تعاون کے لئے قائم کی گئی فلاحی تنظیمیں یا وعظ وارشاد کی جمعیتیں یا تعمیر مساجد اور تعلیم القرآن دلانے والی تنظیمیں وغیرہ۔ بلکہ ہماری بحث کا موضوع ان جماعتوں کی موجودگی ہے جو پورے دین کو قائم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے ہوئی ہیں، دین خلافت کے قیام کے ذریعے قائم ہوتا ہے جس کا کردار مسلمانوں کی زندگیوں میں مکمل اسلام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے، چنانچہ خلافت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ معاشرہ میں ان تمام بھلائیوں کو وجود دے جن کا شرع نے حکم دیا ہے اور ایسے تمام منکرات کو ختم کرے جن سے شرع نے منع کیا ہے، لہذا وہ انسانوں کی زندگیوں میں اپنا کردار ادا کرتی ہے یعنی اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد لوگوں کی زندگیوں میں اسلام کو مکمل طور پر نافذ کرنا اور خارجی طور پر اسلام کو ایک بھلائی کی دعوت کے طور پر پوری دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔

شرع نے اسلامی ریاست کے ذمے کئی عظیم ترین فرائض مقرر کئے ہیں جو ریاست کی موجودگی میں ادا ہوتے ہیں اور ریاست کی عدم موجودگی میں یہ فرائض ادا نہیں ہوتے، چنانچہ ایسی جماعت جو اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے لئے کام کرنا چاہتی ہے، ظاہر ہے کہ اپنے اس اہم ترین مقصد کی وجہ سے اس کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ خود اسلامی ریاست کے قیام کی ہے۔ فی زمانہ اسلامی ریاست

کے قیام کے ذریعے اسلامی زندگی کی واپسی کے لیے کام کرنے والی کوئی جماعت موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں نے ان تمام فرائض کے قیام میں سستی برتی ہے جنہیں اللہ نے اسلامی ریاست کے سپرد کیا ہے اور جو بہت زیادہ ہیں نتیجتاً اس فریضہ کو انجام نہ دینے کا گناہ بھی کتنا بڑا ہے۔

اب وہ مسلمان جو اسلامی زندگی کی واپسی کے لیے کام نہیں کرتے ہیں وہ ایک زانی کے کہیں بھی زنا کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوتے ہیں، کسی چور کا چوری کی واردات کرنے سے اس کا گناہ ان کے سر چڑھتا ہے، کسی حاکم کے ظلم کرنے سے وہ گناہ میں مبتلا ہوتے ہیں، جب عورتیں نیم برہنہ ہو کر سڑکوں پر نکلتی ہیں، فساد برپا ہونے کی وجہ سے، جہاد نہ ہونے کی وجہ سے، کفار کے مسلمانوں پر مسلط ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے بھی کہ منکر مزید پھیل رہا ہے اور معروف ڈانواں ڈول ہوتا جا رہا ہے ان کے نتیجہ میں وہ مسلسل اپنے گناہ کا بوجھ بڑھا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ فتنہ اس وجہ سے پھیلتا جا رہا ہے کہ مسلمانوں نے اس فرض کی ادائیگی سے رُخ موڑا جس کو اللہ نے ان پر فرض کیا تھا، وہ فرض خلافتِ راشدہ کے قیام کے لیے کام تھا جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے، اور یہ خلافت ہی ہے جو تمام معاملات کو ان کے درست مقام پر لاتی ہے اور مسلمانوں کی زندگیوں میں شرع کو قائم کرتی ہے اور ایمان کو ان کے دلوں میں بوتی ہے پھر تقویٰ اور احسان کی صورت میں وہ اس کا ثمر حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ اجتماعی کام وہ شرعی فریضہ ہے جس پر بگڑے ہوئے حالات کی تبدیلی اور اس کی درستی کا دار و مدار ہے۔ اسی فریضہ کی بدولت امت خود کو پستی کے اس گڑھے سے نکال پائے گی جس میں وہ گر چکی ہے اور اس کے ذریعے امت اپنی کھوئی ہوئی عظمت و طاقت اور شان و شوکت دوبارہ حاصل کرے گی اور ایک ہدایت یافتہ اور رہنما امت بن کر قوموں کی سردار بنے گی (جیسا کہ وہ ماضی میں تھی)۔

آج ایک مسلمان اس سے بڑا اجر کیسے حاصل کر سکتا ہے جو اس عظیم اجتماعی کام کے بدلے میں اُسے ملتا ہے؟ جس کے انجام دینے کے نتیجہ میں امت ان اتر حالات سے نجات پا کر محفوظ ہو جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **((لأن يهدي الله بك رجلاً خير لك من أن تكون لك حُمُر النعم))** ”یقیناً اگر تیرے ذریعہ ایک شخص کو ہدایت ملے یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔“

اس سے بڑھ کر اجر کا عمل کیا ہو گا کہ امت کے تمام مسلمانوں کو اس دگرگوں حالات سے نکالنے اور تباہی سے بچانے اور آخرت میں ان کی نجات کے لئے کوشش کی جائے اور اپنے اس عمل کے ذریعے لوگوں کے لیے فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے کی راہ ہموار کی جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے جب پوچھا گیا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کے برابر کونسا عمل ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: **((لا أجده. قال: هل تستطيع إذا خرج المجاهد أن تدخل مسجدك فتقوم ولا تفتر وتصوم ولا تفطر))**۔ (بخاری) ”نہیں، میں ایسا کوئی عمل نہیں پاتا جو اس کے برابر بھی ہو، پھر آپ ﷺ نے پوچھنے والے سے سوال کیا، کیا تم (اس دوران) جب مجاہد جہاد کے لیے نکلیں، اپنی مسجد میں جا کر ایسا قیام کر سکتے ہو جس میں کوئی وقفہ نہ ہو؟ اور کیا تم ایسا روزہ رکھ سکتے ہو جس میں افطار نہ ہو؟ اس شخص نے عرض کیا کہ ایسا کون کر سکتا ہے؟“ دیکھیے اللہ کے نزدیک جہاد کا کتنا بڑا مرتبہ ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد بھی فرمایا: **((أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر))**۔ ”جابر حکمران کے سامنے حق بات کہنا افضل ترین جہاد ہے۔“

مزید فرمایا: ((سید الشهداء حمزة بن عبد المطلب ورجل قام إلى إمام جائر فأمره ونهاه فقتله))۔ (الحاکم) ”شہداء کے سردار حمزہؓ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جو جابر حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے اور وہ حکمران اس کو قتل کر ڈالے۔“

کیا مسلمان کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود ان کو ہلاک ہونے کے لئے چھوڑ دے اور انہیں بچانے کی کوئی کوشش نہ کرے؟ کیا پھر ایسا مسلمان مسلمانوں کے جسم کا حصہ ہے؟ جیسا کہ ارشاد نبی کریم ﷺ ہے: ((مثل الجسد إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر و الحمى))۔ (مسلم) ”مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں اگر اس کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو پورا جسم بے خوابی اور بخار کا شکار ہو جاتا ہے۔“

تو کیا ایسا مسلمان دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ایک عمارت کا حصہ بنے گا جس کا ایک حصہ دوسرے کو سہارا دیتا ہے؟۔ جیسا کہ فرمایا: کالبنیان یشد بعضہ بعضا۔ (مسلم) ”مسلمان آپس میں ایک عمارت کی طرح ہیں جس کا ایک حصہ دوسرے کو سہارا دیتا ہے۔“

پس اس کام کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے یا تو اجر عظیم ہے یا انجام نہ دینے کی صورت میں گناہ عظیم اور اسلام میں یہ فرض بھی دوسرے دیگر فرائض کی طرح ہے جس کے کرنے والے کو اجر اور چھوڑنے والے کو سزا ملے گی۔

ہم ایک بار پھر یاد دہانی کراتے ہیں کہ یہاں ایسے اجتماعی عمل کی طرف دعوت کی بات نہیں ہو رہی جس سے اسلام کے ایک یا دو اجزاء کو قائم کیا جائے۔ بلکہ ہماری مراد وہ جماعتی عمل ہے جس کا مقصد پورے دین اسلام کا قیام ہو جو کہ صرف خلافت کے قیام کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

### مطلوبہ جماعت کی صفات:

جی ہاں ایسی جماعت یا جماعتوں کو وجود میں لانا شرعاً فرض ہے جو خلافت کے قیام کے ذریعے دوبارہ اسلامی زندگی کی واپسی کے لیے کام کریں۔ اس حکم پر دلالت مندرجہ ذیل آیت کریمہ کرتی ہے:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔“ (آل عمران: 104)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر بطور ایک فرض کفائی (اجتماعی فرض) قرار دیا ہے کہ ان میں کم از کم ایک جماعت ایسی ضرور موجود ہو جس کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ کیونکہ ”وَلْتَكُنْ“ (ضرور موجود ہو) کے اندر طلب جازم ہے، جو کہ وجوب کے لئے ہے، چنانچہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب ہے۔ اور ”مِنْكُمْ“ ”تم میں سے“۔

اسے (تبعیض) کا مفہوم نکلتا ہے یعنی بعض افراد اس ذمہ داری کو انجام دیں، اس تبعیض کے معنی پر ایک شرعی قرینہ موجود ہے، وہ یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک فرض کفائی عمل ہے اور سب لوگ یہ نہیں کر سکتے کہ وہ اس فریضہ کی ادائیگی سرانجام دیں، کیونکہ اس کے لیے علم، واقفیت اور حکمت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر کسی میں موجود نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے لفظ ”امۃ“ کا مطلب



یہاں مسلمانوں میں سے ایک گروہ ہے نہ کہ تمام مسلمان امت۔ تو اس آیت میں امر کا تعلق مسلمانوں میں سے ایک جماعت کی موجودگی ہے، قرآن میں ”امۃ“ کا لفظ ”لوگوں کی ایک جماعت“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰؑ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ﴾ (القصص: 23) ”اور جب (موسیٰ علیہ السلام) مدین کے کنویں پر پہنچے تو دیکھا کہ اُس پر لوگوں کا ایک مجمع ہے جو (اپنے جانوروں کو) پانی پلا رہے ہیں۔“

چنانچہ اوپر بیان ہوئی آیت میں جماعت سے مراد کوئی عام جماعت نہیں بلکہ مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت ہے جس کی ذمہ داری بھی اس آیت کریمہ میں بیان کر دی گئی ہے یعنی اس کا کام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور خیر کی طرف دعوت کرنا ہے۔ آیت کے بیان میں حکمران شامل ہیں کیونکہ حقیقی معنوں میں حاکم ہی ہر معروف اور ہر منکر کے وجود کے لئے بنیادی وجہ ہوتے ہیں اور اپنی قوت سے وہ چاہیں تو معروف پھیلائیں یا اسی قوت سے وہ منکر پھیلا سکتے ہیں۔ مسلم حکمران یا تو اپنی رعایا کے معاملات کی نگرانی اسلام اور شرعی احکامات کے مطابق کرے گا یا وہ ایسا نہ کر کے اسلامی احکامات میں کوتاہی کا مرتکب ہوگا، جس پر اس کا محاسبہ کرنا یعنی حاکم کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جانا فرض ہے۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ یہ جماعت سیاسی ہوگی کیونکہ اس کے کام کا تعلق حکمرانوں سے ہے۔ اگر حکمران موجود ہی نہیں ہو تو اس جماعت کا کام شرع کی طرف سے مقرر کردہ طریقے سے شرعی حکمران کو مقرر کرنا ہے اور اگر شرعی حکمران موجود ہیں لیکن حق سے کنارہ کشی اختیار کر رہے ہیں تو جماعت کا کام اس کوتاہی پر ان کا محاسبہ کرنا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے حکمرانوں کے ساتھ اس فریضے کا تعلق اور اس کی اہمیت کو یوں بیان فرمایا: ((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَتَأْمُرَنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابَ مَنْ عِنْدَهُ، ثُمَّ لَتَدْعَنَّهُ فَلَا يَسْتَجِيبُ لَكُمْ))۔ (احمد و الترمذی) ”اس ذات کی قسم جس کے

قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور بالضرور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو گے ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی جانب سے ایک عذاب بھیج دے، پھر تم دعائیں مانگو گے لیکن اللہ تمہاری دعائیں قبول نہیں کرے گا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((سید الشهداء حمزة بن عبد المطلب ورجل قام إلى إمام جائر فأمره و نهاه فقتله))۔ (الحاکم) ”شہداء کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص جو جابر حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر اسے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرے اور وہ حکمران اس کو قتل کر ڈالے۔“

اور فرمایا: ((مروا بالمعروف وانها عن المنكر قبل أن تدعوا فلا يستجاب لكم))۔ (ابن ماجہ) ”امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو اس سے قبل کہ تم دعائیں مانگو لیکن تمہاری دعائیں قبول نہ کی جائیں۔“

مزید فرمایا: ((الدين النصيحة)) ، قلنا لمن؟ قال: ((لله عز وجل و لرسوله ولأئمة المسلمين و عامتهم))۔ (مسلم) ”دین خیر خواہی ہے۔“ ہم نے کہا کس کی؟ فرمایا: ”اللہ عزوجل، رسول اللہ، مسلمانوں کے اماموں اور عام مسلمانوں کی۔“

یہی وجہ ہے کہ اس جماعت کا کام خیر کی طرف دعوت دینے کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس عظیم ذمہ داری کا ایک حصہ حکمران کا محاسبہ کرنا یا شرع کے مطابق ایسے حاکم کو وجود میں لانا ہے چنانچہ یہ ایک سیاسی کام ہے کیونکہ اس کا تعلق حکام سے ہے۔ لہذا اچھلی آیت ایسی سیاسی احزاب یا جماعتوں کی موجودگی کو فرض قرار دیتی ہے جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں۔

یہ حقیقت ہے کہ دین میں ایسے بے شمار احکامات موجود ہیں جو خلیفہ کے وجود سے جڑے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے خلیفہ کی موجودگی اور خلیفہ کو وجود میں لانے کے لیے خلافت کے قیام کی خاطر کام کرنا شرعاً فرض ہو جاتا ہے، اس فرض کے نتیجہ میں ایسی جماعت کی موجودگی بھی فرض ہو جاتی ہے جو اس شرعی فرض کو ادا کرنے کے لیے کام کرے۔ یہ تمام اس شرعی قاعدہ کی بناء پر ہے: **مالایتم الواجب الا به فہوبہ واجب**۔ ”جس کے بغیر فرض ادا نہیں ہو سکتا تو وہ بھی فرض ہے۔“

اوپر بیان کی گئی آیت اصلاً مدنی آیت ہے جو اسلام کی بنیاد پر سیاسی جماعتوں کی موجودگی کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے، آیت میں اس جماعت پر کس نوع کی ذمہ داری ہے اس کو بھی بیان کر دیا ہے جو کہ خیر کی طرف دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ اور یہ اس طرح کہ لفظ ”الخیر“، ”المعروف“ اور ”المنکر“ میں ”ال“ موجود ہے جو لفظ کو معرفہ بناتا ہے اور اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ یہاں جنس عمل مطلوب ہے لہذا اللفظی طور پر اس میں جو عموم پایا جاتا ہے اس عموم میں مطلوبہ عمل کے تمام جزئیات یعنی ہر قسم کی خیر، ہر قسم کے معروف کا امر اور ہر قسم کے منکر سے نہی داخل ہے۔ جہاں تک اس پر عمل اور تنفیذ کا تعلق ہے تو یہ تھوڑا اور زیادہ عمل کے کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب اسی عموم کی بناء پر یہ حکم ان تمام مسلمانوں کو شامل ہے جن کا اس عمل (یعنی دعوت) کے ساتھ تعلق بنے، خواہ وہ افراد ہوں، جماعتیں ہوں یا حکمران۔ حکم کو انجام دینے سے متعلق کم یا زیادہ مقدار کا تعین شرع کرتی ہے اور اس میں اس امر واقع کا بھی دخل ہوتا ہے جس کو ایجاد کرنے کے لئے جماعت اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ تعین ذاتی ذوق کی بناء پر اور بلا سبب یا غیر واضح نہیں ہے بلکہ اسے اس طور پر واضح کیا گیا ہے کہ جب اس میں خلل (بگاڑ) واقع ہو تو اس کی تلافی کے لئے عمل واجب ہوتا ہے۔ اور ایسی جماعتوں کو نصیحت کرنا لازم ہوتا ہے تاکہ وہ اپنی اس کمی کا تدارک کر سکیں۔ چنانچہ یہ معاملہ بھی دوسرے شرعی معاملات کی طرح ہے جس کو عقل، خواہشات، حالات یا مصلحت پر نہیں چھوڑا گیا ہے۔

## اسلام کی بنیاد پر سیاسی جماعت یا جماعتوں کی موجودگی کی فرضیت:

یہ آیت خالصتاً اسلامی سیاسی جماعتوں کی موجودگی کی فرضیت کو ظاہر کرتی ہے کسی دیگر قسم کی جماعت کا ذکر قطعاً نہیں کرتی۔ اس طرح آیت جماعت کی ذمہ داری اور اس کے کام کی نوعیت اور عموم کو بتلاتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ کونسے معروفات ہیں جن کو قائم کرنے کے لئے عمل واجب ہوتا ہے اور کن کن منکرات کے خاتمہ کے لئے کام کرنا واجب ہوتا ہے، اس کا تعین اُس امر واقع کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے جس میں جماعت کام کر رہی ہے، اور اس امر واقع کی سمجھ کی بنا پر ہی اس جماعت پر اس کو تبدیل کرنے کے لئے لازمی شرعی احکام کی تبنی فرض ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ جماعت جو عین اس آیت کی بنیاد پر قائم کی گئی ہو اور جو حکمرانوں (خلیفہ اور حکام) کے محاسبے کے لئے کام کرتی ہو تو اس کا کام اور ثقافتی مواد اس حقیقت کے مطابق ہوگا، جس میں وہ رہ رہی ہے : چنانچہ یہ جماعت حکمران کے کام کی نگرانی کرتی ہے، کسی بھی کوتاہی پر اس کا محاسبہ کرتی ہے تاکہ اس کو حق تک محدود اور کاربند رکھے، امت میں بیداری پیدا کرتی ہے اور حاکم کے ساتھ مل کر اسلام کی دعوت کو ریاست سے باہر تبلیغ کے لیے کام کرتی ہے۔ رہا سوال ایسی جماعت کا جو بیان کی گئی آیت کی بناء پر وجود میں آئی ہو لیکن حقیقت یہ ہو کہ خلیفہ اور خلافت دونوں ہی موجود نہ ہو تو پھر اس جماعت پر یہ فرض ہے کہ ان تمام احکامات کی تبنی (وضع اور اختیار) کرے جو خلیفہ کو وجود میں لانے کی ذمہ داری سے متعلق ہیں۔ چنانچہ جماعت پہلے اپنے مقصد کو متعین کرتی ہے اور پھر اس کے بعد اس کو حاصل کرنے کے راستہ یعنی طریقہ کار کا تعین کرتی ہے اور ان تمام افکار و آراء کا تعین کرتی ہے جو خلافت کے قیام کی ذمہ داریوں کے لئے درکار ہیں۔

لہذا یہ فرض ہے کہ سیاسی جماعت موجود ہو خواہ اسلامی ریاست موجود ہو یا نہ ہو اور اس کا مقصد، اس کا طریقہ کار اور اس کے ثقافتی مواد کا تعلق امر واقع کے ساتھ ہے۔

آج چونکہ ہم ایسی حقیقت میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کا خلیفہ موجود نہیں ہے جو اللہ کے احکامات کے مطابق حکومت کرتا ہے اور مسلمان جس زمین (دار) میں رہتے ہیں وہ دار الکفر ہے، اور جبکہ آج معاشرے کے تعلقات اور نظام اسلامی بنیادوں پر قائم نہیں ہیں نتیجتاً یہ غیر اسلامی معاشرہ ہے۔ لہذا آج لازم ہو جاتا ہے کہ ایسی جماعت موجود ہو جس کا کام دار الکفر کو دار الاسلام میں تبدیل کرنے اور غیر اسلامی معاشرے کو اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنے اور مرکز ہو، یعنی زندگی گزارنے کے اسلامی طریقہ کو دوبارہ زندگیوں میں مطابق قائم کرنے پر متوجہ اور مرکوز ہو، یہ ہے وہ مقصد و غایت جس کو حاصل کرنے کے لئے جماعت یا گروہ پر جدوجہد کرنا ضروری اور لازم ہے۔

### حزب یا سیاسی جماعت بنانے کی کیفیت:

1. اپنے شرعی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ شرعی راستہ کیا ہے جس پر چلنا اس جماعت کے لئے فرض ہو۔؟

2. کون سے احکامات ہیں جن کی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جماعت کو تبنی کرنا واجب ہے؟

3. وہ کیا شرعی اصول و ضوابط ہیں جو ان شرعی احکامات کے ایک بڑے مجموعے کے متعلق جماعت کی سمجھ کو کنٹرول کرتے ہیں (رخ دیتے ہیں) جن کی اساس پر دعوت کرنا اس کے لئے ضروری ہے؟

4. حکم شرعی کے ساتھ اس کا معاملہ کس طرح ہے؟ جماعت کا شرعی حکم معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ کن ذرائع یعنی مصدر سے حکم حاصل کرتی ہے؟ کیا جماعت رائے رکھتی ہے کہ کسی ایک مسئلہ پر اللہ کے ایک سے زائد کئی حکم ہو سکتے ہیں؟ ان شرعی احکامات جن میں اختلاف موجود ہے ان کے متعلق جماعت کی اپنی رائے کیا ہے؟

5. عقل کے متعلق جماعت کیا معاملہ رکھتی ہے اور حکم شرعی کو اخذ کرنے اور عقیدے کو اختیار کرنے میں عقل کا کیا کردار ہے؟

6. حقیقت اور حالات کے بارے میں جماعت کس طرح معاملہ کرتی ہے؟ کیا جماعت حقیقت و حالات کو مصدر التفكير (ماخذ فکر) بناتی ہے؟ یا وہ حقیقت و حالات کو فکر کا موضوع بناتی ہے؟

7. مصلحت کے بارے میں جماعت کیا رائے رکھتی ہے، مصلحت یعنی فائدہ کو شرع نے متعین کر دیا ہے یا انسانی عقل بھی اس کو متعین کر سکتی ہے؟

اس کے بعد جب ایک مرتبہ ہم جماعت کے مقصد، اس کے کام، طریقہ کار اور (انداز فکر) سوچنے کے طریقہ کار کو متعین کر چکیں تو ہم جان جائیں گے کہ جماعت کون سے کام انجام دے اور اس

کی بنیادیں کیا ہیں؟۔ تب ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ اگر جماعت ان قائم کردہ باتوں سے بھٹک جائے تو اس کو کیا نصیحت کی جائیگی اور اگر وہ کج روی اختیار کرے تو ہم اس کو کس طرح درست کریں۔

اس شرعی طریقہ کار کی بحث میں جانے سے قبل جس پر چلنا جماعت پر لازم ہے ہمارے لئے انتہائی ضروری ہو گا کہ ایک اصول کی یاد دہانی کر لیں جس کے متعلق غفلت جائز نہیں، اور وہ اصول یہ ہے کہ شرع نے دنیا و آخرت اور خیر و شر سے متعلق ان تمام چھوٹے یا بڑے امور کے بارے میں بات کر دی ہے جو انسان کے لیے لازمی ہیں اور ان کا حکم بیان کیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں چھوڑی جو انسان کے لیے اہم ہو۔ چنانچہ انسان جب لباس پہنتا ہے، یا لباس اتارتا ہے۔ گھر میں داخل ہوتا ہے یا مسجد میں داخل ہوتا ہے، مسجد سے نکلتا ہے یا کسی اور کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے، شادی کرتا ہے یا نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے یا بات چیت کرتا ہے یا کوئی اور کام کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کام کے کرنے کا طریقہ اور اس کا حکم بیان کر دیا ہے، اگر کوئی ایسا امر ہے جس کا کرنا فرض ہے یا ایسی نہی جس کا پرہیز واجب ہے تو اس کا حکم بیان کیا، یا وہ مندوب جس کا کرنا بہتر ہے، اگر مکروہ ہے تو چھوڑنا پسندیدہ ہے اور اگر مباح ہے تو پھر اس کے اختیار میں ہے چاہے تو کر لے یہ سب واضح کیا ہے۔ یہی انسان کے تمام افعال کے احکامات ہیں جن کے مطابق ایک مسلمان کو پابندی کرنا لازم ہے۔ جو حکم افعال کا ہے وہی حکم اشیاء کا ہے لیکن اشیاء کے حکم میں کچھ تفصیل ہے۔ وہ یہ کہ اصلاً تمام اشیاء مباح یعنی جائز ہیں سوائے ان اشیاء کے جن کو شرعی دلیل سے مستثنیٰ کیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا فعل یا چیز نہیں جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے حکم نہ دے دیا ہو، یہ حکم ان دو قاعدوں پر مبنی ہے:

**الاصول في الافعال التقيد بالحكم الشرعي۔**

”افعال میں اصل حکم شرع کی پابندی ہے۔“

## الاصل في الاشياء الاباحة مالم يرد دليل التحريم۔

”اشياء میں اصل اباحت ہے جب تک حرمت کی کوئی دلیل وارد نہ ہو۔“

### اسلام میں فکر اور طریقہ ہیں:

جب ہم کسی ایسے طریقے کی پیروی کرنا چاہتے ہیں جو اللہ کے احکامات کے مطابق حکومت قائم کرنے کے لئے ہو تو ہمیں لازماً ان شرعی دلائل کی تلاش و جستجو اور چھان بین کرنی ہوگی جو اس طریقے سے متعلق ہیں، تاکہ ایک مسلمان بصیرت کے ساتھ اللہ کی ہدایت اور اللہ کے عطا کردہ نور کے مطابق ہی چلے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (سورہ یوسف : 108) ”(اے پیغمبر) کہہ دو کہ:“ یہ میرا راستہ ہے۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی۔“

یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ”شرع عادتاً مسلمانوں کے لئے ایک چیز کا حکم بیان کر دیتی ہے اور پھر اس کے لئے مناسب طریقہ کار اس کی عقل، اس کے حالات اور مصلحت کے تقاضوں پر چھوڑ دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی ریاست کے قیام کا حکم تو دیا ہے اور اس کے لیے جد جہد کرنے کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے مگر اس کے قیام کا طریقہ کیا ہو گا اس کو مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایسا دعویٰ بالکل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ شرع نے اس معاملہ میں طریقہ کے حکم کو نہیں چھوڑا ہے اور نہ ہی اس میں لوگوں کو کسی قسم کا اختیار دیا ہے۔



ایسا کہنا اس لئے بھی غلط ہے کیونکہ یہ احکام شرعیہ کی فطرت کے بھی خلاف ہے۔ ایسا کوئی بھی شرعی حکم نہیں ہے جو کسی مسئلے کا حل دے اور اس حل کے لئے شرع نے دیگر عملی شرعی احکام نہ بتلائے ہوں جو زندگی میں اس حکم کو عملی جامہ پہنانے کا طریقہ کار بیان کرتے اور اس کی تکمیل کرتے ہیں تاکہ زندگی کے حالات و حقیقت کے ساتھ ان کو انجام دیا جاسکے۔

اگر اسلامی احکامات اور افکار میں ان کو انجام دینے کے عملی طریقے کی کمی ہو تو پھر یہ صرف کتابوں، اذہان اور خیالات کے اندر ایک تصوراتی مثالی نمونہ بن کر پڑے رہ جائیں گے اور جہاں ہر کوئی ان کو صرف علمی و ذہنی عیاشی کے لئے بیان کرتا پھرتا ہے لیکن حقیقی زندگی میں ان کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت میں لوگوں کی مشکلات کا حل بیان فرمایا ہے۔ پس اللہ نے ان کے لیے مختلف نظام نازل فرمائے جو ان کی زندگی کے تمام معاملات کا احاطہ کرتے ہیں۔ یوں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تمام جبلتوں اور جسمانی ضروریات کو اسلامی عقیدے اور اس سے پھوٹنے والے نظاموں کے ذریعے سیراب کرایا۔ اس بنا پر اسلام کا پیغام انتہائی واضح ہے۔ پھر یہ کہ اسلام نے صرف اس پر بس نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیگر شرعی احکام نازل فرمائے جن کا مقصد یہ ہے کہ اس حل کو کارزار حیات میں عملی صورت میں نافذ کیا جائے تاکہ اسلام محض خیالی اور تصوراتی فلسفہ یا صرف وعظ و نصیحت بن کر نہ رہ جائے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ صرف ایک مبلغ نہیں تھے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ لائے ہوئے احکامات کو نافذ اور جاری کرنے والے حکمران بھی تھے اور رسول اللہ ﷺ صرف اس بات کے واضح ہو جانے سے مطمئن نہیں تھے کہ اللہ ہی واحد معبود اور الہ ہے بلکہ اس کی وضاحت کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے اس کو دنیا میں قائم کیا یعنی اسلام کے نظام کو دنیا میں غالب کیا جاری کیا نافذ کیا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دینے کا کام کیا اور پھر مکہ ہی میں صحابہؓ کی جماعت کے ساتھ مل کر اسلامی ریاست کو وجود میں لانے کے لیے کام کیا حتیٰ کہ جب وہ ریاست قائم کی جو اس ایمان کی بنیاد پر کھڑی ہو تو اسلام کے نافذ کرنے اور ہر اس مجرم کو سزا دینے پر کام کیا جو عقیدہ یا نظام کے دائرے سے نکل جاتا۔ آپ ﷺ نے دعوت و جہاد کے ذریعے اسلام کی تبلیغ کا کام بھی کیا۔ اس بنا پر اسلامی ریاست کے قیام کا حکم، اس کو قائم کرنے کا حکم، عقوبات یعنی سزاؤں کے احکامات، جہاد کے احکامات اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے احکامات تمام کے تمام وہ شرعی عملی احکام ہیں جن کو شرع نے عقیدہ اور نظام، ان دونوں کی حفاظت اور ان کو آفاقی اور عالمگیر بنانے کی دعوت اور ان کی نشر و اشاعت سے متعلق مقرر کئے ہیں۔

اگر ایسے احکام شرعیہ کا اسلام میں وجود نہ ہوتا جو ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ عقیدے کی حفاظت اور اس کا نفاذ، عقیدہ اور نظام کی تبلیغ کس طرح کی جائے تو اسلام غیر متحرک اور جامد و ساکن بن کر رہ جاتا اور آج ہم تک پہنچنا نہ ہوتا اور پھیل نہ پاتا، اسلام مذہبِ عیسائیت کی طرح صرف مواعظ اور ارشادات کی گٹھری بن کر رہ جاتا جو صرف اتنا کہنے پر بس کرتا ہے کہ ”زنا مت کرو اور اپنے پڑوسی کی بیوی کی خواہش نہ کر“ لیکن اس بات کو دنیا میں جاری کرنے کا کوئی طریقہ نہیں رکھتا۔ ایسے میں دیگر عملی افکار وہ سب کچھ انجام دیتے جو اسلام انجام نہ دے پاتا خواہ غلط انداز سے ہی کیوں نہ ہو، یعنی ان افکار کے پاس اپنے نفاذ کا اپنا طریقہ ہوتا جو اسلام کو نیست و نابود کر دیتے، یوں اسلام حقیقت سے ہٹ کر دیگر افکار کی طرح تاریخ کے تجزیے میں اچھے افکار کی صورت میں کتابوں کی صفحات کی زینت بن جاتا جیسے افلاطون کی جمہوریت ہے۔

اسلام میں زنا حرام ہے لیکن اس قسم کے حرام تعلقات کو دنیا میں جو چیز روکتی ہے وہ اسلام کا ایک دوسرا شرعی حکم ہے جو زنا کے حکم سے جڑا ہوا ہے یعنی زنا کا ارتکاب کرنے والے مجرم کی شرعی سزا جس کو اسلامی ریاست نافذ کرتی ہے۔ چنانچہ شریعت نے زنا کا حکم یوں بیان فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزَّانَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾ ”تم زنا کے قریب بھی مت جاؤ یہ فحاشی ہے اور برا راستہ ہے۔“ (بنی اسرائیل: 32) اور پھر زنا کا ارتکاب کرنے والے کا حکم یوں بیان فرمایا: ﴿وَالزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةً جَلْدَةً--﴾ ”زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ہر ایک کو سو کوڑے مارو۔“ (النور: 2)

لیکن یہ سزا کس طرح اور کون دے گا؟ شرع نے اس ذمہ داری کے لئے ایک شعبہ مقرر کیا ہے جو دونوں احکامات کو معاشرہ میں برقرار اور نافذ کرے گا چنانچہ اسے رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا: ((إِدْرَأُوا الْحُدُودَ عَنِ الْمُسْلِمِينَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، فَإِنْ وَجَدْتُمْ لِلْمُسْلِمِ مَخْرَجًا فَخَلُّوا سَبِيلَهُ، فَإِنَّ الْإِمَامَ لَأَنْ يَخْطِئَ فِي الْعَفْوِ خَيْرٌ مِنْ أَنْ يَخْطِئَ فِي الْعُقُوبَةِ))۔ ”جہاں تک ہو سکے مسلمانوں سے حدود کو دور کرو، اگر کسی مسلمان کے لئے سزا سے بچنے کا کوئی راستہ نکلتا ہو تو اس کا راستہ چھوڑ دو، کیونکہ امام (خلیفہ) کا غلطی سے معاف کر دینا غلطی سے سزا دینے سے بہتر ہے۔“ (ترمذی، الحاکم) اس طرح شرع نے امام کو اسے انجام دینے کا ذمہ دار مقرر کیا۔

یہی معاملہ نماز کا بھی ہے کہ شرع نے بیان کیا ہے کہ نماز ادا کرنا فرض ہے اور پھر نماز چھوڑنے والے کے لئے سزا کا حکم بھی بیان کر دیا۔ ساتھ ہی اس سزا کو نافذ کرنے کے لئے شعبہ مقرر فرمایا یعنی اسلامی ریاست۔ یوں شرع نے جتنے احکام دیئے ہیں ہر ایک کے لئے دوسرے شرعی حکم

کے ذریعے ان کے نفاذ کا طریقہ بھی بیان کر دیا اور صرف امام ہی کو یہ اختیار دیا کہ وہ ان احکامات کی اکثریت کو نافذ کرے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایک بنیادی عقیدہ ہے جو جڑ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس عقیدے سے کچھ اور فروعی عقائد نکلتے ہیں پھر ان سے کچھ افکار جڑے ہوئے ہیں، ان میں ایسے افکار ہیں جو واضح کرتے ہیں کہ خیر کیا ہے شر کیا ہے، حسن کیا ہے اور قبح کیا ہے، معروف و منکر، اور حلال و حرام کو بیان کرتے ہیں ان افکار میں اسلام کے وہ شرعی احکامات بھی شامل ہیں جو عبادات، معاملات، مطعومات، ملبوسات اور اخلاق کو منظم کرتے ہیں۔ یہ تمام اسلامی معاشرے کے لئے لازمی ہیں بلکہ پورے انسانی معاشرے میں ان کا وجود ضروری ہے۔ معاشرہ میں ان تمام شعبوں کی موجودگی اور ان کے آپسی ملاپ سے دیگر مختلف معاشروں کے مقابلے میں اسلامی معاشرہ کی ایک منفرد اور ممتاز تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جس کی تعمیر کی جانب اسلام دعوت دیتا ہے۔ ان تمام عقائد، افکار، اور احکامات کے مجموعہ کو ”الفکرۃ الاسلامیہ“ یعنی اسلامی فکر کا نام دیا جاسکتا ہے۔

وہ شرعی احکامات جو اسلامی فکر (الفکرۃ الاسلامیہ) کی تکمیل کرتے ہیں جن کا مقصد اس اسلامی فکر کو وجود دینا اور پھر اس کی حفاظت کرنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہے جیسے عقوبات یعنی سزاؤں کے احکامات، جہاد کے احکامات، خلافت سے متعلق احکامات اور دعوت کی کیفیت کے احکامات جو اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ضروری ہیں، اس طرح امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے احکامات وغیرہ۔ اسلام کے دیگر اصل احکامات سے جڑے ہوئے ان احکامات کو ”الطریقہ الاسلامیہ“ یعنی اسلامی طریقہ کا نام دیا جاسکتا ہے۔

## جن لوگوں نے اسلامی طریقے کو نظر انداز کر دیا:

یہ درجہ بندی کہ ”اسلام فکر اور طریقے کا مجموعہ“ ہے کس وجہ سے لازم ہوئی ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ عصر حاضر کے مسلمانوں کی طرف سے بہت سے شرعی احکامات کے نظر انداز کر دیئے جانے کا رجحان دیکھنے میں آیا ہے، اور اسلامی طریقے سے متعلق احکامات کو آج انہوں نے یہ سمجھ کر چھوڑا ہوا ہے کہ یہ آج کل غیر ضروری ہیں۔ لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ان طریقوں پر اس لیے عمل کیا کہ وہ اس وقت اور حالات کے لیے مناسب تھے۔ پس آج اگر یہ احکامات ہمارے حالات اور زمانے سے مناسبت رکھیں گے تو ہم بھی ان کو لے لیں گے ورنہ ان کی جگہ زمانہ حال سے ہم آہنگ دوسرے احکامات لیں گے۔ چنانچہ اسی نظریہ کی بناء پر ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو نظام عقوبات یعنی سزائوں کی تبدیلی کا نعرہ لگاتے ہیں کہ اسلامی سزائیں ہمارے موجودہ زمانے سے اب مناسبت نہیں رکھتیں۔ وہ یوں دیکھتے ہیں کہ کوڑے مارنا اور ہاتھ کاٹنا قابل تسلیم نہیں ہے کیونکہ اہل مغرب کے نزدیک یہ سنگدلانہ احکامات ہیں اور مغرب والے ان کو دیکھ کر کہیں گے کہ یہ قرون وسطیٰ کے وحشیانہ طور طریقوں کی طرح ظلم پر مبنی ہیں، اور مغرب والوں کا اُن کا پرانا دین یاد آئے گا جس میں ان کی مغربی عوام ظالمانہ قوانین کے ظلم کا شکار تھے، چنانچہ اس کی وجہ سے انہیں اسلام سے نفرت ہو جائیگی اور یہ چیز انہیں اسلام سے دور لے جائیگی۔ اس لیے اسلامی سزائوں کی بجائے قید اور جرمانہ عائد کرنے کی سزائیں مقرر کرنے میں کیا حرج ہے۔ چنانچہ اسی نظریہ کی بناء پر ہم بعض ایسے لوگ بھی پاتے ہیں جو جہاد کو ختم کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ درست ہے کہ ایک زمانہ تک جہاد ہی اسلام کی دعوت اور تبلیغ کے لئے ہوا کرتا تھا لیکن اب ”اسلامی جہاد“ کی بجائے نشر و اشاعت اور ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ آج تہذیبوں کے لین دین کا زمانہ ہے اور چونکہ اسلام ہی کے پاس قطعی حجت ہے اور واضح حق ہے چنانچہ قلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے وہ کام لیا جاسکتا ہے جو تلواروں سے نہیں لیا

جاسکتا جس سے لوگوں کے دل تنگ ہو جاتے ہیں اور بدگمانیاں اور نفرتیں جنم دیتا ہے۔ ہم بعض ایسے لوگ بھی پاتے ہیں جو جزیہ کو ختم کرنے کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ یہ اچھا اور مہذب معلوم نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے ہمیں دیگر اقوام کی طرف سے نفرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، بعض لوگ تو یہ بھی کہتے پائے جاتے ہیں کہ حکومت کرنے کے لئے اسلام کی جانب سے ”نظام خلافت“ لازمی حکم نہیں ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے دورِ جدید کے نظام ہائے حکومت کو اختیار کرنے اور خلافت کے قدیم نظام کو ترک کر دینے کی خاطر جواز مہیا کرنے والا فتویٰ دے ڈالا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی بھی طرح اسلامی نظام قائم ہونا چاہیے، حکومت کی کوئی مخصوص ہیئت اور صورت ضروری نہیں ہے، کیونکہ حکومتوں کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔

اس نظریہ کے تحت اسلامی ریاست کس طرح قائم ہوگی اس کے طریقہ کار کے بارے میں بھی بے شمار آراء پیش کی گئیں یہاں تک کہ مسلمان یہ سمجھنے لگے کہ اسلامی کتابیں لکھنے، مساجد بنانے، خیراتی جمعیتیں قائم کرنے، عصری مشنری درس گاہوں کے طرز پر اسلامی مدارس اور اسکول بنانے، لوگوں کو اچھے اخلاق کی طرف دعوت دینے، مسلح جدوجہد کرنے یا جمہوری تماشوں کے ذریعے حکومت میں شامل ہو کر اسلام کو نافذ کرنے کی کوششوں وغیرہ سے اسلام کی واپسی ہو سکتی ہے، یوں انہوں نے اسلام میں حکومت تک پہنچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو چھوڑ دیا۔

آج مسلمان فکر سے متعلق شرعی احکام کو مبہم اور غیر واضح انداز میں لیتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے ذہنوں میں طریقے سے تعلق رکھنے والے لاتعداد اسلامی احکامات غیر واضح ہو چکے ہیں اور اس کم علمی کی وجہ سے انہوں نے طریقے سے متعلق احکامات کو نظر انداز کیا اور پس پشت ڈال دیا ہے، اس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ مسلمان مغربی افکار سے متاثر ہوئے اور اس کے نتیجہ میں وہ اسلام کو واضح

اور قانونی حیثیت میں سمجھنے کے قابل نہ رہے تھے نتیجتاً وہ دنیا میں اسلام کی تطبیق کو سمجھ نہ پائے کہ کس طرح اسے دنیا کے معاملات حل کرنے میں استعمال کریں۔

فکر اور طریقہ پر بحث کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی تاکہ مسلمان ان اہم شرعی احکامات کو نظر انداز نہ کریں جن کو نازل کرنے کا مقصد ان کی بنیاد پر اسلام کو زندگی اور اس کے تمام معاملات اور حالات میں مکمل طور پر نافذ کرنا ہے۔ ان شرعی احکامات کو نظر انداز کر دینے سے اسلامی احکامات کا ایک اہم حصہ معطل ہو گا جو بہت بڑا گناہ ہے جس پر اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کا محاسبہ کریں گے۔

ان مذکورہ اسباب کی بناء پر ہم نے یہ درجہ بندی کی ہے یعنی ”اسلام فکر اور طریقہ ہے“۔ تاکہ یہ موضوع واضح ہو کر سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے آسان ہو جائے۔ وضاحت کی خاطر اس سے قبل بھی مسلمانوں نے اس قسم کی درجہ بندیاں کیں ہیں مثال کے طور پر ”اسلام، عقیدہ اور نظام ہے“ یا ”اجتماعی نظام“، ”اقتصادی نظام“، ”کھانے پینے کے احکامات“، ”لباس کے احکامات“، ”عبادات کے احکامات“ یا ”اخلاق کے احکامات“۔ یہ تمام احکامات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بکھری ہوئی حالت میں تھے فقہاء نے ان کو جمع کر کے، ترتیب دے کر اور کتابوں میں ابواب کی شکل میں تقسیم کیا تاکہ مسلمانوں کے لیے ان کو سمجھنا اور عمل کرنا آسان ہو جائے۔

یہ بحث اس لئے ہے کہ مسلمان یہ نہ سمجھیں کہ وہ قطعی اور ثابت شدہ شرعی احکامات جن پر پابندی درکار ہے ان کو تبدیل کرنا اور ان سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرنا بھی جائز ہے اور اس کی وجہ سے وہ ان احکامات سے دور ہو کر ان سے غافل ہو جائیں اور آخر کار ان کی پابندی ہی ختم کر بیٹھیں، یہ ہے وہ سبب جس کی وجہ سے آج ہمیں اس پر بحث کی ضرورت محسوس ہوئی۔

چنانچہ شرعی سزاؤں (عقوبات) کو اس زمانہ کی ماڈرن سزاؤں سے بدلنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی نظام خلافت کے بدلے جمہوری نظام کو اختیار کرنا جائز ہے، اس کے علاوہ اسلامی قوانین کو چھوڑ کر مغرب کے دیوانی یا شہری قوانین کو اپنانا یا حکومت کے حصول کے لیے رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر کوئی اور عقلی افکار و احکام وضع کرنا قطعاً جائز نہیں خواہ ان کی حمایت میں کتنے ہی فتوؤں کی بوچھاڑ ہو جائے، یہ سب ناجائز ہیں۔

لہذا چونکہ اسلامی ریاست کا قیام کرنا ایک شرعی حکم ہے چنانچہ اس کے قیام کا طریقہ بھی ایک شرعی حکم ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ شرع نے اس کے لیے تفصیلی دلائل کے ساتھ احکامات دیئے ہیں اور ان پر کاربند رہنے کا مطالبہ اور اس کے طریقہ سے کسی بھی قسم کے انحراف سے روکا ہے اس کا حکم بھی ان دیگر شرعی احکامات کی طرح ہے جو طریقہ سے متعلق ہیں۔

فقہ کی کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے کرام نے کتابوں کو مستقل ابواب اور فصلوں میں تقسیم کیا ہوا ہے، عقوبات کے احکامات، جہاد، امارت یعنی سربراہی کے احکامات اور طریقہ سے متعلق دیگر احکامات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ صرف جن احکامات پر انہوں نے بحث نہیں کی وہ اسلامی ریاست کے قیام کا طریقہ ہے اور اس بحث کی انہیں یا اس وقت کے لوگوں کو ضرورت نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ مختلف زمانوں میں مسلمانوں کو کبھی بھی یہ مسئلہ پیش نہیں آیا تھا کیونکہ ایک دن کے لئے بھی ریاست اسلامی غیر موجود نہیں رہی تھی، لہذا انہیں اس کے طریقہ کے مطالعہ کی ضرورت کبھی پیش ہی نہیں آئی چنانچہ ان کے لئے اس موضوع پر بحث کرنا غیر ضروری تھا۔ آج چونکہ اسلامی ریاست موجود نہیں ہے، چنانچہ اب مسلمانوں کی سرگرمیوں کی تمام تر توجہ اس کے قیام کے طریقے کے لئے



احکامات کے استنباط اور ان کی تبنی (اختیار کرنے) پر مرکوز ہونی چاہئے۔ یہ استنباط بھی شرعی دلائل سے کیا جانا لازم ہے نہ کہ حالات و خواہشات سے متاثرہ عقلی اصولوں اور احکامات کو اختیار کیا جائے۔

جب طریقہ شرعی ہو گا تو لازماً اس میں نصوص کی پابندی ظاہر ہونی چاہیے، رسول اللہ ﷺ کی اتباع بھی نظر آنی چاہیے۔ نصوص پر پابندی ہوگی تو محاسبہ و نصیحت کے لئے بنیاد نصوص بنیں گے اور نتیجہ میں محاسبہ اور نصیحت کرنا ممکن ہو سکے گا، امیر کا محاسبہ اور اس کو نصیحت بھی اس طرح کی جائیگی جس طرح جماعت کے رکن کا محاسبہ اور اس کو نصیحت کی جائے گی۔ محاسبہ کے لئے عقل پر انحصار نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی آپسی شخصی تعلقات اس پر اثر انداز ہوں گے اور نہ ہی زندگی کے تجربات کو اس معاملہ میں کوئی دخل ہو گا۔ چنانچہ اس عملی طریقے کو ایک تجربہ خیال کرنا بالکل غلط ہے بلکہ اس میں صرف شرع کی پابندی کی جائے گی۔

چنانچہ جو شخص اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کرتا ہے تو طبعی طور پر اسے اس کا شرعی طریقہ اور اس کے تفصیلی دلائل معلوم کر لینے چاہئیں، پھر وہ اس کے متعلق گفتگو کر سکے گا اور اس کی طرف دعوت دے سکے گا۔ پس وہ کون سے شرعی افعال ہیں جن کی پابندی اسلامی ریاست کے قیام کے کام میں فرض ہے؟

شرعی طریقے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کا باریک بینی اور گہرائی سے علم حاصل کیا جائے تاکہ تمام مسائل کے بنیادی سبب پر انگلی رکھی جاسکے اور جس کو حل کرنے سے اس سے متعلقہ تمام مسائل پائیدار طریقے سے حل کرنا ممکن ہو گا۔ چنانچہ تبدیلی کی یہ شکل ایک بنیادی تبدیلی ہوگی۔ جب حقیقت کی مکمل سمجھ ہو چکے اور بنیادی سبب معلوم کر لیا جائے تب اس شرعی مقصد کا تعین کر سکیں گے جسے حاصل کرنا ہم پر ضروری ہے۔ یعنی لوگوں کو مطلوبہ شرعی

صورتحال میں لے کر جائے۔ اس کے بعد جماعت ان شرعی افعال کو جان جائیگی جن کی پابندی جماعت کے لئے لازم ہے۔ یہ اس وقت ہو گا کہ جب اسلام کے ابتدائی زمانے کو نظروں کے سامنے رکھا جائے جس میں رسول اللہ ﷺ حیات تھے جو کہ ہمارے زمانے کے مشابہہ یا اس زمانہ کی حقیقت سے قریب ہے تاکہ رسول اللہ ﷺ کے افعال سے احکام شرعیہ کو اخذ کیا جاسکے۔

### مغربی فکری جنگ نے طریقے کے احکام کو بگاڑنے میں مدد دی:

ہم دیکھتے ہیں کہ یہ امر واقعہ ہے کہ مسلمانوں کو مغربی کافروں کی جانب سے زبردست فکری جنگ کا سامنا ہوا جس میں بالآخر کفار مسلمانوں کو اسلام کے صحیح اور حقیقی سمجھ سے دور کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان اسلام کی ایسی تاویلات کرنے لگے جو زندگی اور دین کے درمیان علیحدگی کے عقیدے سے نکلنے والے مغرب کے فکری اصول اور قواعد سے ہم آہنگ تھیں۔ ایک مرتبہ جب مسلمانوں میں سوچنے کا ڈھنگ مغربی کفار کی سوچ سے مرعوب ہو کر ان کی راہ پر چلنے لگا تو مسلمانوں میں اس فکری تبدیلی نے مغرب کے لئے اس کی جنگ کا اگلا مرحلہ آسان کر دیا جو اس نے اسلامی نظام زندگی کے خلاف چھیڑی ہوئی تھی یہ دوسرا مرحلہ مسلمانوں کی زندگی سے اسلام کو نکالنا تھا۔ مسلمانوں کی زندگی سے اسلام کو نکالنے کی عملی تدبیر اس طرح کی کہ خلافت کو تباہ کر دیا جائے، اوریوں مغربی کفار ایک خلافت کو منہدم کر کے اس کو چالیس سے زائد نام نہاد آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ پھر مغرب نے ان میں سے ہر ریاست میں اپنا ایک پٹھو کٹھ پتلی حکمران مقرر کیا جو مغرب کی مرضی سے چلتا تھا وہ جیسا چاہتے اس کی مکمل تعمیل کرتا۔ مسلمانوں میں سے ان غداروں کو اس بنیاد پر حکمران مقرر کیا گیا تاکہ وہ مغرب کے مفادات کے لئے ریاست کے وسائل پر مغرب کے

چوکیدار کی حیثیت سے پہرہ دیں اور کوئی سنجیدہ کوشش جو اس ذہنی اور مادی غلامی کے خلاف پیدا ہو اس کو کچل کر رکھ دیں، پھر مغرب ہی نے اس حکمران کے لئے حکومتی نظام تیار کئے اور ذرائع ابلاغ کو مغرب کے افکار کی تبلیغ و تشہیر کے ذریعے اسے لوگوں میں قابل قبول بنانے پر لگایا، اور پھر نظام تعلیم اور تدریسی نصاب فراہم کیا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ہماری نسلوں میں سے ایسے افراد پیدا ہوں جو افکار میں مغرب کی ہی پیروی کرتے ہوں اور اس کو ترقی یافتہ فکر خیال کرتے ہوں یا روشن خیالی مانتے ہوں یعنی مغرب کی فکری برتری کو یقینی بنایا گیا۔ ان تمام منصوبوں اور دیگر ہتھکنڈوں سے کفار مسلمانوں پر مسلط ہو گئے اور آج مسلسل طور پر اسلام کو زندگی سے دور رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں پر حق اور باطل مشتبہ ہوئے۔ ان کے افکار مغربی افکار سے متاثر ہوتے گئے اور مغربی طرز زندگی کے نمونہ پر ان کے طرز زندگی کی بنیاد پڑنے لگی جہاں زندگی کے بارے میں نقطہ نظر کے بارے میں منفعت فیصلہ کرنے لگی۔ یوں ان کے جذبات و احساسات و طن پرستی یا قومیت اور حب الوطنی اور روحانیت سے مخلوط ایک مکسچر بن گئے، نتیجے میں مسلم اقوام کے درمیان آپسی رشتے اور رابطے ٹوٹ گئے۔ مسلمانوں نے کفریہ نظاموں کی تابعداری قبول کر لی اور اسلامی ریاست کی عدم موجودگی پر کوئی حرج محسوس نہ ہوا۔ اس کے نتیجے میں اسلام بعض انفرادی شرعی احکامات اور ذاتی معاملات (پرسنل لاء) سے متعلق بعض احکامات تک سمٹ کر رہ گیا، دوسرے الفاظ میں مسلمانوں کی دنیاوی زندگی دین سے جدا ہونے کے لحاظ سے اہل مغرب کی طرح ہو گئی۔ یوں مسلمانوں کا رشتہ زمین کی زندگی سے زیادہ گہرا ہو گیا اور ان میں آسمان کی زندگی کی طلب ختم ہو گئی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا قانون مسلمانوں کے خلاف حرکت میں آیا جس سے کوئی بچ نہیں سکتا، چنانچہ ان کی زندگیاں غربت سے تنگ ہو گئیں، جہاں فاقوں، ظلم اور محرومی کا دور دورہ ہو، ان

میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کے امور کے بارے میں جہالت عام ہو گئی۔ برے اخلاق اور فاسد تعلقات میں مبتلا ہو گئے۔

اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جماعت پر لازم ہے کہ اصل بیماری اور اس سے پیدا شدہ دیگر علامات اور اثرات کے درمیان تفریق کرے۔ جو ان کے درمیان فرق نہ کر پائے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ غربت ہی تمام مسائل کی جڑ ہے یا بنیادی مسئلہ برے اخلاق یا جہالت ہے، تو ظاہر ہے مسلمانوں کے پاس وہ جزوی کام کی دعوت یعنی ادھورا حل ہی لے کر آئے گا جو مسلمانوں کے اصل مرض کی بجائے اس کے دیگر علامات کا علاج ہو گا۔ جو (شخص یا جماعت) حالات کو گہری نگاہ سے دیکھے گا اور باریک بینی سے اس کا مطالعہ کرے گا تو اس کے علم میں یہ بات آجائے گی کہ اسلامی ریاست کا غیر موجود ہونا ہی وہ واحد بنیادی مسئلہ ہے جس کے خاتمہ سے مسلمانوں کی زندگی سے اسلام مٹ گیا اور وہ تباہ ہوئے، کفار کے محکوم ہو گئے، ان پر اس مسئلہ کے نقصان دہ اثرات جیسے جہالت، غربت اور ظلم و نا انصافی چھا گئے۔ مسلمانوں کی عملی زندگی میں اسلام کو دوبارہ لانے کے لیے اس جماعت کی ذمہ داری ہے کہ اسے اس بات کا ادراک ہو کہ دارالکفر کو جس میں آج مسلمان زندگی گزار رہے ہیں دارالاسلام میں تبدیل کرنا واجب ہے اس دارالاسلام میں جہاں مسلمان بلا استثناء تمام اسلامی احکامات کی پابندی کر سکیں گے اور پورے اسلام میں داخل ہونگے۔ اور اس بات کا ادراک کہ موجودہ غیر اسلامی معاشرے کو ایک اسلامی معاشرے میں تبدیل کرنا فرض ہے جس میں افراد اسلام کے افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کے جذبات و احساسات اسلام سے جڑتے ہوں اور ان کی زندگیوں کے عملی قانون دراصل اسلامی احکامات ہوں اور وہ اپنے معاملات کے فیصلے اسلامی نظام کے تحت کرتے ہوں تب تسلیم کیا جائے گا کہ اللہ کی زمین میں پورا اسلام مکمل قائم کیا گیا ہے۔

چنانچہ اب سامنے مقصد واضح ہو چکا ہو گا جو دارالاسلام کو قائم کرنے کی جدوجہد ہے اور ایک ایسی اسلامی ریاست کے قیام کی کوشش ہے جو اس اسلامی عقیدے پر قائم ہوگی جس سے مختلف نظام زندگی نکلتے ہیں، اور جن نظاموں کی حدوں میں رہتے ہوئے مسلمان اسلامی زندگی بسر کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کی پابندی اور التزام پر قائم ہوتی ہے۔

جس وقت ایک جماعت نے یہ مقصد متعین کر دیا اس کے بعد اس کے لیے اس شرعی طریقے پر بحث کرنے کی طرف جانا ممکن ہو سکے گا جس پر کاربند ہونا اس کے لئے لازم ہے اور اس طرح ان شرعی اعمال کا تعین بھی ہو گا جن کی پابندی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس پر فرض ہوتی ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اس دور کی طرف نظر ڈالنا چاہیے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تھے جو اس وقت دارالکفر ہوا کرتا تھا، جہاں رسول اللہ ﷺ کا طریقہ رونما ہو رہا تھا اور آپ ﷺ کی دعوت دھیرے دھیرے کھلے عام دعوت بننے لگی تھی، آپ ﷺ کے اسی دور کے افعال سے ایک جماعت کو اپنا طریقہ، عمل اور مراحل معلوم ہو سکتے ہیں۔

### طریقہ آج بھی وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تھا:

جماعت پر یہ لازم ہے کہ ان افعال کا گہرا مطالعہ کرے جو اعمال رسول اللہ ﷺ نے انجام دیئے ہیں جن کے نتیجے میں اسلام کی سب سے پہلی اسلامی ریاست مدینہ میں قائم ہوئی۔ جی ہاں بے شک رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا ہو گا۔ لہذا دعوت کو انجام دینے کے لئے آج بھی اللہ کے احکامات کی پہچان اس دور سے حاصل ہوگی، پھر یہ دعوت ہر قسم کی مشکلات کے باوجود صبر و استقامت کے ساتھ اپنا راستہ بناتی ہے۔ حق کی پکار دینے والے کو شہدائے گدراں پڑتا ہے کوئی ایسا نہیں جو اس امتحان سے

چھوٹا ہو۔ جیسا کہ وحی کے نزول کی شروعات میں ہی ورقہ بن نوفل نے رسول اللہ ﷺ سے کہا تھا :  
**((لَتُكَذِّبْنَهُ، وَ لَتُؤْذِيْنَهُ، وَ لَتُخْرِجَنَّهُ، وَ لَتُفَاتِلَنَّهُ))** ”اس دعوت میں تم جھٹلائے جاؤ گے، تمہیں تکلیف دی جائے گی، تمہیں (یہاں سے) نکال دیا جائے گا اور تم سے جنگ کی جائے گی۔“  
 رسول اللہ ﷺ نے ان سے پوچھا : **((أَوْ مُخْرِجِيْ هُمْ))** ”کیا واقعی میری قوم مجھے نکال دے گی؟“ تو ورقہ نے کہا: ”تم سے قبل جو رسول آئے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کو ان کی قوم نے نہیں نکالا۔“  
 ارشاد باری تعالیٰ ہے : **﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأَوْدُوا حَتَّىٰ أَتَاهُم نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّل لِّكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبَاِ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (الانعام: 34)** ”اور حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے، پھر جس طرح انہیں جھٹلایا گیا اور ان کو تکلیفیں دی گئیں، اس سب پر انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی اور کوئی نہیں جو اللہ کی باتوں کو بدل سکے۔ اور (پچھلے) رسولوں کے کچھ واقعات آپ تک پہنچ ہی چکے ہیں۔“

دعوتی کام کا طریقہ کار وہی ہو گا جو کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کا تھا، رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں ایک مدت گزاری جب وہ دارالکفر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں ایسے نتیجہ خیز اعمال انجام دیئے جن کے نتیجے میں مدینہ میں دارالاسلام وجود میں آیا۔ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کا عمل جہاں اسلامی ریاست قائم ہوئی تھی، دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف حرکت انتقال تھا۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری بات کا یہ مطلب ہے کہ دعوت آج بھی دو مرحلوں سے گزرنا چاہیے یعنی مکی مرحلہ اور مدنی مرحلہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں دعوت دو مراحل سے گزری ہے:

1- مکی مرحلہ: جہاں رسول اللہ ﷺ پر زیادہ تر عقائد سے متعلق اور بہت کم تعداد میں احکامات سے متعلق آیات وحی کے ذریعے نازل ہوئیں۔ احکامات کا جتنا حصہ نازل ہو چکا تھا مسلمان اس کے علاوہ مزید کسی حکم کے لئے شرعی طور پر پابند یا مکلف نہیں تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو درگزر کرنے کا حکم ملا تھا اور حکمت کے ساتھ دعوت دینے اور خوبصورت انداز سے وعظ کرنے کے حکم کے ساتھ ساتھ ہتھیار استعمال نہ کرنے اور اس راستے میں کسی بھی نقصان یا اذیتوں کا سامنا کرنے پر صبر کا حکم دیا گیا تھا۔

2- مدنی مرحلہ: جہاں رسول اللہ ﷺ پر عقائد سے متعلق باقی ماندہ تمام آیات اور احکامات سے متعلق تمام آیات وحی کے ذریعے نازل ہوئیں۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کو اسلامی احکامات کو قانون کے طور پر قائم کرنے، عقوبات (سزاؤں) کو نافذ کرنے، جہاد کا اعلان کرنے اور علاقوں کو فتح کرنے اور لوگوں کے معاملات کی نگرانی کا حکم دیا گیا۔ اس مرحلہ میں ہر ایک مسلمان پورے اسلام کا پابند اور مکلف تھا۔

آج ہم پورے اسلام کے بارے میں ذمہ دار ہیں خواہ وہ مکہ میں نازل ہو یا مدینہ میں، ان تمام میں سے کسی بھی حکم کے متعلق کسی بھی قسم کی کوتاہی پر مسلمان کی پکڑ ہوگی۔ چنانچہ مسلمان سے طلاق و نکاح کے احکامات، لین دین، جہاد، روزے اور حج کے احکامات، عقوبات و گواہی سے متعلقہ احکامات، زمینوں اور ملکیت سے متعلقہ احکامات سمیت ان دیگر تمام احکامات کے بارے میں پوچھا جائے گا جو مدینہ میں نازل ہوئے۔ ہاں بعض احکامات ایسے ہیں جن پر عمل کرنا شرع نے خلیفہ پر لازم کیا ہے کسی فرد کو ان کو انجام دینے کی اجازت نہیں ہے، جیسے عقوبات کے مکمل احکامات، اسلامی دعوت کو پھیلانے کے لیے اقدامی جہاد کرنے کے احکامات، ریاست کی سرکاری ملکیت سے متعلق احکامات اور خلافت کے احکامات۔ اسی طرح کچھ احکامات ایسے ہیں جو کہ خلیفہ کی ذمہ داری نہیں ہیں البتہ ہر ایک مسلمان پر ہر حال میں ان کی ادائیگی فرض کی گئی ہے اور ان پر پابند نہ رہنے پر اسکی پکڑ کی جائے گی خواہ وہ احکامات مکہ میں نازل

ہوئے ہوں یا مدینہ میں، یہاں تک کہ اگر ایک مسلمان کسی ریاست میں انفرادی احکامات پر عمل نہیں کر سکتا تو وہاں سے ہجرت کرنا اس پر فرض ہو جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَئِكَ عَسَى اللَّهُ أَنْ يَعْفُو عَنْهُمْ وَكَانَ اللَّهُ عَفْوًا غَفُورًا﴾ (النساء: 97-99) ”بے شک جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور اسی حالت میں فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئے (کیونکہ وہ کافروں کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے حالانکہ ہجرت ان پر فرض ہو گئی تھی) تو بولے ”تم کس حالت میں تھے؟، وہ کہنے لگے کہ ”ہم تو زمین میں بے بس بنادئے گئے تھے۔ فرشتوں نے کہا ”کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟“ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور نہایت برا انجام ہے، البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے (اس انجام سے مستثنیٰ ہیں) جو (ہجرت کی) کوئی تدبیر نہیں کر سکتے اور نہ (نکلنے کا) کوئی راستہ پاتے ہیں، چنانچہ پوری امید ہے کہ اللہ ان کو معاف فرمادے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا بہت بخشنے والا ہے۔“

اس وجہ سے آج ہمارے حالات میں یہ کہنا غلط ہے کہ یہ کی دور ہے اور یا یہ مدنی دور ہے، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افعال جو دعوت کے مراحل میں سے آپ ﷺ نے مکہ میں رہتے ہوئے انجام دیئے ہیں اور وہ اعمال جن کے نتیجے میں دارالاسلام وجود میں آیا، ہم دعوت کے اس عمل میں ان مراحل و افعال سے متعلق ضرور آپ ﷺ کی سیرت کی پیروی کریں گے اور آپ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں گے۔ یہ معاملہ صرف دارالاسلام کے قیام کے کام سے متعلقہ احکامات کے بارے میں



ہے جبکہ باقی دیگر احکامات جو کہ افراد سے متعلق انفرادی حیثیت کے حامل ہیں ان پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ وہ دارالاسلام میں رہتا ہو یا دارالکفر میں۔

# دارالاسلام قائم کرنے کی کیفیت

اب ہم ان شرعی اعمال کا تعین کرتے ہیں جن کی پابندی شرع کی جانب سے لازمی ہے اور وہ مراحل جن کی پابندی دارالاسلام کے قیام کے لیے فرض ہے۔ اس بحث کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے:

پہلی قسم جو تبدیلی لانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے منہج سے بحث کرتی ہے:

دوسری قسم جو تبدیلی لانے کے لئے کام کرنے والی جماعت یا پارٹی کے منہج پر بحث کرتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے منہج کی پیروی میں قائم کردہ منہج ہی ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تربیت کا دور:

جب آپ ﷺ کو نبوت عطا کی گئی تو آپ ﷺ نے لوگوں کو دعوت دینا شروع کیا، جس کے نتیجے میں کچھ لوگ ایمان لے آئے اور کچھ نے انکار کیا، یہاں تک کہ مکہ میں اسلام کا چرچا ہو گیا اور لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے شروع میں لوگوں کو دعوت دینے کے لیے ان کے گھروں میں جاتے اور اعلانیہ ان کو اسلام کی طرف دعوت دیتے: ﴿يَا أَيُّهَا الْمَدَنِيُّ ﴿١﴾ قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ (المدثر: 1-2) ”اے چادر میں لپٹنے والے! اٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو۔“

اس دین کی بنیاد پر آپ ﷺ ان کی خفیہ طور پر گروہ بندی کرتے چنانچہ اسی لیے صحابہ کرامؓ اپنی قوم سے چھپ کر پہاڑوں کی وادی میں نماز پڑھتے۔ جو بھی نیا شخص ایمان لے آتا اس کو قرآن کی

تعلیم دینے کے لیے آپ ﷺ کسی کو مقرر فرماتے، چنانچہ آپ ﷺ نے خباب بن الارت کو زینب بنت الخطاب اور ان کے شوہر سعیدؓ کو قرآن کی تعلیم دینے کے لیے سعیدؓ کے گھر بھیجا۔ یہی وہ حلقہ ہے جس میں امیر المومنین سیدنا عمرؓ بن الخطاب نے ایمان قبول کیا تھا۔ آپ ﷺ نے دارالرقم (ارقم کا گھر جو مکہ کے بیرونی کنارہ پر واقع تھا) کو مومنوں کی اس جماعت کے لیے مرکز اور اس نئی دعوت کے لیے اسکول بنایا۔ یہاں آپ ﷺ ان کو قرآن پڑھ کر سنااتے اور اس کو سمجھنے، یاد کرنے اور عمل کرنے کی تعلیم دیتے۔ رسول اللہ ﷺ اس معاملہ کو خفیہ رکھتے اور جو بھی آپ ﷺ پر ایمان لاتا اس کو اس تشکیل میں شامل کرتے، پھر خفیہ طور پر آپ ﷺ اس کو دار قم بن ابی الارت قم میں ہی تعلیم دیا کرتے، اس دوران آپ ﷺ کا یہی طریقہ کار رہا حتیٰ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الحجر: 94) ”لہذا جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو، اور جو لوگ (پھر بھی) شرک کریں، اُن کی پروا مت کرو۔“

شروع میں رسول اللہ ﷺ ہر اس شخص کو دعوت دیتے جس کے اندر آپ ﷺ اس دعوت کو قبول کرنے کی طرف آمادگی بھانپ لیتے۔ آپ ﷺ ان کی عمر، معاشرہ میں ان کے مرتبے، ان کی جنس کہ مرد ہے یا عورت، حسب و نسب یا اصلیت کو نہیں دیکھتے تھے، یوں آپ ﷺ کے ساتھ جب چالیس افراد کی ایک جماعت تیار ہو گئی، یہ لوگ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی اور یہ مختلف ماحول سے تعلق رکھتے تھے تو اب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے آپ ﷺ کو دین کو مکمل طور پر ظاہر کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ ان میں اکثر نوجوان تھے، ان میں کمزور بھی تھے، طاقتور بھی، مالدار بھی تھے اور غریب بھی۔ جب یہ صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی تربیت میں اللہ کی وحی کے ساتھ اسلامی ثقافت کے رنگ میں رنگ گئے اور تربیت یافتہ ہو گئے، ان کی عقلیت (ذہنیت) ڈھل کر اسلامی عقلیت بن گئی، ان کی

نفسیہ ( جذبات اور برتاؤ ) ڈھل کر اسلامی نفسیہ بن گئی۔ تب رسول اللہ ﷺ کو بھی اس بات کا اطمینان ہو گیا کہ آپ ﷺ کی جماعت اب اتنی قوی ہو چکی ہے جو کہ معاشرے کے رد عمل کا سامنا کرنے کی طاقت رکھتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ کو جب اللہ جلّ جلالہ کا مذکورہ حکم آیا تو رسول اللہ ﷺ پھر اس جماعت کے ساتھ کھل کر عوام کے سامنے آ گئے۔

اسلامی دعوت تو اسی دن سامنے آچکی تھی جس دن رسول اللہ ﷺ کو نبوت دے کر مبعوث کیا گیا تھا۔ مکہ میں لوگوں کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ محمد ﷺ ایک نئے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں اور انہیں اس کی بھی سُن گن لگ چکی تھی کہ آپ ﷺ پر بہت سے لوگ ایمان لائے ہیں، لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ محمد ﷺ اپنے صحابہؓ کی جماعت سازی کرتے ہیں اور ان کی نگرانی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان اس جماعت سے اپنے رشتہ کو ظاہر نہیں کر رہے ہیں اور وہ اس نئے دین کو خفیہ طور پر قبول کر رہے ہیں۔ ان کی ان معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس جدید دعوت کا احساس ہو چکا تھا اور یہ کہ اس معاشرے میں مومنین موجود ہیں اگرچہ ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ایمان والے کہاں اکٹھے ہوتے ہیں اور ان میں کون کون افراد شامل ہیں جو جمع ہوتے ہیں، رسول اللہ کا اسلام کا حکم کھلا اعلان کرنا ان کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کیونکہ اس دعوت کا ایک دن کھل جانا متوقع تھا۔ ان کے لئے جو نئی چیز تھی وہ مومنوں کے اس گروہ یا جماعت کا ظاہر ہو جانا تھا جو ان کے لئے ایک لاکار کی طرح سامنے آیا۔

چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ پر اللہ کی جانب سے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ ﴿إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ﴾ ﴿الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَهًا آخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ﴾ (الحجر: 94-96) ”لہذا جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو، اور جو لوگ (پھر بھی) شرک کریں، اُن

کی پروامت کرو۔ یقین رکھو کہ ہم تمہاری طرف سے ان لوگوں سے نمٹنے کے لئے کافی ہیں جو تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود مقرر کرتے ہیں انہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔“

تو آپ ﷺ نے کھل کر اور اعلانیہ دین کی دعوت شروع کی، اس اعلانیہ دعوت کے آغاز کے ساتھ آپ ﷺ اُس خفیہ دور کے مرحلہ سے اعلانیہ دور کی طرف منتقل ہوئے جس میں آپ ﷺ صرف اس کو دعوت دیا کرتے تھے جس کے چہرے پر بھلائی کے آثار پاتے تھے اور جس میں آپ ﷺ عزیز و اقارب کو دعوت دیا کرتے تھے، دعوت کے اس خفیہ مرحلہ سے نکل کر اب اگلے اعلانیہ مرحلہ میں آپ ﷺ نے تمام لوگوں کو مخاطب کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یوں ایمان و کفر اور صحیح و غلط افکار کے درمیان تصادم اور کشمکش شروع ہو گئی۔ اس طرح اس اعلانیہ مرحلہ کے ساتھ دعوت کا دوسرا دور یعنی تفاعل اور جدوجہد کا دور شروع ہو گیا۔ یہ دور تمام ادوار میں سب سے زیادہ مشکلات کا دور تھا۔ یہی وہ دور تھا جب رسول اللہ ﷺ کے گھر پر پتھر برسائے گئے۔ ابو لہب کی بیوی اُمّ جمیل گندگی اٹھا کر رسول اللہ ﷺ کے گھر کے سامنے ڈالتی، آپ ﷺ جواب میں صرف صبر کرتے ہوئے اس گندگی کو ہٹاتے۔ ابو جہل بتوں کے چڑھاوے کے لئے ذبح کی ہوئی بھیڑ کی اوڑیوں کو رسول اللہ ﷺ پر ڈالتا، آپ ﷺ کو تکالیف اور مصائب کے یہ جھٹکے ہلانہ سکے بلکہ آپ ﷺ دعوت پر مزید استقامت دکھاتے اور صبر کرتے۔ ہر قبیلہ نے اپنے میں سے ایمان لانے والوں کو ان کے دین کی وجہ سے ستانا، سخت تکلیفیں دینا اور انہیں عذاب میں رکھنا شروع کیا۔ ایسی ہی مثالیں تھیں جن میں بلالؓ، عمارؓ اور ان کے ماں باپ اور ان کے ساتھ دیگر کئی افراد تھے جنہوں نے سخت تکلیف و عذاب کے دور میں تکلیفوں کو سہتے ہوئے استقامت اور صبر و تحمل کی مثالیں قائم کیں اور تاقیامت بعد میں آنے والوں کے لئے مشعل راہ چھوڑ کر گئے ہیں۔

شروع شروع میں کفار نے یہ سمجھ کر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو کوئی اہمیت نہیں دی کہ آپ ﷺ کا کلام بھی راہبوں اور عقلمندوں کی باتوں کی طرح حکیمانہ باتوں جیسا ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور یہ ایمان لانے والے لوگ بہت جلد اپنے آباء واجداد کے دین کی طرف لوٹ آئیں گے، اسی لیے وہ آپ ﷺ کے بارے میں نفرت انگیز باتیں نہیں کرتے تھے اور نہ ہی آپ ﷺ کو برا بھلا کہتے بلکہ جب آپ ﷺ ان کی مجلسوں کے پاس سے گزرتے تو وہ لوگ یہ کہتے کہ ”یہ عبدالمطلب کا بیٹا ہے اور آسمانی باتیں کرتا ہے۔“ لیکن جب رسول اللہ ﷺ ان کی تہذیب، رسم و رواج اور معاشرتی برائیوں کے خلاف ان تمام لوگوں کے مد مقابل ہوئے اور ان کی خرابیوں پر ان کو لکارا، جس میں ان کے معبودوں کو ذکر کرتے ان کو واشگاف کرتے اور ان جھوٹے خداؤں کے ماننے والوں کی بیوقوفی کا ذکر کیا، ان کے آباؤ اجداد کی گمراہی بیان کی، تو سب پھٹ پڑے اور آپ کو اپنا دشمن تسلیم کر لیا اور پھر سب کے سب آپ ﷺ کی دشمنی، مخالفت اور اس لڑائی میں آپس میں مل گئے۔

وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح آپ ﷺ کے مقام اور رتبہ کو ختم کر دیں لہذا انہوں نے اس کے لئے آپ ﷺ کی نبوت کے دعوے کو جھٹلایا، انتہائی بھونڈے انداز میں مذاق اڑاتے ہوئے آپ ﷺ سے معجزات کا مطالبہ کیا، وہ کہنے لگے: ”محمد صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو سونے میں کیوں تبدیل نہیں کرتا؟“، ”آسمان سے ہی لکھی لکھائی کتاب کیوں نہیں اتر جاتی؟“، ”فرشتہ جبرائیلؑ، مسلمانوں کے سامنے ظاہر ہو کر کیوں نہیں آتے؟“، ”یہ (محمد) مردوں کو زندہ کیوں نہیں کرتے؟“۔ اسی قسم کی باتیں وہ کرتے رہے بلکہ وہ اور مزید ہٹ دھرم ہو گئے، جبکہ دوسری جانب رسول اللہ ﷺ مسلسل لوگوں کو اپنے رب کے پیغام کی طرف دعوت دیتے رہتے۔ کفار نے آپ ﷺ کو دعوت سے باز رکھنے کے لیے تمام راستے اور تھکنڈے آزمائے۔ وہ آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں اور آپ ﷺ کی پیروی کرنے والوں کو سزا دیتے۔ آپ ﷺ اور اصحابؓ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے، بائیکاٹ کیا اور بھی مختلف

طریقہ اپنائے، لیکن رسول اللہ ﷺ اللہ کی رسی کو اور زیادہ مضبوطی سے تھام لیتے اور دعوت میں مزید زیادہ جوش و جذبے کا مظاہرہ کرتے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی نبوت اور آپ ﷺ کی برداشت کے بارے میں خبریں دیگر قبائل کے کانوں میں پہنچنے لگیں اور آپ ﷺ کی دعوت کا چرچا قبائل عرب میں عام ہو گیا اور اس طرح اسلام کو جزیرہ عرب میں شہرت حاصل ہوئی، کاروان اور سوار اسلام ہی کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ عام طور پر مسلمانوں کو لوگوں سے گھلنے ملنے اور ان سے اپنی بات کرنے کی گنجائش اور کوئی موقع نہیں تھا، مسلمانوں کو گھلنے ملنے اور بات کرنے کا موقع صرف مقدس مہینوں (ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب المرجب) میں ملتا، جب رسول اللہ ﷺ کعبہ میں آکر تمام اہل عرب کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دیتے، ان کو اللہ کی جانب سے انعامات کی خوشخبری سناتے اور اللہ کے عذاب اور سزا کے بارے میں ڈراتے۔

### رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تفاعل کا مرحلہ:

قریش کا دعوت کے ساتھ تصادم کرنا ایک فطری بات تھی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس گروہ کو لوگوں میں اٹھایا تھا اور بالکل واضح طریقے سے ان کو ایسی دعوت دی جو قریش کے لئے ایک للکار تھی۔ یہ دعوت فطری طور پر خود قریش اور مکہ کے معاشرے کے خلاف ایک جدوجہد تھی، کیونکہ یہ دعوت اللہ کی توحید، خالص اللہ کی عبادت اور اللہ کے علاوہ ہر کسی کا انکار کرنے اور بغاوت کے لئے ایک بلاوا تھی اور اس دعوت میں اس فاسد نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے ایک پکار تھی جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے، آپ ﷺ ان کے معبودوں کے عیب کھولتے اور ان کی گناہ آلود زندگی کی

مذمت کرتے اور ان کے ظالمانہ طرزِ زندگی پر انگلی اُٹھاتے۔ آپ ﷺ سچائی اور حقیقت کے ذریعے ان کا مقابلہ کرتے جبکہ مشرکین افواہوں اور پراپیگنڈہ کا سہارا لیتے۔ آپ ﷺ ہمیشہ صاف گوئی اور مدلل دو ٹوک انداز سے دعوت دیتے، دعوت پیش کرنے میں تامل یا ٹال مٹول نہ کرتے، دبتے ہوئے یا لحاظ کرتے ہوئے دعوت نہ کرتے، آپ ﷺ نے نہ ان کی خوشامد کی اور نہ ہی ان سے کوئی سمجھوتہ کیا، بلکہ آپ ﷺ ہر قسم کی تکلیف دیے جانے، رد کئے جانے، بے دخل کئے جانے، افواہ پھیلانے جانے اور بائیکاٹ کئے جانے کے باوجود ہر حال میں دعوت جاری رکھتے۔ اور ان تمام کے باوجود آپ ﷺ لوگوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے یہاں تک کہ اسلام پھیلنے لگا۔

جب آپ ﷺ کے چچا اور زوجہ محترمہ (خدیجہؓ) کا انتقال ہوا اور قریش کی جانب سے ایذا رسانی میں مزید اضافہ ہوا تو آپ ﷺ طائف کی طرف گئے تاکہ وہاں سے نصرہ و مدد تلاش کریں اس اُمید کے ساتھ کہ شاید اہل طائف اسلام کی دعوت کو قبول کر لیں، لیکن انہوں نے نہایت بُرے سلوک کے ساتھ آپ ﷺ کا انکار کیا اور آپ ﷺ کو وہاں سے نکال دیا۔ آپ ﷺ کی حالت یہ ہو گئی کہ کسی کی پناہ لیے بغیر مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ وہ دن تھا جب آپ ﷺ کو اپنے وطن عزیز مکہ میں داخل ہونے کے لئے مُطعم بن عدی کی پناہ ملنی پڑی۔ اب قریش کی ایذا رسانی مزید تیز تر ہوتی گئی اور ان کی مخالفت انتہائی شدید ہو گئی، اہل قریش نے لوگوں کو رسول ﷺ کی بات سننے سے سخت طور پر منع کیا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ دعوت دینے سے باز نہیں آئے، آپ ﷺ حج کے میلے کے موقع پر اپنے آپ کو مکہ میں آئے ہوئے قبائل عرب کے سامنے پیش کرتے، ان کو اسلام کی دعوت دیتے اور ان کو بتلاتے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور آپ ﷺ کی نبوت قبول کرنے کی دعوت دیتے، ایسے میں آپ ﷺ کا چچا ابو لہب اٹھ کھڑا ہوتا اور آپ ﷺ پر جھوٹ گھڑنے کا الزام دیتا اور لوگوں کو اکساتا کہ وہ آپ ﷺ کی باتیں نہ سنیں، لوگوں پر اس کا اثر ہوتا اور لوگ باتیں سننے سے منہ پھیر لیتے۔ اسی



طرح کرتے ہوئے آپ ﷺ قبیلہ بنو کنندہ کے پڑاؤ کی طرف گئے اور بنو کلب کی طرف گئے، بنو حنیفہ اور بنو عامر بن صعصعہ کے پاس گئے، لیکن کسی نے بھی آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا بلکہ بعض نے تو نہایت گھٹیا انداز سے انکار کر دیا۔ قبائل عرب کا یوں رُخ موڑنے کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا ساتھ دینے یا امداد کرنے والے فرد اور قبیلے کو قریش اپنا دشمن اور قریش کے خلاف مدد کرنے والا قرار دے رہے ہیں، یوں مکہ میں رسول اللہ ﷺ تنہا ہو کر رہ گئے اور مکہ اور اس کے اطراف میں دعوت انتہائی دشوار ہو گئی، مکی معاشرہ انتہائی ہٹ دھرمی پر تڑپا ہوا اور کفر میں بری طرح ڈوبا ہوا ظاہر ہونے لگا تھا۔ جب قریش کی جانب سے صحابہؓ کی ایذا رسانی انتہا کو پہنچ گئی تو عبدالرحمن بن عوفؓ بعض صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے اسلحے کے استعمال کی اجازت لینے آئے اور عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول! جب ہم مشرک تھے تو ہم طاقتور اور معزز تھے، اب جبکہ ہم ایمان لے آئے ہیں ہمیں ذلیل کیا گیا ہے۔“ رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: (( اِنِیْ اَمِرْتُ بِالْعَفْوِ، فَلَا تَقَاتِلُوا الْقَوْمَ )) (ابن ابی حاتم، نسائی، الحاکم) ”مجھے درگزر کا حکم دیا گیا ہے، پس لوگوں سے مت لڑو۔“

یوں اسلامی دعوت میں رسول اللہ ﷺ مکہ میں یکے بعد دیگرے دو مرحلوں میں آگے بڑھتے رہے۔

تعلیم و تربیت، فکری اور روحانی طور پر تیار کرنے کا مرحلہ: یہ مرحلہ افکار کو سمجھنے، انہیں افراد کے ذہنوں میں پختہ کرنے اور افراد کی شخصیتوں میں ڈھالنے اور پھر ان افکار کی بنیاد پر ان کا گروہ تشکیل دینے کا دور تھا۔

دعوت کو پھیلانے، تفاعل اور جدوجہد کا مرحلہ: یہ مرحلہ معاشرہ میں اثر و رسوخ رکھنے والے اہل قوت کے اندر اسلامی افکار کو منتقل کر دینے کا دور ہے تاکہ وہ ان افکار کو معاشرہ کی زندگی میں نافذ کر دیں

چنانچہ پھر عوام ان پر ایمان لائیں، ان کو سمجھیں، ان کو لے کر اٹھیں اور ان کے نفاذ کی جدوجہد میں لگ جائیں۔

جہاں تک پہلے مرحلے کا تعلق ہے تو یہ لوگوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے، پھر اسلامی افکار کے ذریعے ان کی تربیت کرنے اور ان کو اسلامی احکامات کی تعلیم اور تلقین کرنے کا دور تھا، اس طرح ان لوگوں کی جماعت سازی کا دور تھا جنہیں اسلامی عقیدے کی بنیاد پر اس جماعت میں شامل کیا جاتا اور یہ جماعت خود پھر اس کام کو انجام دینے کے قابل ہو جاتی۔ اسلامی دعوت میں یہ پس پردہ جماعت سازی کا دور تھا، اس دوران رسول اللہ ﷺ کا لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کا عمل رُکا نہیں بلکہ ساتھ ہی آپ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والے افراد کی اسلامی افکار کے ذریعے تربیت کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی، آپ ﷺ ان کو دارِ ارقم میں اکٹھا کرتے اور پھر انہیں ایک جماعت کی شکل دیتے، یوں روز بروز ان لوگوں کا ایمان مضبوط ہوتا اور آپس میں ان کا تعلق گہرا ہو جاتا، ان کو اس حقیقت کا ادراک بھی ہو جاتا کہ وہ کتنا اہم کام کر رہے ہیں، اس کے لیے کتنی بڑی قربانی کی ضرورت ہے، یوں یہ دعوت ان کے دل و دماغ میں مضبوطی کے ساتھ جم گئی۔ اسلام خون کی طرح ان کی رگوں میں دوڑنے لگا، وہ ایسے اسلام تھے جو راستوں پر چلتا پھرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ خود کو اور اپنی جماعت اور اسکی ملاقاتوں کو خفیہ رکھنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود دعوت ان کے اندر چھپ نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنے قریبی قابل اعتبار شخص اور ایسے شخص کو جس کے اندر دعوت کی قبولیت کی آمادگی دیکھتے، دعوت دیتے۔ اس طرح لوگوں کو ان کی دعوت اور موجودگی کا احساس ہوا۔ پس دعوت نے شرعی نقطہ پار کر لیا تھا اور اب وہ گھڑی آچکی تھی کہ دعوت کو پھیلا دیا جائے، لہذا کوشش کی گئی تاکہ دعوت کو کھلے عام پھیلا دیں اور تمام لوگوں کو مخاطب کیا جائے، یہاں یہ پہلا دور ختم ہوا۔ یہ دور جماعت سازی اور تربیت کا دور تھا جو اس جماعت کو مضبوط کرتی تھی۔

اب دوسرا مرحلہ جو کہ تفاعل یعنی آمنے سامنے ہونے اور جدوجہد کا دور تھا وہ شروع ہوا، اس میں لوگوں کو اسلام سمجھایا جاتا تھا چنانچہ وہ اس دعوت کے رد عمل میں اس کو قبول کرتے جو پھر ان کے دلوں میں رچ بس جاتا یا پھر وہ اس کا انکار کر دیتے اور پھر اس کی مخالفت کرتے یوں ان کے افکار اور اسلامی افکار کے درمیان تصادم شروع ہو جاتا۔ افکار کے اس تصادم میں کفر اور فساد کی ہار ہوتی اور ایمان اور بھلائی سب پر ظاہر ہو جاتی اور سچے اور صحیح افکار کامیاب ہو جاتے۔ اس طرح اب آمناسامنا (تفاعل) شروع ہو گیا جس میں ایک فکر اور دوسری فکر کے درمیان ٹکراؤ ہوا، مسلمانوں اور کفار میں کشمکش ہوئی۔ تفاعل کی شروعات اس وقت ہوئی جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو کھلے عام اعلانیہ طور پر دلیری کے ساتھ اور للکارنے کے انداز سے دعوت دینا شروع کیا۔ پھر اس دوران رسول اللہ ﷺ پر ایسی آیات اترنا شروع ہوئیں جن میں توحید کی دعوت، بت پرستی اور شرکیہ افکار کے خلاف حملے، آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور پیروی کی مذمت کی جانے لگی۔ پھر ایسی آیات نازل ہوئیں جن میں معاملات کی خرابیوں پر مذمت کی گئی، چنانچہ ان آیات میں اس معاشرے میں موجود فاسد تجارت، ملاوٹ، ناپ تول میں کمی جیسے خراب معاملات پر حملے کئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو مجمع میں مخاطب کرنا شروع کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں، قریش کا اب آپ ﷺ سے جھگڑا بڑھنے لگا، اس دوران دعوت میں ان تربیتی حلقات کے علاوہ جو گھروں میں یا پہاڑوں کی وادیوں میں یا دارار قم میں لئے جاتے تھے ایک نئی اجتماعی تربیت بھی شامل کر دی گئی تھی جس کی وجہ سے دعوت اب قریبی اور بھلے لوگوں سے نکل کر عام لوگوں کی طرف منتقل ہونے لگی تھی۔ یہ اجتماعی دعوت اور اجتماعی تربیت قریش کو متاثر کر رہی تھی، چنانچہ ان کی نفرت شدید ہوتی جاتی اور انہیں خطرہ قریب ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک مدت کے بعد جس میں انہوں نے نبی کریم ﷺ اور ان کی دعوت کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی اب وہ فکر مند ہو کر آپ ﷺ کی دعوت کی مخالفت میں سخت اقدامات کرنے لگے، چنانچہ

اب اذیتیں اور تکلیف شدید کی جانے لگیں۔ لیکن اس طرح کھلے عام اجتماعی دعوت کئے جانے کا خود دعوت اسلام پر زبردست اثر ہوا اور مکہ میں تقریباً سب لوگوں نے اسلام کی دعوت کے بارے میں سنا اور اللہ کے دین کی دعوت مکہ کے لوگوں میں پھیل گئی، مرد اور عورتیں اسلام میں داخل ہوئے۔ اس اجتماعی دعوت کا اثر یہ ہوا کہ سسٹی ہوئی اسلامی دعوت اب پھیل گئی اور اس کا دائرہ مزید وسیع ہو گیا اگرچہ اس کے پھیلنے کے ساتھ دعوت کے علمبرداروں کی تکلیفیں، اذیتیں اور پریشانیاں بھی بڑھیں۔ اور اس دوران جب رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے معاشرہ میں مدت مدید سے جاری ظلم، سنگدلی اور بربریت اور غلامی کے خلاف نعرہ بلند کیا تو قریش کے سرداروں کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور پھر ان کافروں کی زندگیوں کے حالات اور معاشرہ میں ان کے رویہ اور برتاؤ کے پول کھل گئے تو ان کی نفرت اور غم و غصہ کی آگ میں تیزی بڑھتی گئی، یہی مرحلہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کے لئے سخت ترین اور صبر آزما دور تھا۔

اگرچہ تربیتی دور سے تقابلی دور کی طرف منتقل ہونے کا مرحلہ سب سے نازک ترین مرحلہ تھا کیونکہ اس کے لئے حکمت، صبر اور عملی اقدامات کرنے کے لئے باریک بینی درکار ہوتی ہے۔ تاہم مشکل ترین دور تفاعل کا مرحلہ تھا، کیونکہ اس دور میں داعی کو جرات و بیباکی اور نتائج و عواقب یا حالات سے بے پروا ہو کر لکارنے والا بننا پڑتا ہے، اس دور میں مسلمان دین پر قائم رہنے کے لئے آزمایا جاتا ہے، یہی دور مسلمانوں کے لیے ایمان کی آزمائش کا دور تھا۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ کس کے اندر ایمان و برداشت اور یقین ہے، ان کی آزمائش پر ان کی سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی۔

اس طرح اپنے صحابہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے تکلیفیں اور ظلم برداشت کئے۔ انہی حالات میں کچھ لوگ اپنے دین کو بچانے کے لیے حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے، جبکہ کچھ لوگ تشدد

برداشت کرتے کرتے جان کی بازی ہار گئے، اور کچھ لوگ یہ مصائب جھیلتے رہے، اور ان مشکل حالات میں اس طرح یہ افراد کافی عرصہ تک مکی معاشرے کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن قریش کی طرف سے ڈھایا جانے والا عذاب اور اذیتیں اس میں حائل بنا، ان حالات کو دیکھ کر اہل عرب اور بہت سے دوسرے لوگ تماش بین بنے رہے، وہ قریش کا ظلم اور مومنوں کی حق پرستی اور استقامت کو دیکھتے لیکن کبھی ایمان کی طرف ایک قدم نہیں بڑھایا، کیونکہ وہ قریش کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں دعوت کو تیسرے مرحلہ میں داخل کرنے کا کام جو کہ اسلام کو نافذ کرنے کا مرحلہ ہے، مکہ سے نکل کر باہر منتقل ہو گیا، جس کے دوران رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل سے مدد و نصرت طلب کرنے کے لیے جاتے رہے تاکہ لوگوں پر اس دین کو واضح کر دیں جو ان کے رب نے ان کے لئے رسول ﷺ پر نازل کیا ہے۔

### رسول اللہ ﷺ کا قبائل پر اسلام کو پیش کرنا:

جب ایک سال کے اندر اندر رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ خدیجہؓ اور چچا ابو طالب کا انتقال ہوا، ان دونوں کی وفات کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی پریشانی بڑھ گئی۔ اب قریش آپ ﷺ کی ذات کو وہ اذیتیں دینے کے درپے ہوئے جو وہ آپ ﷺ کے چچا کی وفات سے قبل نہیں کر سکے تھے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے تو یہ جسارت بھی کی کہ آپ ﷺ کے سر پر مٹی ڈال دی، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **((ما نالت مني قریش شیئاً اكرهه حتی مات أبو طالب))**۔ (سیرۃ ہشام) ”ابو طالب کی وفات تک میں نے قریش کی جانب سے کبھی اتنی سخت ناگوار حرکت نہیں دیکھی تھی۔“

چنانچہ جب ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ طائف کی طرف گئے تاکہ اہل طائف سے نصرت و مدد طلب کریں، آپ ﷺ وہاں قبیلہ بنو ثقیف کے ایک گروہ کی طرف گئے جو اس وقت سرداران ثقیف تسلیم کئے جاتے تھے، آپ ﷺ نے ان سے اسلام کی حمایت کے متعلق گفتگو کی اور قریش میں سے جو آپ ﷺ کا مخالف ہو اس کے خلاف آپ ﷺ کے ساتھ حمایت میں کھڑے ہونے کو کہا، ان سرداروں نے آپ ﷺ کی پیش کش کو ٹھکرا دیا اور ساتھ ہی آپ ﷺ کے طائف آنے کی خبر قریش کو دے دی، حالانکہ آپ ﷺ نے ان سے اس ملاقات کو خفیہ رکھنے کا مطالبہ کیا تھا، اب یہ راز کھل جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے تھے سوائے یہ کہ کسی کی امان آپ ﷺ کو حاصل ہو۔

جب آپ ﷺ مختلف قبائل سے ملاقات کے لئے جاتے تو قبیلہ والوں کے دروازوں کے سامنے کھڑے ہو کر فرماتے: ((یا بنی فلان انی رسول اللہ الیکم، یا مرکم أن تعبدوا الله ولا تشرکوا به شیئاً، وأن تخلعوا ما تعبدون من دونه من هذه الأنداد، وأن تؤمنوا بی و تصدقوا بی و تمنعونی حتی أبین عن الله ما بعثنی به)) (سیرۃ ابن ہشام) ”اے فلاں کے بیٹو! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، (اللہ) تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو اس سے باز آ جاؤ، مجھ پر ایمان لاؤ اور میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو حتیٰ کہ میں اس چیز کو بیان کر دوں جس کو دے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔“

آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے آپ کا چچا ابو لہب کھڑا ہو جاتا اور آپ کی باتوں کو رد کرتا اور جھٹلاتا جاتا۔ کسی نے آپ ﷺ کی بات نہ سنی اور وہ یہ کہتے کہ: ”تمہیں تمہاری قوم بہتر طور پر جانتی ہے، اس لئے تو وہ آپ کی بات نہیں مانتے۔“ وہ آپ ﷺ سے بات کرتے تو بحث اور جھگڑا

کرتے، آپ ﷺ ان سے بات کرتے اور یہ کہتے ہوئے ان کو برابر دعوت دیتے رہتے: ((اللهم لو شئت لم يكونوا هكذا)) ”اے اللہ اگر آپ چاہتے تو یہ ایسے نہ ہوتے۔“

سیرۃ ابن ہشام میں ہے، الزہری نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مینا کے مقام پر مقیم قبیلہ بنو کنندہ کے گھروں میں گئے اور خود کو ان کے سامنے پیش کیا لیکن انہوں نے آپ ﷺ کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ الزہری مزید بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ پھر قبیلہ بنو کلب کے گھروں میں گئے اور انہوں نے بھی آپ ﷺ کی پیش کش کا انکار کیا، پھر آپ ﷺ قبیلہ بنی حنیفہ کے گھروں میں گئے اور ان سے بھی نصرت و مدد طلب کی لیکن تمام عربوں میں ان کا جواب نہایت ہی بدترین تھا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کی طرف گئے اور ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور خود کو ان کے سامنے پیش کیا۔ ان میں ایک شخص جس کا نام بجرہ بن فراس تھا اس نے اپنے قبیلہ سے کہا کہ: ”اللہ کی قسم اگر میں نے قریش سے اس نوجوان کو لے لیا تو اس کے ذریعے میں یقیناً پورے عرب کو فتح کر لوں گا۔“ پھر اس نے آپ ﷺ سے کہا: ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ اگر ہم تمہیں تمہارے اس معاملہ میں بیعت دیں اور تم اللہ کے فضل سے اپنے مخالفین پر غالب آگئے تو کیا اس کے بعد حکومت ہماری ہوگی؟“ تو جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((الأمر إلى الله يضعه حيث يشاء)) ”اقتدار اللہ کا ہے وہ جسے چاہے گا دے گا۔“ تو پھر ہجرہ نے کہا: ”تمہاری حفاظت میں ہم اپنے گلے کٹوانے کے لئے عربوں کے آگے رکھ دیں اور پھر جب اللہ تمہیں غالب کر دے تو عرب پر حکومت کسی اور کے حصہ میں چلی جائیگی؟ تو ہمیں تمہاری ایسی قوت و طاقت کی پیش کش کی ضرورت نہیں۔“

اب رسول اللہ ﷺ بس یہی عمل کرتے رہے کہ جب موسم حج میں لوگ جمع ہوتے تو اس وقت مختلف دیگر قبائل کو اللہ کی طرف بلاتے اور اسلام کی دعوت دیتے، اپنے آپ ﷺ کو ان کے

سامنے پیش کرتے، اللہ کی جو رحمت اور ہدایت آپ ﷺ لائے تھے ان کو وہ بتاتے، جب کبھی آپ ﷺ کو خبر ملتی کہ کوئی نامور اور معزز عرب آنے والا ہے تو آپ ﷺ کی توجہ اُس پر ہو جاتی اور آپ ﷺ اس کے پاس جاتے اور اس کو اللہ کی طرف دعوت دیتے اور پیش کش کرتے جو کچھ اللہ کی جانب سے آپ ﷺ پر نازل ہوا ہے یعنی اپنے آپ ﷺ کو اس کے سامنے طلب نصرت کے لیے پیش کرتے۔ رسول اللہ ﷺ جن قبائل کے پاس ملاقات کے لئے گئے اور انہیں دعوت دی اور اپنے آپ ﷺ کو ان کے سامنے پیش کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا ان قبیلوں کے نام اس طرح ہیں۔ (1) بنو عامر بن صعصعہ (2) محارب بن خضفہ (3) فزارہ (4) غسان (5) مرہ (6) حنیفہ (7) سلیم (8) عبس (9) بنو نضیر (10) بنو البکاء (11) کندہ (12) کلب (13) الحارث بن کعب (14) عذرہ (15) الحضارم۔

قبائل کی یہ فہرست ابن سعد کے مطابق ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ”الطبقات“ میں بیان کیا ہے۔

### مدینہ والوں نے دعوت قبول کر لی:

رسول اللہ ﷺ ہر سال مجنہ، عکاظ اور منیٰ میں عرب کے قبائل کو اللہ کی طرف بلاتے رہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کرتے کہ مجھے پناہ دیں تاکہ میں اللہ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچاؤں اور اس مدد کے بدلے انہیں جنت ملے گی۔ عرب کے کسی قبیلے نے آپ ﷺ کی پیشکش قبول نہیں کی، آپ ﷺ کو ستایا گیا اور رسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوئی کہ دین کو غالب کیا جائے، نبی ﷺ کی مدد کریں اور اپنے وعدے کو پورا کریں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کی ملاقات انصار کے قبیلہ سے کروادی، آپ ﷺ کی ملاقات انصار کے لوگوں کے ایک



ایسے گروہ سے ہو گئی جو اپنے سروں کو منڈوا رہے تھے۔ آپ ﷺ ان کے ساتھ جا بیٹھے اور ان کو اللہ کی طرف دعوت دی، ان کے سامنے قرآن کی تلاوت کی، ان لوگوں نے اللہ اور اللہ کے رسول کی اس دعوت کو فوراً قبول کر لیا، جلد ہی ایمان کی تصدیق کی اور آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ پھر یہ لوگ مدینے جا کر اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دینے لگے اور پھر مزید دوسرے لوگ بھی اسلام قبول کرنے لگے۔

اگلے سال موسم حج میں مدینہ سے بنو اوس اور بنو خزرج کے وہ بارہ افراد آئے جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے عقبہ (گھاٹی) کے مقام پر ان سے ملاقات کی۔ یہ عقبہ کی پہلی ملاقات تھی یہاں انہوں نے آپ ﷺ کو عورتوں والی بیعت (بیعت النساء) دی۔ ان کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے مصعب بن عمیر کو ان کے ساتھ مدینہ روانہ کیا۔ آپ ﷺ نے مصعب بن عمیر کو حکم دیا کہ ان کو قرآن پڑھائیں، ان کو اسلام سکھائیں اور ان میں دین کی سمجھ پھیلانیں۔ مصعب بن عمیر کو المقری (قاری) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ مصعب بن عمیر مدینہ جا کر اسعد بن زرارہ کے مکان میں قیام پذیر ہوئے، اس کے بعد یوں ہوا کہ اُسید بن حُصَیر اور سعد بن معاذ ایمان لے آئے، یہ دونوں افراد اپنی قوم کے سردار تھے، جب سعد بن معاذ نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے اپنی قوم سے سوال کیا: ”میرے بارے میں تم لوگوں کا کیا خیال ہے؟“ وہ کہنے لگے: ”آپ ہمارے سردار ہیں، ہم آپ کو ہم میں سب سے عمدہ رائے رکھنے والے اور بحیثیت سردار ہمیشہ صحیح راہ نمائی کرنے والا پاتے ہیں۔“ انہوں نے کہا: ”تمہارے مردوں اور تمہاری عورتوں پر مجھ سے بات کرنا اس وقت تک حرام ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لائیں۔“ اس کے بعد شام ہوتے ہوتے خاندان عبدالاشھل میں ایسی کوئی ایک عورت اور کوئی مرد باقی نہیں رہ گیا جو ایمان نہ لے آیا ہو۔

## عقبہ کی بیعت:

پھر مصعبؓ مکہ واپس لوٹے۔ موسم حج میں انصار میں سے کچھ مسلمان اپنی قوم کے کچھ مشرکین کے ساتھ جو کہ حج پر جا رہے تھے حج کے لئے مکہ کی طرف نکلے، انہوں نے ایام تشریق کے درمیانی دنوں کے دوران عقبہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ملاقات طے کر لی۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور پھر آپ ﷺ نے ان سے ملاقات کی، یہ کل 73 مرد اور 2 خواتین تھے۔ ملاقات کے وقت رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف آپ ﷺ کے چچا عباس تھے۔ اسعد بن زرارہ نے بیان کیا کہ: ”بات چیت میں پہلے رسول اللہ ﷺ کے چچا عباس نے یہ کہتے ہوئے کی کہ: ”اے خزعرج والو! تم لوگوں نے محمد (ﷺ) کو دعوت دی ہے۔ محمد (ﷺ) اپنی قوم میں سب سے شریف اور معزز ترین آدمی ہیں۔ اللہ کی قسم ہم میں سے وہ جو محمد (ﷺ) پر ایمان لائے ہیں وہ تو حفاظت کرتے ہی ہیں اور جنہوں نے نہیں لایا وہ بھی حسب و نسب اور شرافت کی وجہ سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔ لیکن محمد (ﷺ) نے دوسرے تمام لوگوں کا انکار کیا ہے اور تمہاری دعوت قبول کی ہے، اگر تم طاقت اور استقامت رکھتے ہو، جنگی تجربہ اور مہارت رکھتے ہو اور تمام عرب کی دشمنی کا اکیلے سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جو کہ تمہارے خلاف ایک ہو کر لڑیں گے تو پھر اچھی طرح سوچ لو تم جو بھی کرنا چاہتے ہو اور پھر کر گزرو، اس بارے میں اجتماعی فیصلہ کر کے آؤ، بے شک اچھی بات وہی ہے جو صاف اور سچی ہے۔“ انہوں نے کہا: ”آپ نے جو کہا ہم نے سن لیا، اے اللہ کے رسول ﷺ اب آپ ﷺ فرمائیے اور اپنے لئے اور اپنے رب کے لئے جو پسند ہو لے لیجئے۔“ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے گفتگو شروع کی، پہلے آپ ﷺ نے قرآن کی تلاوت کی پھر ان کو اللہ کی طرف دعوت دی اور اسلام قبول کرنے پر ابھارا، اور یہ شرط رکھ دی کہ تم اللہ ہی کی عبادت کرو گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے، پھر فرمایا: ((أَبَايَعُكُمْ عَلَى أَنْ تَمْنَعُونِي مِمَّا تَمْنَعُونَ مِنْهُ نِسَاءَكُمْ وَأَبْنَاءَكُمْ)) (سیرۃ

**ابن هشام)** ”میں اس بات پر تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم میری ایسی حفاظت کرو گے جس طرح اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہو۔“ البراء معرور نے بیعت دینے کے لئے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا : ہاں، اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو سچا نبی بنا کر بھیجا ہے ہم تمہاری اسی طرح حفاظت کریں گے جس طرح ہم اپنی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ آپ ہم سے بیعت لیں، اللہ کی قسم ہم جنگجو لوگ ہیں اور ہتھیاروں کے ماہر لوگ ہیں ہمیں اپنے بڑوں سے یہی وراثت ملی ہے۔ ابھی البراء بات کر رہے تھے کہ ابو الہیثم ابن التیہان نے مداخلت کی اور کہا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ) ہمارے اور ان لوگوں (یہود) کے درمیان معاہدے اور تعلقات ہیں، ہم ان تعلقات کو ختم کریں گے، اور پھر جب ہم یہ کر چکیں اور اللہ تعالیٰ آپ (ﷺ) کو غلبہ عطاء کر دے تو کیا آپ (ﷺ) اپنی قوم کی طرف لوٹیں گے اور ہمیں چھوڑ دیں گے؟“ رسول اللہ ﷺ مسکرائے اور فرمایا: ((بل الدم الدم، والهدم الهدم، أنا منكم وأنتم مني، أحارب من حاربتم وأسال من سالتم)) (سیرۃ ابن هشام) ”نہیں، بلکہ تمہارا خون میرا خون ہے، تمہاری میری تباہی ہے، میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ میں سے ہو، جس کے ساتھ تم لڑو گے اس کے ساتھ میں لڑوں گا اور جس کے ساتھ تمہاری صلح ہوگی اس کے ساتھ میری بھی صلح ہوگی۔“ چنانچہ انہوں نے کہا کہ: ”ہم آپ (ﷺ) کو بیعت کرتے ہیں اس بات پر کہ ہم اس کے لئے تیار رہیں گے کہ ہم مالی نقصانات اٹھانے اور ہمارے شرفاء کے ذبح کئے جانے کے لئے تیار ہیں۔“ پھر البراء نے کہا: ”اے اللہ کے رسول ﷺ اپنا ہاتھ پھیلائیے۔“ پھر تمام ستر (70) افراد نے آپ ﷺ کے دست مبارک پر ہاتھ رکھے اور یوں آپ ﷺ کو بیعت دی۔ جب لوگ بیعت دے چکے اور بیعت مکمل ہو گئی تو شیطان نے زور دار آواز میں عقبہ کے اوپر سے چیخ کر کہا: اے اہل اخشب (مکہ والوں) کیا تم چاہتے ہو کہ محمد اور صائبین (اپنا دین چھوڑ دینے والے) تمہارے خلاف ساتھ مل کر لڑائی لڑیں؟، یہ آواز سنی گئی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((أخرجوا لي منكم اثني عشر نقيباً ليكونوا كفلاء على قومهم ككفالة الحواريين لعيسى بن مريم- وأنا كفيل على قومي)) ”میرے لئے اپنے میں سے بارہ سردار منتخب کر کے دو تاکہ وہ عیسیٰ ابن مریم کے حواریوں کی طرح اپنی اپنی قوم کے معاملات کی ذمہ داری سنبھالیں اور میں اپنی قوم کا ذمہ دار ہوں۔“

انہوں نے بارہ نقيب (دونوں قبیلوں کے لئے سردار) منتخب کر لیے اور یوں اس خالص ایمانی ماحول میں یہ بیعت مکمل ہوئی۔ ان پر اس بیعت کے ایمانی ماحول کا اتنا اثر ہوا تھا کہ عباس بن عبدہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا آپ (ﷺ) اگر چاہیں تو کل ہی ہم اپنی تلواروں سے اہل منیٰ پر ٹوٹ پڑیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لم نؤمر بذلك، ولكن ارجعوا إلى رحالكم))۔ (سیرۃ ابن ہشام ) ”ہمیں اس کا حکم نہیں ملا ہے، تم اپنے کجاؤں کی طرف لوٹو۔“

جج کا موسم ختم ہوا، آئے ہوئے لوگ اب مکہ چھوڑ کر چلے گئے وہ مکہ جو غصہ میں تلملارہا تھا کیونکہ اہل مکہ کو اس بیعت کی خبر پہنچ گئی تھی۔ ابن سعد نے اپنی کتاب طبقات میں عروۃ سے اور عروۃ نے عائشہؓ سے روایت کیا ہے کہ: ”جب یہ ستر (70) افراد رسول اللہ ﷺ سے الگ ہو کر چلے گئے تو رسول اللہ ﷺ کو ایسا احساس ہوا تھا کہ اللہ نے آپ ﷺ کو ایک ایسی قوت کی پناہ دے دی ہے جو جنگجو قوم ہونے کے علاوہ آپ ﷺ کی اطاعت پر تیار اور آپ ﷺ کی مددگار ہے لیکن اس کے بعد مسلمانوں پر سختی اور آزمائش مزید بڑھ گئی۔ چنانچہ صحابہؓ نے اس کی شکایت کی اور ہجرت کی اجازت چاہی تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو ہجرت کرنے کی اجازت دے دی اور ساتھ ہی ان کو بتلایا کہ مجھے اس جگہ کی خبر بھی دی گئی ہے جہاں انہیں ہجرت کر کے جانا ہے (یہ جگہ یثرب یعنی مدینہ تھی) اور جو کوئی جانا

چاہتا ہے وہاں چلا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((رَأَيْتَ فِي الْمَنَامِ أَنِي أَهْجَرُ مِنْ مَكَّةَ إِلَى أَرْضِ بَهَا نَخْلٍ، فَذَهَبَ وَهَلِي إِلَى أَنَّهَا الْيَمَامَةُ أَوْ هَجَرَ، فَإِذَا هِيَ الْمَدِينَةُ يَثْرِبُ)) (البخاری ومسلم) ”میں نے خواب دیکھا کہ میں مکہ سے ایک ایسی جگہ ہجرت کر رہا ہوں جہاں کھجوریں ہیں، مجھے گمان ہوا کہ شاید یہ یمامہ ہے یا ہجر کا علاقہ ہے پھر پتہ چلا کہ وہ مدینہ (یثرب) تھا۔“

قبائل سے نصرت حاصل کرنے کی کوششیں اور پھر بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ یہ سب اشارہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک ایسا دھڑایا ڈھانچہ ایجاد کرنا چاہتے تھے جو طاقتور ہو اور آپ ﷺ کے دین کے لئے ایک مددگار اور مضبوط پناہ گاہ ہو۔ کیونکہ معاملہ اب فقط دعوت پھیلانے اور اس کی تبلیغ کی راہ میں مصیبتیں برداشت کرنے تک ہی محدود نہیں رہا تھا، اللہ کے دین کا معاملہ اس نقطہ پر پہنچ چکا تھا جبکہ ایک ایسی قوت کا وجود ضروری تھا جس کے ذریعے مسلمان اپنی حفاظت اور دفاع کر سکیں، حتیٰ کہ اب اس سے کہیں زیادہ بڑھ کر اس نقطہ پر آپہنچا تھا کہ ایک ایسا بیچ یا مرکز نقطہ قائم کر دیا جائے جو اسلامی ریاست کی سنگ بنیاد اور پہلا ستون بن جائے اور جو اسلام کو معاشرے میں نافذ کرے اور ایک عالمی پیغام کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرے اور ساتھ ہی اپنے پاس وہ قوت و طاقت رکھے جو اسلام کی حفاظت کرے اور ہر اس مادی رکاوٹ کو ہٹائے جو اسلام کی تبلیغ کے راستے میں کھڑی ہوتی ہو۔ چنانچہ ہجرت واقع ہوئی اور اس ہجرت کے لئے مہاجرین نے کئی قربانیاں دیں، جن میں مال و جائداد، اپنے وطن اور بیوی بچوں سے ہاتھ دھونا بھی شامل تھا۔ مدینہ کی طرف کی گئی یہ مخصوص ہجرت حبشہ کی ہجرت سے بالکل مختلف تھی۔

حبشہ کی طرف ہجرت ایسے کچھ افراد کی ہجرت تھی جو اپنے دین کو بچانے کی غرض سے فرار ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہجرت کو مسلمانوں کے لیے تشدد اور ایذاؤں سے بچنے کی ایک صورت

بنائی تاکہ وہ اپنے حالات بدل لیں اور ظلم و تشدد کی چکی میں نہ پستے رہیں بلکہ ان کی جانوں کو کچھ راحت مل سکے اور پھر وہ دین کی دعوت کو دوبارہ مستحکم اور سرگرم انداز میں انجام دینے کے لیے تازہ دم ہو جائیں، لہذا حبشہ کی یہ ہجرت نبوی دعوتی طریقہ کار کا کوئی مرحلہ نہیں بنتی ہے کہ جس کے دوران باہر سے مہاجرین کام کریں یا جس ریاست میں انہوں نے ہجرت کی ہو اس مملکت کی مدد یا تعاون سے ان کے اپنے وطن میں حکومت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

### مدینہ کی جانب ہجرت:

مدینہ کی جانب ہجرت دراصل رسول اللہ ﷺ کی دعوت اسلامی کا ایسا نقطہ اور موڑ بنتا ہے جب یہ نبوی دعوت گفتگو، بحث اور صبر کے دائرہ سے نکل کر اسلام کے نفاذ کا انداز اختیار کر لیتی ہے جو اسلامی ریاست کو قائم کرنے کے بعد انجام دیا گیا۔ یہ ہجرت دارالکفر سے دارالاسلام کی طرف نقل مکانی ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں قائم کیا۔ جہاں اسلام کی دعوت و تبلیغ یکسر مختلف انداز سے انجام دی جائے گی، اب یہ دعوت، اسلامی ریاست کے ذریعے انجام دی جائے گی جو اسلام کے ذریعے حکومت کرے گی، اسلام کو نافذ کرے گی اور حجت، دلائل و حقائق کے ساتھ اسلام کی طرف دعوت دے گی اور ریاستی قوت و طاقت جو دعوت کی مخالف باطل طاقتوں سے اس کی حفاظت کرے گی، ریاست اس کی مدد سے دعوت کو پھیلائے گی۔

جب نبی کریم ﷺ مدینہ پہنچے تو اس کی بڑی آبادی آپ ﷺ کے استقبال کو پہنچی، پہلی چیز جو آپ ﷺ نے وہاں انجام دی وہ ایک مسجد کی تعمیر تھی، مسجد نماز اور مشورے کی جگہ تھی جس کا استعمال مسلمانوں کے معاملات کو چلانے کے لئے کیا جاتا، تنازعات میں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے

کے لئے کیا جاتا، اس کے علاوہ آپ ﷺ نے مدینہ کی فضاء اور ماحول کو قتال کے لیے تیار کرنا شروع کیا، آپ ﷺ نے ان کے لئے سرایا تیار کئے، ان کے امیر مقرر کئے اور مدینہ کے باہر انہیں معرکے انجام دینے کے لئے بھیجا، آپ ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ معاہدے پر دستخط کئے، الغرض نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں ایک حاکم کی تمام ذمہ داریوں کو انجام دینا شروع کر دیا، جو ایک ریاست کے سربراہ کے ذمہ ہوتی ہیں۔

یہ ہیں وہ افعال جن کو رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا، حتیٰ کہ دارالاسلام قائم کیا گیا، چنانچہ آپ ﷺ کے اعمال میں سے ہم پر کون سے اعمال فرض ہیں جن کو انجام دینا ہم پر بھی لازم ہیں؟

لازم ہے کہ ہم آپ ﷺ کی زندگی کی پیروی کریں۔ چونکہ اسلامی ریاست کے لئے کام کرنا فرض ہے، لہذا اس راستہ کی پیروی کرنا، جس پر آپ ﷺ چلے، بھی فرض ہو جاتا ہے کیونکہ نازل کردہ فرض حکم کی تشریح میں اس کو سمجھانے کے لئے آپ ﷺ کے ذریعے کئے گئے افعال بھی اصل حکم کی طرح فرض ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ {یوسف: 108} ”(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: ”یہ میرا راستہ ہے۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی اور اللہ پاک ہے اور میں مشرکوں میں نہیں۔“

اس لئے ہم پر فرض ہے کہ ہم بھی اپنے کام کو دو مختلف ذمہ داریوں یا دو مختلف ادوار میں تقسیم کریں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا:

— تربیت اور تاسیس کا مرحلہ

## -تفاعل اور جدوجہد کا مرحلہ

پہلے مرحلے میں ان اعمال کو انجام دینا ہم پر بھی لازم ہے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے انجام دیا ہے، یہ اس طرح کیا جائے کہ جو بھی اس دعوت کی ذمہ داریاں اٹھانے کو قبول کرے، اس کو اسلامی تربیت فراہم کرنا اور ان کے اندر منفرد اسلامی شخصیت کی تعمیر کرنا اور ایسی اسلامی شخصیتیں تب قائم ہونگی جب ان کے اندر روشن اسلامی عقلیہ (ذہنیت) کے ساتھ ساتھ بہترین اسلامی نفسیہ (برتاؤ) کی تشکیل ہوگی۔ اس کام کو سنجیدہ اور منظم حلقات کے ذریعے انجام دیا جائے گا۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے اور یہ دیکھے بغیر کہ اس شخص کی عمر یا اس کا رتبہ کیا ہے، مرد ہے یا عورت، قومیت اور حسب و نسب کیا ہے، آپ ﷺ ہر اس شخص کو دعوت دیتے تھے جس کے اندر اس دعوت کو قبول کرنے کی صلاحیت اور آمادگی پاتے تھے اور اسی بنیاد پر یہ افراد ایک جماعت کی شکل میں ڈھلتے جاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران ہم یہی عمل کریں گے جب تک اس نوزائیدہ جماعت کے اندر مندرجہ ذیل باتیں پیدا نہ ہو جائیں۔

1- اس کے افراد اسلامی ثقافت میں بالیدگی اختیار کر لیں یعنی ان کی عقلیہ (ذہنیت) اور ان کی نفسیہ (برتاؤ اور جذبات) اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے، اور پھر اس شعور اور کیفیت کے نتیجہ میں وہ معاشرہ کے فساد کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں۔

2- جماعت (کے لئے مشکل ہو) یہ ضبط ہی نہ کر سکے کہ یہ دعوت صرف ان کی ذات تک محدود و محبوس ہو کر رہ جائے۔ لہذا وہ لوگوں تک اسے پھیلا نا شروع کر دیں جو کچھ وہ جانتے ہوں، دعوت کی شروعات وہ پہلے ان لوگوں سے کرتے ہوں جن کے اندر وہ بھلائی دیکھتے ہوں اور پھر اس دعوت کا دائرہ مزید وسیع کریں۔



3- عام لوگوں کو ان افراد کی دعوت، ان کی موجودگی اور مجمع کا احساس ہوتا ہو۔

جوں ہی یہ تینوں باتیں موجود ہو جائیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی صحابہؓ کے اندر موجود تھیں تب ہم دوسرے دور یا دوسرے مرحلے کی طرف روانہ ہوں گے۔

اس مرحلے میں دعوت کو کھلے عام کر دینا ہم پر فرض ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا، اس دوران ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ موجودہ معاشروں کے مد مقابل ہو جائیں اور ان کے افکار، عادات اور نظاموں کو لٹکاریں اور ان کی بُرائیوں اور بگاڑ کو بیان کریں اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے متبادل کے طور پر اسلام کے افکار و نظریات اور نظاموں کو صاف صاف بیان کریں۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم دعوت دیں تو اسی طرح جس طرح آپ ﷺ نے دعوت دی، اسی صراحت، جرأت اور استقامت کے ساتھ دعوت دیں جیسا کہ رسول اللہ ﷺ دیتے تھے، یعنی ایسا کرتے ہوئے ہم نہ کمزور پڑیں گے اور نہ ہی عاجز بنیں گے، نہ ہی خوشامد کریں گے اور نہ ہی سمجھوتہ کریں گے، اور نہ ہی رسم و رواج، مذہب و عقائد، نظریات زندگی، حکمران یا عوام کی بھیڑ یا اکثریت کو کسی شمار میں لائیں گے، ہمیں اسلامی دعوت کا علمبردار بننا ہو گا تاکہ اسلامی آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) مطلقاً غالب ہو جائے خواہ لوگ اس کے موافق ہوں یا مخالف اور خواہ یہ لوگوں کے رواج کے مطابق ہو یا مخالف، لوگ اس کو قبول کرتے ہیں یا اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ بلکہ اس دوران صرف اسلامی مبداء (نظریہ حیات / آئیڈیالوجی) کو مضبوطی سے تھاما جائے گا، چاہے اس کے لئے صبر اختیار کرنا پڑے جب تک کہ لوگ اس کے مطابق تبدیل نہ ہو جائیں۔ اور جب قوم کے سردار اس دعوت کے راستے میں رکاوٹ بنیں گے جس طرح رسول اللہ ﷺ کے دور میں قوم کے سرداروں نے کیا تھا تو جماعت پر لازم ہو جائے گا کہ ان کے خلاف سیاسی جدوجہد اختیار کرے، اس سیاسی جدوجہد کا طریقہ کاریہ ہو گا کہ اس دوران ان سرداروں، ان کی

چالوں، ان کی وفاداریوں اور ان کی سازشوں کو بے نقاب کیا جائے گا اور ان پر کاری ضرب لگائی جائے گی جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں کیا تھا۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ قرآن نے اس دوران مخالفین سرداروں پر کس طرح حملے کئے ہیں۔

قرآن نے ابو لہب کا نام لے کر اس پر حملہ کیا: ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ ۚ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ ۚ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ...﴾ {الہب: 1-3} ”ابو لہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ ہوا، اس کے کام نہیں آئے گا اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا ہے، وہ عنقریب شعلے والی آگ میں پھینکا جائے گا۔“

حالانکہ یہ شخص بنو ہاشم کا بڑا معزز اور رتبے والا آدمی تھا۔ اسی طرح قرآن نے بنی مخزوم کے سردار ولید بن المغیرہ کو ان الفاظ میں دھمکی دی جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا ۚ وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَمْدُودًا﴾ {المدثر: 11-12} ”اس شخص کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا اور اس کو بہت سامان دے رکھا تھا۔“

اسی سورۃ میں آگے مزید فرمایا: ﴿سَأُصْلِيهِ سَقَرَ﴾ {المدثر: 26} ”میں عنقریب اس کو سقر (جہنم) میں جھونک دوں گا۔“

اور سورۃ ن والقلم و ما یسطرون میں اسی کے بارے میں فرمایا: ﴿عُتِلَّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٌ﴾ {القلم: 13: 68} ”سخت ظالم اور سنگ دل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ناجائز بے نسب (ولد الزنا) بھی ہے۔“

اور ابو جہل کے بارے میں کہا گیا : ﴿كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ﴾  
 نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ﴾ ( العلق : 15-16 ) ”خبردار! اگر وہ باز نہ آیا، تو ہم (اسے)  
 پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹیں گے، اُس پیشانی کے بال جو جھوٹی ہے، گنہگار ہے۔“

ہماری دعوت ایسی ہونا فرض ہے کہ اس سے ہم دوسروں کی ہدایت اور بھلائی کے طلب  
 گار ہوں جس طرح رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں دوسروں کی ہدایت کی چاہت نظر آتی تھی، رسول  
 اللہ ﷺ نے اس مرحلے میں بھر پور جدوجہد کی کہ لوگوں کو اسلامی مبداء (نظریہ حیات  
 / آئیڈیالوجی) اچھی طرح سمجھا دیں تاکہ اسلام ہی ان کا طریقہ زندگی بن جائے اور ان کی زندگی کا مقصد  
 بن جائے، دوسرے لفظوں میں ہم چاہیں گے کہ جو دعوت ہم انہیں دیں لوگ اچھی طرح یقین کر لینے  
 کے بعد اسے اختیار کریں اور اسلام ہی سے مطمئن رہیں۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ کو نظر انداز کیا گیا، مخالفت اور رکاوٹیں پیدا کی گئیں، ملک بدر  
 کیا گیا، آپ ﷺ کے خلاف افواہیں پھیلانی گئیں اور بائیکاٹ کیا گیا تھا، یہی کچھ آج ہمارے ساتھ ہوتا  
 ہے۔ اس دوران صحابہ کس قدر مجبور کئے گئے حتیٰ کہ انہوں نے اسلحے کے استعمال کی ضرورت محسوس  
 کی اور اس کے لئے رسول اللہ ﷺ سے اجازت مانگی اور آپ ﷺ نے یہ فرماتے ہوئے انہیں منع کیا  
 کہ: ((إِنِّي أُمِرْتُ بِالْعَفْوِ، فَلَا تَقَاتِلُوا الْقَوْمَ)) ”مجھے عفو درگزر کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے  
 تم ابھی لوگوں سے قتال نہ کرو۔“

اسی طرح ہم پر بھی فرض ہے کہ ہم اسلحہ رکھنے سے باز رہیں اور قوت و اقتدار حاصل کرنے  
 کے لئے طلب نصرتہ کی کوششیں کئے بغیر اسلحہ کا استعمال نہ کریں۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ نے تیسرے دور میں جو کہ اسلام کے غلبہ و اقتدار کا دور ہے داخل ہونے کے لیے نصرت طلب کی تھی اسی طرح ہم پر فرض ہوتا ہے کہ ہم نصرت طلب کریں تاکہ اس کے ذریعے ہم حکومت تک پہنچ جائیں، رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ہمیں اس حکم کا پتہ چلتا ہے۔

## طلب نصرة:

آئیں اب ہم طریقہ سے متعلق احکامات میں سے ایک اہم ترین حکم (طلب نصرة) کے بارے میں کچھ جان لیں۔ ہم اس پر دوبارہ غور کریں اور وہ کچھ اخذ کریں جو ہمارے لئے ضروری ہے۔ بالخصوص جبکہ مختلف لوگ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن طلب نصرة کے حکم پر تھوڑی بھی توجہ نہیں دیتے، گویا یہ ایک فروعی معاملہ ہے جس کا کوئی وزن ہی نہیں، کوئی اہمیت نہیں یا پھر جیسے اس کی اسناد (روایات کا سلسلہ) ضعیف ہے جس سے حکم لینا جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے اس رویے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس حکم کو ہی نشانہ بناتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل کرتے ہیں ان پر تنقیدیں کرتے ہیں۔ حالانکہ نبی ﷺ کی سیرت پر موجود تمام کتابوں نے اس حکم پر بحث کی اور اس کی تفصیل میں تھوڑے فرق کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے، یہ فرق قابل ذکر نہیں۔ یہ بات قابل غور ہے کہ اس دور کے سیرت نگاروں کا تعلق آج کی کسی جماعت سے نہیں تھا بلکہ ان کو تو موجودہ مختلف جماعتوں کا علم بھی نہ تھا اس کے باوجود انہوں نے رسول ﷺ کی سیرت میں آپ ﷺ کے طلب نصرة کے عمل کو بیان کیا اور بحث کی ہے اور خود قرآن نے ان لوگوں کا یوں ذکر کیا جنہوں نے نصرت دی تھی: ﴿آوُوا وَنَصَرُوا﴾ (الانفال: 72) ”اور جنہوں نے پناہ دی، اور ان کی مدد کی“۔ اور

نصرت یاد د کرنے والوں کو دوسرے مقام پر یوں کہا: ﴿الْأَنْصَارِ﴾ (التوبہ : 100) ”نصرت دینے والے“

قرآن کا یہ ایسا بیان ہے جو (نصرت کا) کام کرنے والوں کی تعریف میں ہے اور ان کی اہم ترین صفت کا بیان ہے۔

جو بھی آپ ﷺ کی سیرت پر غور کرتا ہے وہ یہ جان لے گا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سرداروں سے نصرت طلب کی تھی، جو قوت اور طاقت رکھتے تھے۔ باوجود اس کے کہ ایک قبیلے کے بعد دوسرا قبیلہ انکار کرتا ہے، آپ ﷺ برابر طلبِ نصرت پر اصرار کرتے رہے اور بار بار اس عمل کو دہراتے رہے اور تھک کر ہار نہیں مان لی۔ ابن سعد نے اپنی طبقات میں ایسے 15 قبیلوں اور سرداروں کا ذکر کیا ہے جن سے رسول اللہ ﷺ نے نصرت طلب کرنے کے لیے ملاقاتیں کی تھیں۔

رسول اللہ ﷺ کا اس طرح مستقل طور پر بار بار اس عمل کو دہرانا اگر کچھ اشارہ دیتا ہے تو وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی یہ صبر آزما مسلسل کوشش اس بات کی انتہائی واضح دلیل ہے کہ ”طلبِ نصرت“ رسول اللہ ﷺ کو اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے حکم ملا تھا جس کو ادا کرنا آپ ﷺ پر لازم تھا۔

دوسرا یہ کہ جنہوں نے آپ ﷺ کی یہ دعوت سنی اور لبیک کہتے ہوئے آپ ﷺ کی مدد کی، قرآن کا ان لوگوں کو ”انصار“ کے لقب سے نوازا، ایک مزید اضافی دلیل ہے۔ قرآن نے ایک سے زائد مختلف مقامات پر ان لوگوں کی تعریف کی اور ان کے ساتھ اللہ نے مغفرت کا معاملہ کیا ہے۔ اور رُتبہ کے لحاظ سے مہاجرین کے بعد ان ہی لوگوں کا مقام و مرتبہ ہے۔

روایات میں طلب نصرة کے عمل سے متعلق الفاظ جس انداز میں آئے ہیں ان سے بھی یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ ایک شرعی حکم ہے۔ چنانچہ اسی لئے رسول اللہ ﷺ مختلف قبائل سے یہ فرماتے رہے: ((يا بني فلان اني رسول الله اليكم، يأمرکم أن تعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً، وأن تخلعوا ما تعبدون من دونه من هذه الأنداد، وأن تؤمنوا بي و تصدقوا بي و تمنعوني حتى أبين عن الله ما بعثني به)) (سیرہ ابن ہشام) ”اے فلاں کے بیٹو! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، (اللہ) تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو اس سے باز آؤ، مجھ پر ایمان لاؤ، میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو تاکہ میں اس چیز کو بیان کروں جس کو اللہ نے مجھے دے کر بھیجا ہے۔“

یہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا امر یعنی فیصلہ ہے اور امر حکم شرعی ہوتا ہے۔ شرعی حکم کو انجام دینے کے لیے مناسب اُسلوب اختیار کئے جاتے ہیں جو مباح ہیں۔ حکم اُسلوب نہیں ہوتا کہ ایک حکم کو کسی اُسلوب سے بدلا جاسکے، اُسلوب ہی اُسلوب سے بدل سکتا ہے۔ ان شاء اللہ اس پر تفصیل آگے کی جائیگی۔

پھر وہ گفتگو اور مباحثے جو رسول اللہ ﷺ اور ان لوگوں کے درمیان ہوئے جن سے آپ ﷺ نصرة طلب کر رہے تھے اور اسی طرح عقبہ کی دوسری بیعت کے دوران بیعت کرنے والوں کے ساتھ آپ ﷺ کی جو گفتگو ہوئی ان سے صاف اور واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس عمل کے پیچھے مقصد کیا تھا اور جس کی تکمیل کے لئے آپ ﷺ مسلسل جدوجہد کیا کرتے تھے، طلب نصرة کے پیچھے آپ ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ اس عمل کے ذریعے دین کو قائم کیا جائے اور ایسی ریاست قائم کی جائے، جو اس دین کی حفاظت کرے، اس کو نافذ کرے اور اس کی تبلیغ کرے یعنی اس کو

پھیلانے۔ طریقے کے اس حکم کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہی وہ حکم ہے جس کے ذریعے دعوت کی شکل تبدیل ہو گئی اور اسی حکم نے دعوت کو اس کے اپنے دار (وطن) میں پہنچایا جہاں اسلام کو نافذ کیا جاتا ہے اور اس کی دعوت کو پھیلایا جاتا ہے۔ اگر ہماری دعوت کا مقصد بھی وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کا مقصد تھا تو اس طریقہ عمل کو نظر انداز کرنے کی پھر کیا وجہ ہوئی؟

کفار یہ سمجھتے تھے کہ طلب نصرتہ کی سرگرمیوں کے بعد بیعت یا عہد لیا جائے گا جو اس دین کو غالب کرنے کے مقصد سے ہو گا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بنو عامر بن صعصعہ قبیلہ نے یہ جان لیا تھا کہ اس معاملہ کا تعلق قوت و اقتدار سے ہے۔ یہ بھی دیکھنے کے کفار مکہ کس طرح غصے سے پاگل ہو گئے جب انہیں عقبہ کی دوسری بیعت کے متعلق خبر ملی اور پھر انہوں نے مدینہ کے لوگوں سے کہا: ”اے خزرج کے لوگو! ہمیں خبر ملی ہے کہ تم ہمارے صاحب کی طرف آئے تھے اور تم ان کو ہمارے درمیان سے نکال لے جا رہے ہو اور ہم سے جنگ کرنے کے لیے ان سے بیعت کرتے ہو۔“ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیعت عقبہ ثانیہ ہونے کے بعد شیطان انتہائی اونچی آواز میں چیختے ہوئے کیا کہتا ہے: ”اے اخاشب والو! کیا تم چاہو گے کہ تمہاری اس لڑائی میں محمد اور صابئین (توحید پرست) تم سے مل کر لڑیں؟“

بیعت عقبہ ثانیہ کے دوران البراء نے کہا تھا: ”اے اللہ کے رسول (ﷺ)، ہمیں بیعت کیجئے، اللہ کی قسم ہم جنگجو اور ہتھیاروں سے لیس لوگ ہیں۔“ اور ابو الہیثم بن التیہان نے کہا: ”اے اللہ کے رسول (ﷺ)، ہمارے اور ان لوگوں (یہودیوں) کے درمیان معاہدے ہیں، اب ہم ان کو توڑنے

جارہے ہیں، تو اگر اللہ آپ (ﷺ) کو غالب کر دے تو آپ (ﷺ) ہمیں چھوڑ کر اپنی قوم کی طرف لوٹ جائیں گے؟“

اسعد بن زرارہ نے کہا: ”یقیناً آج انہیں (رسول ﷺ کو) یہاں (مکہ) سے نکال لے جانے کا مطلب ہوگا، تمام عرب کو لکارنا اور انہیں دشمن بنالینا اور اپنے معززین (اشراف) کو ذبح کروانا اور یہ کہ تلواریں تم کو کاٹ ڈالیں۔“ عباس بن عبدہ کا یہ کہنا کہ: ”اگر آپ (ﷺ) چاہتے ہیں تو ہم اہل منیٰ پر اپنی تلواروں سے ٹوٹ پڑیں۔“ رسول اللہ ﷺ نے ابوالہیثم کو یہ کہہ کر جواب دیا: ((بل الدم الدم، والهدم الهدم، أنا منکم وأنتم منی، أحارب من حاربتم وأسالم من سالمتم)) (سیرۃ ابن ہشام) ”نہیں، بلکہ تمہارا خون میرا خون ہے، تمہاری تباہی میری تباہی ہے، میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ میں سے ہو، جس کے ساتھ تم لڑو گے اس کے ساتھ میں لڑوں گا اور جس کے ساتھ تمہاری صلح ہوگی اس کے ساتھ میری بھی صلح ہوگی۔“

حضرت عائشہؓ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہتی ہیں کہ ”رسول اللہ ﷺ اس پر مطمئن اور خوش ہوئے کہ اللہ تعالیٰ نے مدد عطا کی اور ایک جنگجو قوم، ہتھیاروں سے لیس آپ (ﷺ) کی مددگار بنادی۔“ اسی طرح غور کیجئے کہ ابن ہشام رسول اللہ ﷺ کے متعلق طلب نصرہ کے موضوع پر بات کرتے ہوئے کیا کہتے ہیں: ”جب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو سہارا دینے اور اپنے دین کی نصرت کا ارادہ فرمایا تو آپ ﷺ کو انصار کے لوگوں سے جاملایا۔“

مذکورہ تمام الفاظ طلب نصرۃ کے حکم کی اہمیت پر واضح دلالت کرتے ہیں، یہ الفاظ ایسے ہیں کہ ان جملوں کو دوسرے کسی بھی معنی میں بدلنے نہیں دیتے مثلاً یہ کہ کسی شخص یا قوم کو اسلام کی دعوت دی جائے اور وہ قبول کر لے تو اس نے ”دین کو نصرت“ دی ہے۔ کیونکہ یہ الفاظ جیسے کہ بیعت،



انظہارِ دین (دین کا غلبہ)، نصرت (مدد)، جنگ، عزت داروں (اشراف) کو قتل کیا جاوے گا، انہیں تلواروں سے کاٹ دیا جائے گا، اس میں تمام عرب کے لئے لکار موجود ہے، وہ آپ ﷺ کی ایسی حفاظت کریں جس طرح اپنی عورتوں اور اپنی اولادوں کی حفاظت کیا کرتے ہیں، یہ تمام الفاظ طلب نصرہ کے حکم کی وہی شکل و صورت اور طریقہ بتلاتے ہیں جس طرح رسول اللہ ﷺ نے طلب نصرہ کیا تھا، یعنی دین کی مدد و حمایت، خواہ اس کے لئے قوت استعمال کرنا پڑے، تاکہ دین کو پہنچایا جائے، اور وہ اسلامی ریاست قائم کی جائے جو دین اور اس کے داعیوں کی حفاظت کرے اور اسلام کے احکامات کو نافذ کرے اور پوری دنیا میں اسلام کے پیغام کو پہنچائے۔

اس معاملہ میں یہ دیکھا جائے کہ رسول اللہ ﷺ نے :

1- افراد اور دعوت دونوں کی حفاظت کے لیے پناہ اور حمایت طلب کی تھی، یہ مدد مشرکین سے بھی لی جاسکتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے لی تھی اور چچا نے آپ ﷺ کی حمایت اور مدد کی اور ہر کسی کو آپ ﷺ کو نقصان پہنچانے سے روکا۔ اور پھر جیسا کہ طائف سے لوٹنے کے بعد مُطعم بن عدی نے آپ ﷺ کو امان دے کر مدد کی۔ لیکن یہ مدد بھی اس صورت میں لی جاسکتی ہے کہ اس مدد سے مسلمان پر کسی قسم کا دباؤ یا دین سے متعلق کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ چنانچہ جب آپ ﷺ کے چچا نے دعوت میں ذرا نرمی لانے کا مطالبہ کیا تو اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا سے یہ فرمایا: ((واللہ یا عماہ لو وضعوا الشمس فی یمینی و القمر فی یشاری علی أن أترك هذا الأمر ما ترکته حتی یظہرہ اللہ أو أہلک دونہ)) (سیرہ ابن ہشام) ”اے چچا جان! اللہ کی قسم! اگر یہ مشرکین سورج کو میرے دائیں ہاتھ میں رکھیں اور چاند کو میرے بائیں ہاتھ میں رکھیں تاکہ میں اس دعوت سے باز آجاؤں، تو بھی ہر گز میں باز

نہیں آؤں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اس دین کو غالب کر دے یا یہ کام کرتے کرتے مجھے موت آجائے۔“

2۔ رسول اللہ ﷺ سرداروں سے ملاقاتیں کرتے تھے اور یہ تمنا کرتے تھے کہ وہ ایمان قبول کر لیں تو شاید ان کے ایمان لانے کی وجہ سے ان کے اطراف اور پس پشت جو حمایتی ہیں وہ لوگ بھی ایمان لائیں گے، آپ ﷺ کا ایسا کرنے کا مقصد دعوت کو آسانی کے ساتھ پھیلانا تھا اور یہ کہ لوگوں کے درمیان اسے زیادہ قبولیت حاصل ہو اور وہ ایک عام دعوت بن جائے، اس کے علاوہ یہ عمل مقبول عوامی گروہ تیار کرنے میں بڑا کردار ادا کرتا ہے۔

3۔ طلب نصرہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ان افراد سے کی تھی جو قوت اور طاقت رکھتے تھے اور اس کے لیے اسلام کو شرط قرار دیا تھا، جیسا کہ عقبہ کی دوسری بیعت (عقبہ ثانیہ) کے دوران ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اہل قوت سے نصرت طلب کی گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ کی حقیقت یہ تھی کہ اس وقت ان لیڈروں سے نصرت طلب کی جاتی تھی جو قوم کا سردار ہونے کے ساتھ ساتھ عوام میں عام طور پر مقبول ہوتے تھے یعنی ان کے پاس عوامی طاقت بھی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں لیڈر یا رہنما حکمران بھی ہوا کرتا تھا اور جنگ میں قائد بھی ہوتا تھا اور رہنمائی کے لئے بھی اس کی رائے کی طرف لوگ رجوع کرتے تھے اور اس کی رائے پر سب لوگ اتفاق کرتے تھے۔

آج کے حکمران صرف طاقت کے بل بوتے پر حکومت کرتے ہیں اور اس کے پاس عوامی مقبولیت نہیں ہوتی، بظاہر ان کی جو عوامی مقبولیت نظر آتی ہے وہ اکثر حقیقی نہیں ہوتی۔ ہماری دعوت میں اس ضمن میں ہمیں وہ عمل کرنا چاہیے جو رسول اللہ ﷺ نے کیا یعنی ان لوگوں سے رابطہ کرنا ہم پر

فرض ہے جو معاشرے میں اثر و رسوخ رکھتے ہیں تاکہ وہ دعوت کے دروازے اپنے لوگوں کے لئے کھولیں اور یوں ان کے اطراف موجود حمایتی لوگوں کے لئے دعوت قبول کرنا آسان ہو جائے، یوں دعوت کے لئے عوامی مقبولیت حاصل کی جائے۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم اہل قوت جیسے جبرلوں وغیرہ سے نصرت طلب کریں تاکہ حکومت تک پہنچا جائے۔ جب جماعت کے افراد پر تکلیف اور سختی میں اضافہ ہو جائے تو ایسی صورت میں ان کے ساتھیوں اور جان پہچان والے افراد سے پناہ طلب کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے، لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ اس میں پناہ لینے والے افراد کے ایمان پر کوئی خطرہ یا اس پر دباؤ نہ ڈالا جائے، اگر ہم اس طرح یہ عمل کریں گے تو ہم رسول اللہ ﷺ کی پیروی کریں گے اور موجودہ حالات میں رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنے والے ہوں گے۔

یہی وہ طریقہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اختیار کیا اور یہی وہ طریقہ ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں اختیار کرنا ہم پر فرض ہو جاتا ہے۔ اس عمل سے ہمیں جو نتائج حاصل ہونگے وہ یہ ہیں۔

1- شباب جو اچھی طرح تیار ہو چکے ہونگے جن کے ہاتھوں اسلام نافذ ہو سکے گا، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کو تیار کیا تھا جنہوں نے مکہ میں دعوت پھیلانے کی ذمہ داری سنبھالی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مل کر ریاست کے قیام اور پھر آپ ﷺ کے بعد امت کی قیادت کی ذمہ داری بھی انہوں نے اپنے کندھوں پر اٹھائی۔

2- اسلامی فکر کی حمایت میں رائے عامہ حاصل ہو جائے گی جو عام بیداری سے پیدا ہوتی ہے، یعنی ایسا عوامی گروہ تیار کرنا جو اسلام کے علاوہ کسی اور نظام کو حکومتی نظام قبول کرنے پر راضی نہ ہو اور اسلام کے نافذ ہونے کی صورت میں اس کو دل و جان سے اپنائے، جیسا کہ اہل مدینہ کے ساتھ ہوا انہوں نے اسلام کو چاہا اور اس کے لیے جینے مرنے کو تیار ہوئے۔

3۔ پناہ دینے والے اور اہل قوت و طاقت جن کے ذریعے ہم اقتدار حاصل کریں گے۔

جب ہم یہ تمام کام کر چکے ہونگے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے اس طریقے پر کاربند ہو کر پیروی کی ہے جو آپ ﷺ نے اختیار کیا تھا، جب کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے شریعت کی پابندی کرنے والے مومنوں سے نصر (امداد) کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الروم : 47) ”اور ہم نے یہ ذمہ داری لی تھی کہ ایمان والوں کی مدد کریں گے۔“

مزید فرمایا: ﴿وَلَيَنْصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنْصُرُهُ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ﴾ {الحج : 40} ”اور اللہ یقیناً ان کی مدد کرے گا جو اللہ کے (دین) کی مدد کرتے ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوتوں والا بڑے غلبے والا ہے۔“

اور فرمایا: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (النور: 55) ”تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور اُن کے لئے ان کے دین کو ضرور اقتدار بخشے گا، جسے اُن کے لیے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے، اس کے بدلے انہیں ضرور امن عطا کرے گا۔ (بس) وہ میری عبادت کریں۔ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔“

## طریقہ اور اسلوب کے درمیان فرق:

اب جو سوال کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں جو کچھ کیا اور کہا، کیا وہ تمام اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ وحی سمجھی جائے گی کہ جس کی وجہ سے ان کی پابندی کرنا ہم پر واجب ہوتا ہے؟ یا کچھ افعال اور اقوال ایسے بھی ہیں جو وحی کا حصہ نہیں ہیں کہ جس کی وجہ سے ان میں آپ ﷺ کی پیروی کرنا ہم پر فرض نہیں ہے؟

یہیں سے طریقہ، اسلوب اور وسیلہ کی بحث شروع ہوتی ہے۔

ایک سوال یہ بھی یہاں پیدا ہوتا ہے کہ کیا طریقہ (جو شرعی احکام کا مجموعہ ہے نہ کہ اسالیب کا مجموعہ) پر ایسا حکم لگانا جائز ہے کہ یہ تجربہ کی بنیاد پر اختیار کیا جاسکتا ہے، پس اگر تجربہ ہونے کے بعد کوئی نتیجہ ہاتھ آئے، تو اس کے صحیح طریقہ ہونے کا حکم دیا جائے گا ورنہ اس کو غلط سمجھا جائے گا؟

پہلے معاملہ سے متعلق

ہم کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کریں اور ہر وہ چیز جو آپ ﷺ نے کہی یا کی ان اعمال و اقوال کی اتباع اور پیروی کریں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۖ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ (النجم: 4-3) ”یہ (رسول) اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتے، یہ تو خالص وحی ہے جو ان کے پاس بھیجی جاتی ہے۔“

اور اس کے علاوہ مزید فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ﴾ (الحشر: 7) ”اور رسول تمہیں جو کچھ دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں، اُس سے رُک جاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو۔“

یہاں (ما) عموم کے الفاظ میں سے ہے، اس لیے کوئی بھی چیز جو رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے لائے ہیں (یعنی اسے ہم تک پہنچائے ہیں) وہ چیز اتباع اور پیروی کے اس دائرے سے خارج نہیں، جب تک کوئی ایسی شرعی دلیل موجود نہ ہو جو اس عام حکم کو صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص بتلائے۔

کچھ ایسے دلائل بھی وارد ہوئے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے بعض اقوال و افعال کو آپ ﷺ کی پیروی کرنے کے حکم سے خارج (مستثنیٰ) کر دیتے ہیں اور ان کا جاننا نہایت ضروری ہے جیسے:

1۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ: ((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) (مسلم) ”تم اپنے دنیاوی کاموں کو بہتر جانتے ہو“۔

چنانچہ دنیاوی امور جیسے زراعت، صنعت، ایجادات، میڈیکل کی تعلیم، ریاضی وغیرہ یہ سب وحی نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا کہ ان مذکورہ امور میں آپ ﷺ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک شخص ہیں ان میں آپ ﷺ کی کوئی خصوصیت اور انفرادیت نہیں۔

2۔ وہ افعال جن کا صرف آپ ﷺ کے لئے مخصوص کیا جانا ثابت ہے جن میں کوئی دوسرا شخص آپ ﷺ کے ساتھ شریک نہیں جیسے صلاۃ صُبحی (چاشت کی نماز) کا صرف آپ ﷺ پر فرض ہونا، افطار کئے بغیر روزہ کو رات میں جاری رکھنے کی اجازت، یا چار سے زائد شادیوں کی اجازت، ان معاملات کے علاوہ بھی دیگر معاملات ہیں جو آپ ﷺ کے لئے خاص ہیں اور ان میں کسی کو بھی اجازت نہیں کہ وہ آپ ﷺ کی پیروی کریں۔

3۔ وہ افعال جن کا تعلق انسانی جبلت و فطرت سے ہے جن کو انسان جبلی اور طبعی طور پر انجام دیتا ہے۔ جیسے اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، کھانا، پینا وغیرہ یہ ایسے افعال ہیں جن کا رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی اُمت کے لیے مباح ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔

4۔ رسول اللہ ﷺ جب کسی شرعی حکم کو نافذ فرماتے تھے تو اس کے لیے مختلف اسلوب (طرزِ عمل) سے کام لیتے اور اس کام کے مناسب وسائل استعمال کرتے۔ تو دراصل حکم شرعی اللہ کا حکم ہوتا ہے جس کو نافذ کرنا فرض ہے۔ لیکن اس حکم شرعی کو نافذ کرنے کا انداز کیا ہو گا یعنی اسلوب اور اس کے مناسب وسائل کیا استعمال کئے جائیں، یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی مرضی پر چھوڑا گیا، کہ ایک شخص کی حیثیت سے آپ ﷺ کے لئے جو ممکن ہو ایسا بہترین اسلوب اور وہ وسیلہ اپنائیں جو حرام کی طرف نہ پہنچا دے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: 94) ”لہذا جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو“۔

یہ ایک حکم شرعی ہے، جس کو نافذ کرنا لازمی ہے۔ لیکن شرع نے اس کو انجام دینے کے لئے کوئی مخصوص کیفیت نہیں بتلائی کہ اس کو کس طرح نافذ کیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں دعوت کو علی الاعلان بیان کر دیا، جس کی خلاف ورزی آپ ﷺ کبھی نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے جس کیفیت یا انداز میں علی الاعلان دعوت دینے کے حکم کو پورا کیا وہ انداز یا کیفیت آپ ﷺ پر لازم نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جو جماعت، ریاست کو قائم کرنے کے لیے

رسول اللہ ﷺ کی پیروی کر رہی ہے ایسی جماعت پر بھی لازم نہیں ہے کہ وہ اس حکم کو انجام دینے کے لئے وہی خاص کیفیت (انداز) اختیار کرے جو کہ رسول اللہ ﷺ نے (بحیثیت شخص) اختیار کئے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ صفا پر کھڑے ہوئے، کھانے پر لوگوں کو بلایا، مسلمانوں کی دو صف بنا کر باہر کعبہ کی طرف گئے۔ یہ دراصل اسلوب ہیں جو حکم شرعی کو انجام دینے کے لئے اختیار کئے گئے، یعنی یہ اصل حکم سے متعلق فروعی افعال ہیں، اصل حکم ”(صدرع)“ یعنی کھل کر دعوت دینا ہے۔ اور اصولی (فقہی) لحاظ سے یہ اسلوب اصلاً مباح ہیں۔ شرع نے اسلوب پر کسی قسم کی قید نہیں ڈالی، چنانچہ اس کو جماعت پر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ وہ موقع و محل کو دیکھ کر شرع کے اندر رہتے ہوئے مناسب اسلوب اختیار کرے۔

اور مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ﴾ ”اور (مسلمانو!) جس قدر طاقت اور گھوڑوں کی جتنی چھاؤنیاں تم سے بن پڑیں، ان سے مقابلے کے لئے تیار کرو، جن کے ذریعے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے (موجودہ) دشمن پر بھی ہیبت طاری کر سکو۔“ (الانفال: 60)

تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ ”تیار کرو“ یہ ایسا شرعی حکم ہے جس کی پابندی ضروری ہے۔ یہ فرض ہے جس کی خلاف ورزی حرام ہے۔ اس میں ایسی تیاری کا مطالبہ کیا گیا ہے، جس کے ذریعے وجہ علت یعنی ”دشمنوں پر ہیبت طاری کر دینا“ کا مقصد پورا ہو جائے۔ اس علت کو حاصل کرنے کے لئے وسیلہ کے طور پر گھوڑے ہی استعمال کیے جائیں یہ لازم نہیں ہے۔ بلکہ ہر ایسا وسیلہ جس سے دشمن



پر ہیبت طاری ہو سکتی ہے اختیار کرنا مطلوب ہے۔ وہ وسائل جن کے ذریعے جہاد کیا جاسکے، ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ لہذا حکم کی رُو سے مطلوب وہ وسائل ہیں جو اس حکم شرعی کو انجام دینے میں زیادہ فائدہ مند ہوں۔ آج کے اس دور میں دشمنوں اور منافقین کے دلوں میں ہیبت پیدا کرنے کے وسائل یہ ہیں (فضائیہ، دفاع کی مضبوطی، ٹینک اور میزائل سسٹم وغیرہ...) چنانچہ حکم شرعی اللہ کا وہ حکم ہے، جس کی خاطر براہ راست اللہ کا فرمان ہے کیونکہ وہی اصل حکم ہے۔

جبکہ اسلوب جزوی یعنی فروعی حکم ہے جو کہ اصل حکم کو انجام دینے کی خاطر ہے۔ یہ مباح ہے اور ہم پر چھوڑا گیا ہے کہ ہم حکم کے لئے مناسب اسلوب (اسٹائل) اختیار کریں۔

وسیلہ وہ ہیں جن کے ذریعے حکم شرعی کو انجام دیا جاتا ہے۔ یہ بھی اصلاً مباح (جائز) ہے اور ہم پر چھوڑا گیا ہے کہ ہم نہایت موزوں وسیلہ کو چنیں۔

اس بنا پر وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ سے صادر ہوئی مکہ میں یا مدینہ میں اور چاہے اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا نظام سے۔ منہج یعنی رسول اللہ ﷺ کے طریقے کے حوالے سے ہو یا احکام شرعیہ کی زندگی میں تطبیق (اختیار کرنے) کے حوالے سے۔ یہ سب وحی ہیں اور یہ ان اعمال میں شامل ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی (تأسی) پیروی ہم پر لازم ہے سوائے اوپر بیان کی گئی اسلوب اور وسائل اور اسی قسم کی دیگر مثالوں کے۔

جب بھی کوئی شخص مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کے طریقہ کار کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ ایسے اعمال انجام دئے جو کہ احکام شرعیہ ہیں ان کی خلاف ورزی جائز نہیں بلکہ ان کو انجام دینا فرض ہے۔ جبکہ کچھ ایسے افعال بھی انجام دئے جو اسلوب کے درجہ میں آتے ہیں اور کچھ وسائل استعمال کئے جن کے ذریعے وہ کچھ انجام دیا جو حکم شرعی کا مطالبہ تھا۔ ہمیں

بے حد ضروری ہے کہ ان معاملات کی سمجھ حاصل کریں جن کا حکم طریقہ کے شرعی احکام میں سے ہے اور ان معاملات کی بھی سمجھ حاصل کریں جن کا تعلق اسلوب اور وسائل سے ہے اور پھر ان کے درمیان کے آپسی فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں تاکہ کوئی بھی جماعت جان سکے کہ اس کا مقررہ مطلوبہ کام کیا ہے جس پر اس کو پابند رہنا لازم ہے اور کون سی چیزیں جماعت کے اختیار میں چھوڑ دی گئی ہیں تاکہ اس کے لئے جو مناسب ہو اس کو اپنالے۔

یہ جائز نہیں کہ پورے طریقے کو اسلوب میں سے سمجھ لیا جائے کہ جس کو حالات کے مطابق اپنانا جماعت کے اختیار میں دے دیا گیا ہو، کیونکہ ایسا سمجھنے پر طریقے سے متعلق احکام شرعیہ نظر انداز ہو جائیں گے اور ان کی جگہ اپنی جانب سے احکامات گھڑ لئے جائیں گے جو کہ شرعاً حرام ہو گا۔ اس معاملہ کو مزید واضح کرنے کے لیے ہم کچھ مثالیں پیش کریں گے جن میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی لازمی ہے۔

1۔ پہلا نکتہ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: 94) ”لہذا جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو“۔

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول ﷺ کے لئے فرمان ہے کہ دعوت کو اب اعلانیہ کر دیا جائے۔ اس فرمان سے ہمیں دو شرعی احکامات کی معلومات حاصل ہوتی ہیں، پہلے یہ کہ اس آیت کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے اعلانیہ دعوت شروع نہیں کی تھی۔ دوسرے یہ کہ اس آیت کے نزول کے ساتھ اعلانیہ دعوت دینے کا حکم ملا تھا۔ اعلانیہ دعوت دینے یا نہ دینے کا اختیار رسول اللہ ﷺ پر نہیں چھوڑا گیا تھا۔ بلکہ آپ ﷺ اعلانیہ دعوت سے متعلق اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے حکم کے پابند تھے۔ یہ شرعی حکم ہے جسے شریعت نے بیان کر دیا ہے، یہ فیصلہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی جانب

سے نہیں کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ حکم ان اعمال میں داخل ہے جن میں آپ ﷺ کی پیروی کرنا لازمی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿بِمَا تُوْمَرُ﴾ ”تمہیں جو حکم دیا جا رہا ہے“۔

اس بات کی دلیل پیش کر رہا ہے کہ اس معاملہ میں فیصلہ یعنی حکم اللہ تعالیٰ کا ہی ہے۔

2۔ دوسرا نکتہ، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ﴾ (النساء: 77) ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو (مکی زندگی میں) کہا جاتا تھا کہ اپنے ہاتھ روک کر رکھو اور نماز قائم کئے جاؤ...“

آپ ﷺ سے عبدالرحمن بن عوف نے جب کفار کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے اسلحے کے استعمال کی اجازت مانگی تو رسول اللہ ﷺ کا ان کو یہ فرمانا کہ: ((إِنِّي إِمْرُتٌ بِالْعَفْوِ، فَلَا تَقَاتِلُوا الْقَوْمَ)) (ابن ابی حاتم، نسائی، الحاکم) ”مجھے عفو درگزر کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے تم ابھی لوگوں سے قتال نہ کرو۔“

اس واقعہ کے عرصہ بعد جب مکہ سے مدینہ ہجرت ہوئی تو اس دوران اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ وحی نازل ہوئی کہ: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتِلُونَ بِأَنَّهُمْ ظَلَمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ (الحج: 39) ”جن لوگوں سے جنگ کی جا رہی ہے، انہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دفاع میں لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے اور یقین رکھو کہ اللہ ان کو فتح دلانے پر پوری طرح قادر ہے۔۔۔“

یہ آیتیں اور حدیث سب اس بات کی دلیل ہیں کہ پہلے قتال کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور اس کی اجازت بعد میں دی گئی۔ جس ہستی نے اس کی اجازت دی وہ صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات تھی۔ دعوت کے لئے قتال کا یہ معاملہ حکم شرعی ہے جس کی پابندی کرنا لازم ہے۔ ایسا نہیں ہوا کہ اس معاملہ میں فیصلہ کا اختیار آپ ﷺ کو تھا کہ جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی مرضی سے قتال کیا یا اپنی خواہش کے تحت اس سے باز رہے، بلکہ معاملہ کا فیصلہ وحی کے ذریعے نازل ہوا تھا، چنانچہ یہ حکم بھی رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے دائرے میں آتا ہے۔ لہذا رسول اللہ ﷺ نے جس طرح خود کو اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا پابند کیا اسی طرح آپ ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں بھی اللہ کے اس حکم کی پابندی کرنی پڑے گی۔

3- تیسرا نکتہ، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا جب کبھی آپ ﷺ قبائل عرب سے نصرہ طلب کرتے: ((يا بني فلان اني رسول الله اليكم، يأمرکم أن تعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً، وأن تخلعوا ما تعبدون من دونه من هذه الأنداد، وأن تؤمنوا بي و تصدقوا بي و تمنعوني حتى أبين عن الله ما بعثني به)) (سيرة ابن هشام) ”اے فلاں کے بیٹو! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، (اللہ) تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم اس کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو اس سے باز آ جاؤ، مجھ پر ایمان لاؤ اور میری تصدیق کرو اور میری حفاظت کرو حتیٰ کہ میں اس چیز کو بیان کروں جس کو دے کر اللہ نے مجھے بھیجا ہے۔“

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں بتلادیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس معاملے میں وحی کی پیروی کرتے تھے، اس کی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ قبائل عرب کی طرف سے متعدد دفعہ

انکار کئے جانے، سختی سے پیش آنے اور بدسلوکی کے ساتھ جواب دینے کے باوجود رسول اکرم ﷺ طلب نصرتہ پر مسلسل اصرار کرتے رہے۔

یہ تمام دراصل طریقے سے متعلق شرعی احکامات کی مثالیں ہیں۔ جہاں تک ان وسائل اور اسلوب کا تعلق ہے جن کا استعمال ان احکامات کو انجام دینے کے لئے کیا گیا تھا ان پر اصولی طور پر اسی مخصوص انداز میں پابندی کرنے کا ہم پر حکم عائد نہیں کیا گیا۔ بلکہ ہم حکم شرعی کو انجام دینے کے لئے موزوں ترین اسلوب اور بہترین وسائل استعمال کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنی دعوت میں مومنوں کو اکٹھا کر کے تربیت دینے کا عمل کیا کرتے تھے اور یہ فعل آپ ﷺ دارالارقم، یا دوسرے لوگوں کے گھروں میں اور پہاڑوں کی وادیوں میں انجام دیا کرتے تھے۔ ہمارے لیے ایسی تربیت کرنا حکم شرعی ہے جس کی پابندی ہم پر لازم ہے، البتہ ہم اس تربیت کے لیے مناسب اسلوب اختیار کریں گے۔ چنانچہ حلقہات کی شکل میں اکٹھا کر کے یا گھروں میں خاندان کو افکار دینے کا اسلوب اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اس سے جڑی دیگر باتوں میں مثلاً اس کے لئے ہفتہ وار وقت کا تعین، دورانیہ، افراد کی تعداد وغیرہ کو ایسے موزوں انداز میں متعین کیا جائے جو دعوت کے عمل میں شامل شباب کے ذہنوں میں افکار کو پختہ کر دے جو اس پر یقین رکھتے ہوں۔ یہ تمام اختیارات ہم پر چھوڑے گئے ہیں، چنانچہ ہم ان چیزوں کو اختیار کریں گے جو اس حکم شرعی کو ادا کرنے کے لئے نہایت موزوں ہوں گی، اور حکم شرعی یہ ہے کہ اجتماعی اور زبردست تربیت ہو۔

رسول اللہ ﷺ خود کو اور اپنی دعوت کو کھلے عام مکہ کے بازاروں میں لوگوں کے سامنے پیش کیا کرتے تھے، جب ہم یہ کام کریں تو ہمیں کھلے عام دعوت کے لیے مناسب اسلوب اختیار کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر لوگوں سے خطاب کریں یا سماجی تقریبات اور عوامی محفلوں میں دعوت کو

بھیلائیں، اور ایسے مواقع پر جب تہوار منایا جائے یا خوشی اور غم کے معاملات میں جب لوگ جمع ہوتے ہیں۔ دعوت کے وسائل کے طور پر مختلف ذرائع کو استعمال کیا جاسکتا ہے جیسے کتابیں، میگزین، پمفلٹ، کیسٹ یا براہ راست تقریر وغیرہ، یہ تمام وسائل مباح ہیں۔ اس طرح جب رسول اللہ ﷺ طلب نصرہ کے لیے طائف کی طرف تشریف لے گئے، اب اس کام کے لیے آپ ﷺ پیدل گئے ہوں یا سوار ہو کر گئے یا آپ ﷺ نے کوئی اور وسیلہ استعمال کیا، انہی وسائل کو اختیار کرنا آپ ﷺ کی پیروی کے دائرے میں نہیں آتا، شریعت نے کوئی قید نہیں لگائی کہ ہم مخصوص وسائل ہی استعمال کریں بلکہ ہمیں اختیار دیا ہے کہ مناسب وسائل کو ہم چنیں۔ چنانچہ ہمارے لئے یہ بات جان لینا لازمی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں مختلف احکام شرعیہ شامل ہیں جن کو اللہ نے وحی نازل کر کے متعین کر دیا ہے اور جن سے آپ ﷺ بال برابر بھی نہ ہٹے۔ ہم پر بھی فرض ہے کہ ہم ان احکامات سے بال برابر نہ ہٹیں۔ جو چیزیں تبدیل ہو جاتی ہیں وہ چیزیں صرف وسائل، اشکال اور اسلوب ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو حکم شرع کو انجام دینے میں استعمال ہوتے ہیں اور اس کی ضرورتیں ہیں۔ ان کو اختیار کرنا ہم پر چھوڑا گیا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ پر چھوڑا گیا تھا۔

دارالاسلام کا قیام یقیناً ایک شرعی حکم ہے، بعض افراد ایسا خیال کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست کو قائم کرنے کا طریقہ اسلوب کی طرح ہے اور یہ معاملہ ہمارے سپرد کیا گیا ہے، ہم اس کو خود طے کر لیں گے کہ اس کا طریقہ کار کیا ہوگا، چنانچہ دارالاسلام کے قیام کے لیے ہم ایسا کوئی بھی عمل انجام دے سکتے ہیں جس کے نتیجہ میں دارالاسلام قائم ہو جائے۔ اس کے لئے مثال کے طور پر ہم غریبوں کی مدد کریں، لوگوں کو اخلاق کی طرف دعوت دیں، اسکول اور مدارس بنائیں، ہسپتال قائم کریں، نیک اعمال کی طرف دعوت دیں یا پھر حکمرانوں سے مسلح جنگ کریں یا حکومت میں شامل ہو کر کام کریں۔ یہ تمام رسول اللہ ﷺ کے طریقے سے ہٹ کر ہیں، ان سب کاموں کو طریقے کے طور پر کرنا دارالاسلام

کو قائم کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو ترک کرنا ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنے رب کے بتلائے طریقہ کی پابندی کی تھی۔ چنانچہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے عوام کے سامنے کھلے عام اعلانیہ دعوت دی اسی طرح اعلانیہ دعوت دینا ہم پر بھی فرض ہے ورنہ اس کا مطلب ہو گا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی ترک کی اور یہ عمل شریعت کی خلاف ورزی ہوگی۔ اسی طرح جیسے رسول اللہ ﷺ نے قتال سے خود ہاتھ روکے رکھا اور مسلمانوں کو بھی اسلحے کے استعمال کی اجازت نہیں دی ہمیں بھی اسی طرح حکم کی تعمیل میں آپ ﷺ کی پیروی کرنی لازم ہوگی۔ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے نصرة طلب کی اسی طرح ہمیں بھی زمانہ کی تبدیلیوں کے باوجود طلب نصرة کرنا لازم ہوگا۔ اجمالی طور پر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے لیے جو طریقے کے مختلف مراحل مقرر کیے تھے وہی ہمارے لئے بھی مقرر کئے ہیں۔ اس سے اختلاف کرنا یا اس کی پیروی نہ کرنا شریعت کی خلاف ورزی میں شامل ہوگا۔

طریقہ کے بارے میں ہمیں کوئی اختیار نہیں دیا گیا ہے۔ شریعت نے ہمارے لئے ایک مقصد متعین کیا اور اس مقصد کو حاصل کرنے کا ایک مخصوص طریقہ بھی مقرر کر دیا ہے۔ اور اس معاملہ میں اطاعت و فرمانبرداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ ہمارے پاس نہیں ہے۔

اس طرح معلوم ہوا کہ صرف شرعی عبارتوں (قرآن و حدیث) کے پاس طریقہ کے مراحل کے تعین کا اختیار ہے۔ کسی بھی مرحلے کے تعین کو ہم عقل، حالات یا مصلحت (مفاد) یا کسی اور چیز کو بنیاد بنا کر متعین نہیں کر سکتے۔

شرعی نص کو عبارت میں زبانی اشارات (لفظی مدلول) کے اعتبار سے سمجھا جاتا ہے نہ کہ لوگوں کی خواہشات اور رجحانات کو دھیان میں رکھ کر ان کی تشریح کی جاتی ہے، بلکہ ہمارے رجحانات

شریعت کے پابند اور اس کی قید میں ہیں اور ہم پر لازم ہے کہ ہر اس چیز میں پابندی اختیار کریں جن سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوتا ہے۔

چنانچہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقے کی سمجھ حاصل کریں اور مکمل طور پر اس پر کاربند ہو جائیں جس طرح آپ ﷺ اس طریقہ پر آگے بڑھتے رہے، اسی طرح یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے کام کو کن الگ الگ مرحلوں میں انجام دیا اور پھر ان مختلف مرحلوں میں آپ ﷺ نے کون سے مختلف فعل انجام دے ہیں۔

چنانچہ تشفی (تربیت) کے مرحلے میں رسول اللہ ﷺ نے بعض اعمال انجام دیئے، جیسے انفرادی طور پر لوگوں سے ملنا، جو آپ ﷺ پر ایمان لائے انہیں ایک خفیہ جگہ اکٹھا کرنا اور ان کی مستقل تربیت کرنا، چنانچہ ہم بھی ان اعمال کے اصل کی پابندی کریں گے جو اللہ کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام شرعیہ ہیں، جنہیں اپنانا فرض ہے جبکہ ان افعال کے لیے ضروری وسائل اور مناسب اسلوب ہم اپنی طرف سے اختیار کر سکتے ہیں۔

تفاعل (معاشرے سے خطاب) کے مرحلے میں بھی رسول اللہ ﷺ نے کچھ خاص اعمال انجام دیئے جیسے اعلانیہ دعوت، اس دوران سینکڑوں آیات نازل ہوئیں، جن میں غلط عقائد، خراب رسوم و رواج کو نشانہ بنایا جاتا اور قریش کے سرداروں کا نام لے کر یا کبھی ان کے غلط اوصاف کو بیان کرتے ہوئے ان کی مذمت کی گئی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے آپ کو قبائل عرب کے سامنے پیش کیا، ہم بھی ان اعمال کے اصل کو احکام شرعیہ کے طور پر اپنائیں گے۔ پہلے مرحلے یعنی تربیتی مرحلہ کے افعال کے ساتھ ہم دوسرے مرحلے کے اعمال شامل کریں گے جس میں فکری اور سیاسی جدوجہد نمایاں ہوتی ہے، اُمت کے مفادات کو اسلام کی بنیاد پر پہچاننا اور اختیار کرنا، استعماری کفار اور ان کے غنڈوں



الجنٹ حکمرانوں کے منصوبوں کو بے نقاب کریں گے، بالکل جس طرح رسول اللہ ﷺ کیا کرتے تھے، لہذا ان اعمال کے لیے بھی اپنی طرف سے ضروری وسائل اور اسلوب استعمال کریں گے۔

جی ہاں! رسول اللہ ﷺ کی مکی زندگی کے دور کے اعمال کو دیکھ کر ہی دارالاسلام کے قیام کے لئے شرعی حکم کی پیروی ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ جب اس طریقے پر چل پڑے اور اس کی خاطر مختلف افعال انجام دیئے، اس دوران آپ ﷺ کو مصیبتوں، ذلتوں، آزمائشوں اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باوجود آپ ﷺ نہیں تھکے اور مضبوط ارادے کے ساتھ کام کرتے رہے، آپ ﷺ کی جانب اللہ کا حکم نازل ہوتا اور آپ ﷺ پوری جدوجہد کے ساتھ اس کو نافذ کرتے۔ بلاشبہ وہ شخص صحیح راستے کی سمجھ سے بہت دور ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: 94) کو سن چکا ہو جس میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اپنے فرمان کی تعمیل میں اعلانیہ دعوت دینے کا حکم دیا، وہ جانتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعلانیہ دعوت دی صرف اس لئے کہ یہ آپ ﷺ کے رب کا فرمان تھا نہ کہ یہ آپ ﷺ کا کوئی ذاتی فیصلہ تھا، اس کے باوجود کہتا ہے کہ ”یہ طریقہ لازمی نہیں ہے“ تو اگر یہ طریقہ لازمی نہ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کو کیا ضرورت تھی کہ آپ ﷺ اس قسم کا شدید اور دشوار موقف اختیار کریں جو آپ ﷺ نے اختیار کیا یعنی آپ ﷺ کفار کو کھلے عام لکارتے ہیں اور ان کے معبودوں، سرداروں اور ان کے افکار و رسوم و رواج کی مخالفت و مذمت کرتے ہیں؟ اس کے باوجود کہ یہ تمام چیزیں قرآن کی ہدایات کے تحت انجام پائیں؟۔ آپ ﷺ یہ بھی کر سکتے تھے کہ اپنی قوم کے سرداروں کی خوشامد کرتے اور انہیں خوش کر کے راضی رکھتے یا پھر اپنی قوم کی غلط رسوم و رواج کا ساتھ دیتے تاکہ ان لوگوں میں جاہ حشمت، اثر و رسوخ حاصل کر لیں، اور اگر آپ ﷺ ایسا کرتے تو امر خداوندی کا خلاف لازم آتا جو آپ ﷺ جیسی ہستی سے ممکن نہیں تھا، اس لیے کہ قرآن میں جو

کچھ نازل ہوتا آپ ﷺ اس حکم کی تعمیل کرتے جاتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُمْ فَأَنْذِرْ﴾ (المدثر: 2) ”اُٹھو اور لوگوں کو خبردار کرو۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سرداروں کی مذمت کی جیسا کہ پہلے گزر ہو چکا: ﴿تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ﴾ (اللمب: 1) ”ابو لہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ تباہ ہو۔“

اور ولید بن مغیرہ کی اس طرح مذمت کی کہ: ﴿عُتِلَّ بَعْدَ ذَلِكَ زَنِيمٌ﴾ (القلم: 13) ”سخت ظالم اور سنگ دل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ناجائز بے نسب (ولد الزنا) بھی ہے۔“

پھر اس طرح قرآن نے رسول اللہ ﷺ کا دفاع کیا: ﴿مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ﴾ (القلم: 2) ”آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں۔“

یوں کفار کا حال بیان کیا: ﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾ (القلم: 9) ”یہ چاہتے ہیں کہ تم ڈھیلے پڑ جاؤ تو یہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں۔“

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو دعوت کو اعلانیہ کرنے اور ام القریٰ یعنی مکہ اور آس پاس کے لوگوں کو ڈرانے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو دعوت کے لیے اسلحہ کے استعمال سے منع فرمایا، بس قرآن نازل ہوتا جاتا تھا اور رسول اللہ ﷺ اس کے مطابق آگے بڑھتے جاتے تھے، اس شخص کو مزید کیا دلیل چاہئے جو یہ کہے کہ طریقہ کی پابندی لازمی نہیں ہے؟

طریقہ کی پابندی غیر لازمی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ وہ ہمارے اختیار میں ہے چاہیں تو کریں یا نہ کریں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں تھا کہ وہ اللہ کی طرف سے جو کچھ نازل ہوتا تھا اس کے خلاف عمل کریں یا کچھ حصوں میں خلاف ورزی کریں، کیونکہ جو کچھ آپ ﷺ پر وحی

کے ذریعے نازل ہوتا تھا اصلاً آپ ﷺ پر اس کی پابندی لازمی نہیں تھی۔ تو اس کا مطلب ہو گا کہ ہمیں بھی اختیار ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر چلیں یا کسی اور طریقے پر۔ ایسی رائے فہم صحیح اور رسول اللہ ﷺ کے اعمال کی صحیح پیروی سے کوسوں دور ہے بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ کے عمل کے خلاف اور تبدیلی لانے کے لئے آپ ﷺ کے اختیار کردہ منہج سے انحراف ہے۔

### بعض مسلمانوں کا آج طریقے اور اسلوب کو خلط ملط کر دینا:

بعض لوگوں کے ذہنوں میں جو شبہ پیدا ہوتا ہے اس کی ایک وجہ یہ حقیقت ہے کہ آج زمانہ اور حالات وہ نہیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں معاشرہ کی تقسیم نہایت بنیادی اور سادہ تھی یعنی عرب کا معاشرہ قبائل اور خاندانوں کی بنیاد پر بٹا ہوا تھا، جبکہ آج معاشرہ کی تقسیم انتہائی پیچیدہ اور آپس میں الجھی ہوئی ہے، اس وقت ایک قبیلہ خود میں ایک ریاست ہوتا تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں افراد ہوتے تھے جبکہ آج ایک ریاست میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ ہوتے ہیں، اس زمانہ میں کفار کو ایمان کی دعوت دی جاتی تھی جبکہ آج دنیا میں اسلامی زندگی کو دوبارہ جاری کرنے کی خاطر مسلمانوں کو دعوت دی جاتی ہے، رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بڑی بڑی عظیم طاقتیں جیسے روم اور فارس مکہ میں آپ ﷺ کی دعوت میں مداخلت نہیں کرتی تھیں۔ جبکہ آج ہمارے سربراہ آج کی عظیم طاقتوں کی عالمی سیاست سے بندھے ہوئے ہیں یعنی ان کی پالیسیوں کی پیداوار ہیں بلکہ ان کے ایجنٹ حکمران ہیں۔ یہ بڑی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

وہ لوگ جو اس قسم کے شکوک میں مبتلاء ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو کس طرح اپنائیں جبکہ آج بہت سارے معاملات تبدیل ہو گئے ہیں اور ایسا کرنا جاڈپن یعنی دقیا نو سیت، غیر لکچیلاپن ہے جس میں جمود ہے اور مزید یہ کہ ہمیں اس کا پابند نہیں کیا گیا ہے۔ اہم یہ ہے کہ دعوت کے عظیم تر مقاصد حاصل کیے جائیں جو کہ اسلامی ریاست کے ذریعے اسلام کا نفاذ کرنا اور اللہ کی عبادت و بندگی اختیار کرنا ہے۔

اس معاملہ کے حوالے سے صحیح نقطہ نظر کو بیان کرنے کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ حکم شرعی ہمیشہ اس حقیقت پر اُترتا ہے جس حقیقت کی خاطر یہ حکم شرعی حکم آیا ہے۔ جب حقیقت بدل جائے گی تو اس حقیقت کا حکم بھی بدل جائے گا۔ جب تک حقیقت نہیں بدلے گی حکم شرعی بھی اسی طرح برقرار رہے گا۔ اعتبار حقیقت کی بنیادی صفات کا ہے اس کی ظاہری شکل و صورت کا نہیں یعنی ایک شخص حقیقت کس چیز کو سمجھتا ہے وہ اس حقیقت کی بنیادی خاصیتیں ہیں نہ کہ اس کے مختلف رنگ یا شکلیں۔

چنانچہ معاشرہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ انسانوں کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو مشترکہ افکار پر ایمان رکھتے ہیں، پھر اس مشترکہ افکار پر یقین کرنے کی وجہ سے ان کے اندر ہر اُس چیز کو قبول کرنے، اس پر راضی ہونے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو ان افکار کے موافق ہوتی ہے اور ہر اُس چیز سے ناراضگی اور غصہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جو ان افکار کے خلاف جاتی ہے۔ پھر ان کا ایک نظام قائم ہوتا ہے جو ان افکار کو لوگوں پر نافذ کرتا ہے اور ان افکار کی خلاف ورزی کو روکتا ہے۔ یوں اپنے اختیار کئے ہوئے افکار کے مطابق لوگ زندگی گزارتے ہیں اور جن افکار پر وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔

معاشرہ کی حقیقت مختلف شکل و صورت اختیار کر سکتی ہے، کبھی وہ ابتدائی شکل میں ہو سکتی ہیں اور کبھی زیادہ پیچیدہ صورت میں۔ سو انسانوں کا ہر وہ مجموعہ، جس کی تنظیم باہمی مشترکہ افکار اور جذبات

کرتے ہیں، پھر حکومت بھی ان پر وہی نظام نافذ کرتی ہے جو ان کے افکار سے نکلا ہوا ہوتا ہے، چاہے یہ معاشرے قبیلے کی شکل میں ہوں یا آج کی جدید ریاست کی شکل میں، اور چاہے معاشرہ کے افراد کی تعداد ہزاروں میں ہو یا کروڑوں میں ہو۔ ایسا مجموعہ معاشرہ ہی ہے کیونکہ معاشرہ کے اجزائے ترکیبی اس میں پائے جاتے ہیں وہ تبدیل نہیں ہوئے اور وہ صفات اب بھی برقرار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی معاشرہ کو وجود میں لانے کے لیے کام کیا اور یہ کام اسلامی افکار، اسلامی جذبات اور اسلامی نظاموں کو قائم کرنے کے ساتھ انجام پایا۔ اس کے لیے آپ ﷺ اس کے شرعی طریقے پر پابند رہے جو اسلامی معاشرہ کو وجود میں لانے کا اسلامی طریقہ ہے۔ آپ ﷺ کے تمام افعال اسی مقصد کو حاصل کرنے کی سمت میں ہوتے تھے، چنانچہ مدینے میں آپ ﷺ نے ایسے مومن افراد تیار کیے جو مدینے کی اکثریت تھے۔ ان کے ذہنوں میں آپ ﷺ نے بنیادی اسلامی افکار پیدا کر دیئے تھے جنہوں نے ان کے اندر ایسے ہم آہنگ اسلامی جذبات کا تانا بانا بن دیا جو کبھی آپس میں ٹکراتے نہ تھے، یعنی اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے تمام اجزاء موجود ہو چکے تھے اور صرف ایک چیز باقی تھی جو ان کے آپسی رشتے کو ایک نظام کے تحت باندھ دے۔ پھر جب آپ ﷺ نے ان لوگوں کی جانب ہجرت فرمائی اور نظام قائم کیا تو ایک اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہوئی اور وجود میں آیا۔ اگرچہ اس معاشرہ کی شکل شروعات میں انتہائی سادہ تھی لیکن پھر اس کی شکل اور ڈیل ڈول بدل کر ایسے معاشرے میں تبدیل ہو گیا جس کے لئے انتظام اور حکومتی ڈھانچوں (ریاست) کی ضرورت پڑنے لگی۔

اس دعویٰ کے متعلق کہ اس زمانہ میں بڑی طاقتیں مسلمانوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرتی تھیں، جبکہ آج وہ دخل اندازی کرتے ہیں اور اسلام کو قائم ہونے سے روکتے ہیں، اس بات کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ اس سے طریقہ تبدیل نہیں ہو گا۔ ہاں اس نئی مشکل سے نبی ﷺ کے

طریقہ کی پیروی کے لئے مشکلات بڑھ جائیں گی۔ اس لئے آج کے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلامی ثقافت میں مزید تربیت اور دعوت میں زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جماعت بھی بین الاقوامی پالیسی کے تحت بین الاقوامی سطح پر کام کرے گی اور بڑی طاقتوں کی پالیسیوں کو جانے گی اور ان سازشوں کو سمجھے گی جو وہ ہمارے خلاف کرتے ہیں اور اپنے ایجنٹوں اور مہروں کے ذریعے ان کو نافذ کرتی ہیں تاکہ ہم ان کا مقابلہ کر کے ان کو روک پائیں۔

جہاں تک اس قول اور دعویٰ کا تعلق ہے کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایمان کو اہم مقصد بنالیا تھا اور احکام تو بہت تھوڑے تھے، اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ یہ حقیقت کہ آپ ﷺ نے احکامات پر عمل کا اہتمام کیا چاہے یہ احکامات بہت تھوڑے ہی نازل ہوئے تھے ان پر عمل کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت میں احکام شرعیہ کی کتنی اہمیت ہے۔ ساتھ ہی اس بات پر بھی دھیان دیں کہ مکہ میں دعوت اسلام میں داخل ہونے کے لیے تھی، آج یہ دعوت مسلمانوں کے درمیان ہے جو اسلامی عقیدہ رکھتے ہیں اور فی زمانہ حقیقت یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ نازل ہو چکے ہیں۔ اب مسلمان اللہ کے سامنے اسلام کے تمام احکامات کے بارے میں ذمہ دار اور جواب دہ ہیں، صرف ایمان کے بارے میں نہیں، اُس زمانہ میں مکہ میں جس کسی مسلمان کی موت ہوئی تھی تو اس سے صرف ان احکامات کے بارے میں سوال ہو گا جو اس کی موت کے وقت تک نازل ہو چکے تھے۔ لیکن اب جو کوئی مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے تمام احکامات کے بارے میں سوال پوچھے گا۔ اس لئے لازم ہے کہ دعوت پوری اور مکمل اسلام کی دی جائے اور یہ دعوت اسلامی زندگی کی واپسی کے لیے آواز لگانے والی ہو کیونکہ آج ہماری دعوت کوئی نئی دعوت یا نیا دین نہیں ہے۔

یہ بھی ہے کہ آج جو کوئی مسلمانوں کے حالات کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا مسئلہ یہ نہیں کہ انہوں نے اسلامی عقیدہ کو کھو دیا ہے بلکہ یہ ہے کہ زندگی کے افکار اور تشریحی نظاموں سے ان کے عقیدے کا تعلق ٹوٹ گیا ہے چنانچہ عقیدہ اپنی زندگی کھو چکا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ مسلمان مغربی افکار سے متاثر ہو گئے، جن افکار کی حفاظت کافر مغربی ریاستیں کرتی ہیں اور ان مغربی افکار کو برقرار رکھنے، ان کو مسلسل زندہ رکھنے کی کوششیں کرتی ہیں، جس کے لئے یہ مغربی کافر ریاستیں مسلمانوں پر اپنی غلام اور ایجنٹ حکومتیں بٹھا کر وہاں اپنے تعلیمی پروگراموں کو جاری کر کے اور پھر ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے ذریعے مسلمانوں میں ان افکار کو عام کرتی ہیں۔

اس لیے آج ضرورت ہے کہ اسلام کو صحیح، کامل اور مکمل انداز میں پیش کیا جائے، جہاں عقیدہ اور ایمان کی اہمیت اس طرح آشکار ہو کہ یہی وہ بنیادی فکر ہے جس سے احکامات پھوٹتے ہیں، جس پر افکار کی بنیاد قائم ہے اور جس کے ذریعے ہی زندگی کے بارے میں نقطہ نظر کا تعین کیا جاتا ہے۔ پھر اس عقیدے سے نکلنے والے دیگر افکار کو پیش کیا جائے جو زندگی کے متعلق ہیں۔ ایسا کرنے کے لئے اس حقیقت کی یاد دہانی کرائیں کہ تمام چیزوں کو پیدا کرنے والا خالق اور تمام معاملات کو چلانے والا مدبر صرف اللہ ہی ہے، اور یہ کہ اقتدار و حکومت صرف اللہ کا ہے، اسی کی طرف دنیا و آخرت کے متعلق تمام فیصلے لوٹتے ہیں۔ جب ایک مسلمان پر ایمان اور احکام دونوں ہی واجب ہوں گے تو حق کا زور اور تاثیر اس مسلمان کے سامنے واضح ہو جائے گی، ساتھ ہی اس کے سامنے واضح ہو گا کہ جماعت میں موجود اسلام کی سمجھ کتنی قوت رکھتی ہے اور اسکے ذریعے ہونے والی اسلامی دعوت کا اثر کیسا ہوتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں تبدیلی لانے کے لئے جماعت کی قابلیت اُسے معلوم جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج کی دعوت مسلمانوں کو دعوت ہے تاکہ وہ اسلامی زندگی کو دوبارہ قائم کر دیں، جو اسلامی ریاست کے قیام کے ذریعے ہو گا۔ اور اس دعوت کی اساس صرف اسلامی عقیدہ ہو گا اور اس عقیدہ کو اس کے سیاسی انداز میں پیش کیا جائے گا یعنی اسلامی عقیدہ کو انسانوں کے افعال اور تمام سرگرمیوں کو منضبط کرنے والے عقیدے کے طور پر پیش کیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کے تحت معاشرہ کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر انسانوں کی زندگیاں سدھارتا ہے۔

پس جو کچھ تبدیل ہوا ہے وہ شکل ہے، جہاں تک اصل جو ہر یعنی حقیقت کا تعلق ہے وہ بحالہ برقرار ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے، لہذا اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کرنے کا حکم تبدیل ہوا نہ ہی اسے حاصل کرنے کے طریقے کے حکم میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔

## احکام شرعیہ کا تجربہ کرنا؟!

دوسرے سوال سے متعلق :

کچھ لوگ ہیں جو کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے عمل کو ایک تجربہ قرار دیتے ہیں اور اس طرح ریاست کو حاصل کرنے کے طریقہ کار کو ایک تجرباتی منصوبہ کے طور پر بیان کرتے ہیں جس کے تحت دعوت آگے بڑھتی ہے۔ کیا اس معاملہ کو مطلقاً تجربہ کہنا جائز ہے؟

بلاشبہ طریقے کو تجربہ کہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایسا کہنا طریقہ کو ایک ایسے معنی پہناتا ہے جو لفظ ”شرعی طریقہ“ سے میل نہیں کھاتا یعنی جب طریقہ انسانی تجربہ ہی ہے تو پھر اسے شرعی کہنے کی کیا وجہ ہوئی۔



”طریقہ کار“ اسلام کے ایسے احکام شرعیہ ہیں جن کے بناء قوت دلیل پر ہوتی ہے۔ جماعت پر ان کی پابندی اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ وہ شرع کی پابند ہوتی ہے اور جماعت کا ان سے رُخ موڑنا جائز نہیں جب تک وہ انہیں شرعی احکام مانتے ہوں۔ چنانچہ طریقہ، آزمانے اور نتیجہ نکالنے کا معاملہ نہیں (کہ اگر مقصد میں کامیابی مل جائے تو یہ کامیاب کوشش ہے ورنہ یہ ناکام کوشش ہے اس لئے اب اسے بدل کر کچھ اور آزمانا چاہئے) تاکہ ان تجربات سے طریقہ معلوم کیا جاسکے جو اس عظیم مقصد کے حاصل کرنے کا راستہ قرار پائے گا۔

بلکہ شرعی طریقہ تو ان شرعی احکامات کا مجموعہ ہے جو پچھلے صفحات میں بیان ہوئے ہیں اور وہ اس مقصد کے لئے ہیں کہ اسلامی زندگی کا دوبارہ آغاز ہو جائے، ان احکام کی بنیاد دلیل پر ہوتی ہے۔ اور ان کی پابندی کر کے صبر و استقامت کے ساتھ ان پر قائم رہنا رب العالمین کی عبادت ہے اور وہ ان احکام کو نہ تو بدل سکتے ہیں اور نہ اس کی بجائے کسی اور کو اختیار کر سکتے ہیں جب تک کوئی دوسری مضبوط دلیل ان کے سامنے نہ آجائے جو اس طریقہ (راستہ) کے متعلق ہے۔

شرعی طریقہ میں صاف طور پر رسول اللہ ﷺ کی پیروی نظر آنا ضروری ہے کیونکہ شرعی طریقہ وہ ہے کہ جس میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی ہو۔ اس معیار کی وجہ سے شرعی طریقہ ان لوگوں کے بنائے ہوئے طریقوں سے بالکل مختلف ہے جو سیکولر نظام کے تحت کام کرتے ہیں۔ جہاں لوگ اپنی ذہانت اور سمجھ کی بنیاد پر مختلف مراحل کا تجربہ اور مشاہدہ کرتے ہیں پھر مقصد کے حصول میں کامیابی اور ناکامی کو دیکھ کر اس فعل و عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

سیکولر نظاموں کی طبیعت یہ ہے کہ اس کے ماننے والے خود ان کو مکمل حل نہیں سمجھتے اور اس نظام کے کوئی بھی حل ان کے مطابق آخری حل نہیں ہیں۔ اس میں ہمیشہ تبدیلی اور بہتری کی ضرورت

ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لوگ جو بھی کام کرتے ہیں اسے ایک تجرباتی کام کہنا درست ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کے بنائے ہوئے تمام قوانین تجربات کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک کسی عمل کے صحیح یا غلط ہونے کی پہچان اس عمل کے ذریعے مقصد کو پانے میں کامیابی سے کی جاتی ہے، یعنی جو بھی عمل (طریقہ) نتیجہ لائے وہ صحیح ہے ورنہ وہ غلط ہے۔ مسلمان کا معاملہ اس سے مختلف اس لئے ہے کہ اسلام کی فطرت ہی منفرد و ممتاز ہے کیونکہ اسلام اپنے آپ میں العلیم (جو سب کچھ جانتا ہے) اور الخیر (جو ہر بات کی خبر رکھتا ہے) کی طرف سے آیا ایک آسمانی منہج (طریقہ) ہے، اس لیے طریقہ جب تک شرعی دلیل کی بنیاد پر ہو تو وہ صحیح اور مکمل ہے۔ اس کے صحیح ہونے کا دار و مدار اُس کی شرعی دلیل پر اور استدلال کے صحیح ہونے پر ہے، نتیجے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ طریقہ میں شرعی دلیل پر کاربند رہنا بنیادی معاملہ ہے اور طریقہ کی کامیابی کے لئے شرعی دلیل پر پابندی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جہاں تک طریقہ کے مختلف اعمال اور نتیجے یعنی قوت و اقتدار کو اختیار کرنے کا تعلق ہے تو یہ لازمی ہے کہ دونوں کی پابندی کی جائے یعنی دونوں ہی مقاصد حاصل کئے جائیں جیسا کہ اللہ عز و جل کا فرمان ہے کہ: ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا﴾ (النور: 55) ”تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اُن سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح اُن سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور اُن کے لئے ان کے دین کو ضرور اقتدار بخشے گا، جسے اُن کے لیے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق رہا ہے، اس کے بدلے اُنہیں ضرور امن عطا کرے گا۔ وہ میری عبادت کریں۔ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔“

مزید اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿إِنْ تَنْصَرُوا لِلَّهِ يَنْصِرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ (مجد: 7) ”اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا۔“

اب اگر نتیجہ نہیں نکلے تو مسلمہ طریقہ کو معطل نہیں کیا جائے گا یا کسی اور طریقہ سے تبدیل نہیں کیا جائے گا، نہ ہی اس کے ناکام ہونے کا اعلان کیا جائے گا، بلکہ طریقہ کے احکامات پر دوبارہ نظر ڈالی جائے اور مزید چھان بھٹک کی جائے گی۔ اور جب تک جماعت کو یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اس حکم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی تھی کسی بھی حکم شرعی کو نہ چھوڑا جائے۔ اگر جماعت کو نظر ثانی کے بعد بھی کوئی غلطی نظر نہ آئے تو جماعت پر ان احکامات کی پابندی کے علاوہ اور کچھ لازم نہیں ہوگا اور وہ صبر و یقین کا مظاہرہ کرے گی یہاں تک کہ اسے اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے۔ یا پھر یہ سمجھا جائے گا کہ بعض دفعہ اللہ کی سنت کے مطابق مدد کے آنے میں دیر ہو سکتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا﴾ (یوسف: 110) ”یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور کافر یہ سمجھنے لگے کہ انہیں جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں تو ان پیغمبروں کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی۔“

جی ہاں یہ کام یقیناً مشکل کام ہے اور اس میں بڑے پیمانہ کی جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جماعت کے وسائل بھی ان حکومتوں سے کم ہوتے ہیں جن کے ساتھ جماعت کا مقابلہ ہے، اور کام کی کامیابی کسی مقررہ مدت سے نہیں جڑی ہوئی ہے کہ اگر مدت پوری ہو جائے اور مقصد پورا نہ ہو تو اس کو شش کو ناکامی کہا جائے اور پھر اسی خاص مدت میں کامیابی کے لئے نئی کوشش کی جائے، ایسا نہیں بلکہ کامیابی کا تعلق فکر کی مضبوطی اور اس فکر کو لے کر اٹھنے والوں کی اس پر سختی سے پابندی کے ساتھ ہے

اور عوام الناس میں فکر کی عام قبولیت کے ساتھ ہے۔ جب یہ باتیں پوری ہو جائیں تو نصرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور پھر جماعت اسے طلب نصرہ کے ذریعے حاصل کرے گی۔ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا، یہ تمام کام اللہ کے احکامات ہیں اور قطعی طور پر ان امور کی جانچ کہ یہ مکمل ہوئے ہیں یا نہیں، یہ اللہ پر چھوڑا جائے گا۔ اور جماعت کے ذریعے ایسی کوئی بھی جانچ صرف غلبۃ الظن کی حد تک ہو سکتی ہے۔

جب نصرہ کے عوامل حاصل ہو جائیں گے تو نصرہ آکر رہے گا ورنہ اس میں دیر ہو سکتی ہے۔ اللہ کی نصرت میں دیر ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ طریقہ میں غلطی ہوئی ہے، اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ تیاری اور مستعدی کا درجہ ابھی کافی نہیں ہے اور اس کے لیے مزید تیاری کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ دیر ہونے کا سبب، جماعت یا گروہ کے شباب کے لیے اللہ کی جانب سے آزمائش ہو سکتی ہے کہ جماعت منہدم ہوتی ہے یا اپنے عہد پر قائم رہتی ہے، یا ان میں سے کون ناامید ہو کر بیٹھ جاتے ہیں؟ وجہ کچھ بھی ہو بہر حال طریقہ پر نظر ثانی ضروری ہے کہ ہمارا طریقہ شرع سے ہٹا ہوا تو نہیں؟۔ اور جب تک جماعت کے پاس کوئی ایسی وجہ موجود نہ ہو جو طریقہ کی تبدیلی کا متقاضی ہو تو صرف نصرہ کے ملنے میں دیر ہونے کی وجہ سے طریقے کو تبدیل کرنا جائز نہیں، البتہ جماعت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے وسائل اور طرز عمل کی جانچ کرے جو کہ اصلاً مباح یا جائز ہیں اور زیادہ مناسب اسلوب اور مزید بہترین وسائل اختیار کرے۔ اس بنا پر دیر ہونے کا مطلب ضروری نہیں کہ ناکامی ہوئی ہے، اس کے علاوہ ایسے شرعی دلائل نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ ایک خاص مدت کے اندر مقصد تک رسائی ہونا لازمی ہے۔

یہ ضروری ہے کہ طریقہ سے جڑے ہوئے افکار و احکام کی صحت پر نظر رکھی جائے اور انہی افکار و احکام کے ذریعے شباب اور امت کی تیاری ہوگی۔ اگر یہ افکار اور احکام جماعت کی نظر میں صحیح اور حق ہیں اور بہترین وسائل اور اسلوب اختیار کئے گئے ہیں پھر جماعت پر ضروری ہے کہ وہ صبر و

استقامت کے ساتھ اختیار کردہ افکار اور طریقہ پر ثابت قدم رہے ایسی صورت میں ان میں کسی قسم کی تبدیلی جائز نہیں چاہے نصرہ حاصل ہونے میں کتنی ہی دیر لگ جائے۔

تبدیلی کا مسئلہ امت میں تبدیلی کا ہے نہ کہ افراد میں تبدیلی کا، معاشرے کو بدلنا افراد کے بدلنے سے بڑی چیز ہے کیونکہ اس میں دیگر دوسری چیزوں میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اس وجہ سے اس کی حرکت کی رفتار بڑی دھیمی ہوتی ہے جس کا نظر آنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ صرف وہ کر سکتا ہے جو خداداد بصیرت کا مالک اور معاشرے کو باریک بینی سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کام کرتے وقت مسلمان کے ذہن میں ہونا چاہئے کہ یہ کام اس کے ہاتھوں نہیں ہو گا یا یہ کام آئندہ نسلوں کے ہاتھوں انجام پائے گا بلکہ فرد اور جماعت کے افراد کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ کام ہمارے ہی ہاتھوں ہو گا، اور ان شاء اللہ اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک فرد کی عمر کم یا زیادہ ہو سکتی ہے اور اللہ کا وعدہ کسی فرد یا افراد کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اللہ کا وعدہ جماعت کے ساتھ ہے۔ پس یہی وہ طائفہ مومنہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خلافت (استخلاف) کا وعدہ فرمایا ہے، اس کام کے دوران فرد کا یا امیر کا بھی انتقال ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سارے لوگ اس راستے میں ختم ہو جائیں، لیکن جب تک جماعت باقی ہے جو اللہ کے حکم کو پورا کرنے میں لگی رہے گی تب تک اللہ کا وعدہ قائم ہے، اللہ کی نصرت انہیں نصیب ہو کر رہے گی جلد ہو یا بدیر۔ نصرہ کب ملے گی اس کا علم صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو ہے اور کوئی بھی اس کے لئے ذمہ دار نہیں ہے ہاں جماعت طریقے کے التزام یعنی پابندی کی ذمہ دار ہے۔

لہذا یہ نہ کہا جائے کہ حکم شرعی ایک تجربہ ہے، اس طرح کہ اگر مقصد کو حاصل کرنے میں دیر ہو جائے تو ہم اس کو ناکام قرار دیں گے اور پھر کسی دوسرے تجرباتی عمل کی تیاری میں اس حکم کو جھٹک دیں گے یا چھوڑ دیں گے۔ جب تک ہمیں اس کے شرعی حکم ہونے کا پورا یقین ہو اور اس کے دلائل بھی موجود ہوں تو اس کو تجرباتی کہنا صحیح نہیں۔ البتہ وسائل اور اسلوب تجربے کے تحت اپنانے چاہئیں۔

## شرعی طریقہ کے مخالف پیش کئے جانے والے طریقے

جہاں ہم نے رسول اللہ ﷺ کے طریقے، اس کی پیروی کرنے اور اس سے انحراف نہ کرنے کی اہمیت کو بیان کیا ہے وہیں اس کے برعکس ہمیں بعض دوسرے طریقے بھی ملتے ہیں جو کچھ اسلامی جماعتوں یا مسلم مفکرین نے اس معاملہ میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ کہنے والا کون ہے اس بات پر دھیان دئے بغیر ہم یہ غور کریں گے کہ بات کیا کہی گئی ہے اور اس معاملہ کی فوری جانچ کر کے اس پر سے پردہ اٹھائیں گے تاکہ ایک مسلمان کو حیرت و پریشانی کا سامنا نہ ہو اور ان پیش کشوں کی بھول بھلیوں میں پڑ کر وقت برباد نہ کر بیٹھے، یا پھر دعوت کے بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہو جائے۔ ہم یہاں طریقے کے دعوؤں میں سے اہم ترین کا بیان کریں گے:

کچھ مسلمانوں کا یہ خیال ہے کہ خلافت کے قیام کے عمل کو صرف حکمرانوں اور ان کے درباریوں کو دعوت دینے تک محدود رکھنا ضروری ہے:

الملاء یعنی حکمرانوں کے درباری سردار لوگ، جن کے ہاتھوں میں معاملات کے فیصلے ہوتے ہیں اور یہ افراد عام طور پر حکمرانوں کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ دعوت اگر کامیاب ہو جاتی ہے تو معاشرے آسانی سے اسلام کے مطابق تبدیل ہوں گے ورنہ تبدیلی ناممکن ہوگی۔ جس معاملہ کی وجہ سے ایسی سوچ قائم ہوتی ہے کہ اس دعوت کو صرف حکمرانوں اور سرداروں تک محدود کر دیا جائے، وہ معاملہ یہ ہے کہ خلافت کے کام میں عام مسلمانوں کو دعوت دینے کی صورت میں

مسلمانوں کو حکمرانوں کی طرف سے ذلت کا نشانہ بننا پڑے گا اور ان پر اس حد تک دباؤ اور بوجھ پڑ جائے گا جس کو وہ شائد برداشت نہیں کر پائیں گے، اور مسلمان کو اس سے منع کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا: **(( لا ینبغی لمسلم أن یذل نفسه یتعرض من البلاء لما لا یطیق ))** (احمد والترمذی وابن ماجہ) ”کسی مسلمان کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ کہا گیا کہ کوئی کس طرح خود کو ذلیل کرے گا؟ فرمایا: کہ اپنے آپ کو ایسی آزمائش میں ڈال دے جس کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔“

اس کا جواب دینے کے لئے ان شاء اللہ ہم دعوت کے متعلق سے اللہ کی سنت اور اس کی مخالف یا موافقت میں الملاء کا کردار اور رسول اللہ ﷺ کی دعوت میں ان سے متعلق کئے گئے اقدامات کو سمجھیں گے۔ جن حالات و واقعات میں تبدیلی کی صدائیں بلند ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ظلم و نا انصافی، اخلاقی بگاڑ، تباہی و بربادی اور تکلیفیں اور پریشان کن حالات پھیلے ہوئے ہوں، ان معاشروں میں تبدیلی کی گونج سنائی دیتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام مسائل اللہ پر ایمان نہ ہونے اور اللہ کو حاکمیت کا مستحق نہ ماننے کے نتیجہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ہمارے آقا رسول اللہ ﷺ پہلے لوگوں کو ایمان لانے اور اللہ کے بندے بننے کی طرف بلایا کرتے تھے۔

معاشرے چاہے وہ آج کے معاشرے ہوں یا قدیم، ان کی قیادت حکمرانوں اور اہم افراد (الملاء) کے پاس ہوتی ہے جو معاشرہ کے تمام فیصلے کرتے ہیں اور ان کو کسی ایک راستہ پر ڈالتے ہیں۔ عقائد کے جھوٹے تصورات اور ان سے نکلنے والے قوانین حکمرانوں کے مفاد کے لئے بنتے ہیں۔ وہ اپنے فائدے اور اپنی کرسی کی حفاظت کے لیے ان جھوٹے عقائد کی حفاظت کرتے ہیں اور ان غلط عقائد کو



پالنے اور سنبھالنے کی بڑی ذمہ داری خود اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ چنانچہ اس بات کو جاننے والے ایک اعرابی (دیہاتی عرب) نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو پہلی دفعہ سنتے ہی یہ قابلِ غور اور سچا جملہ کہا تھا کہ: **(ان هذا امر تکرهه الملوك)** ”یہ بات بادشاہوں کو پسند نہ ہوگی۔“

معاشرہ میں رہنے والے لوگ حکمرانوں اور اہم سرداروں (الملاء) کے تابع فرمان ہوتے ہیں کیونکہ یہی لوگ اثر و رسوخ اور قوت رکھتے ہیں، چنانچہ معاشرہ کے عام لوگ معاشرہ پر اثر انداز ہونے کی بجائے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ نظام سے نفرت کرنے کے باوجود بے بس ہو کر خود کو اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان حکمرانوں سے چھٹکارا پانے کے لئے انہیں بہت بڑی قیمت چکانی پڑے گی۔ انبیاء اور رسولوں کو جب اللہ تعالیٰ نے بھیجا تو ان کو ان طاقتور لوگوں ہی کی طرف بھیجا تاکہ وہ ان لوگوں کو حق بتلائیں اور سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کریں۔ ایسے میں ان لوگوں میں سے جن افراد نے انبیاء کو جواب دینے اور ان کی مخالفت کرنے کی ذمہ داری خود اٹھائی وہ اس قوم کے حکمران اور اس کے سردار (الملاء) تھے۔

سرداران قوم (الملاء) حکمرانوں کی مدد کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اس کے علاوہ یہ مفاد پرست، مالدار اور اعلیٰ درجہ کے عیش پرست لوگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگوں کے سربراہ اور سردار ہوتے ہیں، یہی لوگ حکمرانوں کا سیاسی اور فکری سہارا اور ذریعہ بنتے ہیں اور حکمران انہی پر بھروسہ کرتا ہے اور ان ہی سے مدد حاصل کرتا ہے۔ انہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انبیاء کی مخالفت میں کھڑے ہونے والوں میں یہی لوگ پیش پیش ہوتے ہیں، کیونکہ ان کے دلوں میں مال اور رتبہ کی چاہت بھر گئی ہوتی ہے، معاشرہ میں ان کے مقام و مرتبہ سے ان کے فائدے و نقصانات جڑے رہتے ہیں۔ اس وجہ سے جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی طرف سے دعوت آتی ہے تو یہ اس دعوت کو اپنے مفادات اور مقام و

رتبہ کی دشمن تصور کرتے ہیں، کیونکہ معاشرہ میں دعوت کے پھیلاؤ سے پیدا ہونے والی بیداری سے انہیں اپنا مقام اور اس کا فائدہ خطرے میں نظر آتا ہے چنانچہ یہی اس دعوت کا پہلے سامنا کرتے ہیں اور حکمرانوں کو اس دعوت کے خلاف لڑنے، اس کو ختم کرنے کے لئے اکساتے ہیں، اور ان کی نظروں میں یہ عمل خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر حکمران ان کے "خیر خواہانہ مشوروں" کے آگے سپر انداز ہو کر اپنی بدی اور گناہ کی طبیعت پر چلتے ہوئے دعوت کی آواز کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں اللہ کے نبیوں کا حکمرانوں اور ان کے درباریوں (الملاء) کے ساتھ سخت معرکہ شروع ہو جاتا ہے، اور پھر لوگوں کو اپنی جانب جیتنے کی خاطر ایک فکری اور سیاسی کشمکش شروع ہوتی ہے جس میں اللہ کا نبی ایک جانب تو دوسری جانب حکمران اور اس کے ہم نوا (الملاء) ہوتے ہیں۔ انبیاءؑ نہتے اور کمزور ہونے کے باوجود سچائی کے ساتھ حق کی طرف دعوت دیتے ہیں، ان کے پاس سوائے اس کلمہ حق کی قوت کے کوئی اور طاقت نہیں ہوتی، جس کا لوگوں کے ذہنوں اور قلوب پر اثر ہوتا ہے۔ حکمران اور اس کے ہم نوا (الملاء) ابتدا میں ان کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کر کے مقابلہ کرتے ہیں مثلاً یہ کہہ کر کہ 'یہ بات جادو ہے' یا 'یہ پرانے لوگوں کے قصے ہیں'، یا 'اس دعوت والے پر کسی شے کا اثر نہیں ہے' یا 'یہ جھوٹے ہیں' اور 'ان کی بات پر یقین کرنے والے کم عقل اور ہم میں سے نچلے درجہ کے لوگ ہی ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب ان باتوں سے کام بنتا نظر نہیں آتا تو پھر یہ لوگ عذاب دینے، بے گھر اور نکال باہر کرنے، پکڑ دھکڑ اور قتل کرنے پر اتر آتے ہیں، یوں انبیاءؑ اور ان کے ماننے والوں اور حکمرانوں اور ان کے ہم نواؤں (الملاء) اور جو لوگ بادشاہ کے دین پر ایمان رکھتے ہیں ان کے درمیان وسیع ترین سطح پر معرکہ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ہے اس دعوت میں اللہ کی وہ سنت جس کو قرآن نے بار بار بتلایا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا نوح علیہ السلام جب اپنی قوم کو دعوت دیتے ہیں تو سب سے پہلے جو لوگ آپ کی مخالفت میں اترے وہ قوم کے سردار (الملاء) تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں بیان

کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ قَالَ يَا قَوْمِ لَيْسَ بِي ضَلَالَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ ۝﴾ (الاعراف : 59 - 61) ”ہم نے نوح کو اُن کی قوم کے پاس بھیجا۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ یقین جانو مجھے سخت اندیشہ ہے کہ تم پر ایک زبردست دن کا عذاب نہ آکھڑا ہو۔ ان کی قوم کے بڑے لوگوں نے کہا ہم تم کو صریح غلطی میں دیکھتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں تو ذرا بھی گمراہی نہیں لیکن میں پروردگار عالم کا رسول ہوں۔“

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیدنا ہود علیہ السلام جب اپنی قوم عاد کو دعوت دیتے ہیں۔ تو سب سے پہلے جس نے آپ کی مخالفت کی اور جھٹلایا وہ آپ کی قوم کے سردار (الملاء) تھے۔ اس کو بھی اللہ تعالیٰ سورہ اعراف میں بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ أَفَلَا تَتَّقُونَ ۝ قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ إِنَّا لَنَرَاكَ فِي سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (الاعراف 65-66) ”اور قوم عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا۔ انہوں نے کہا: ”اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ کیا پھر بھی تم اللہ سے نہیں ڈرو گے؟“ اُن کے قوم کے سردار (الملاء) جنہوں نے کفر اپنا رکھا تھا، کہنے لگے: ہم تو یقینی طور دیکھ رہے ہیں کہ تم بے وقوفی میں مبتلا ہو، اور بیشک ہمارا گمان یہ ہے کہ تم ایک جھوٹے آدمی ہو۔“

اسی طرح دیکھیں کہ جب سیدنا صالح علیہ السلام نے اپنی قوم ثمود کو دعوت دی تو آپ کی دعوت کو سب سے پہلے جھٹلانے والوں میں آپ کی قوم کے سردار (الملاء) ہی تھے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا

لَكُمْ مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ... ﴿ (الاعراف: 73) ”اور تُمہود کی طرف ہم نے اُن کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اُنہوں نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اُس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ...“

مزید ان کے واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا: ﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّنْ رَبِّهِ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ﴿76﴾ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَافِرُونَ ﴿75﴾ (الاعراف: 75-76) ”اُن کی قوم کے سرداروں (الملاء) نے جو بڑائی کے گھمنڈ میں تھے، اُن کمزوروں سے پوچھا جو ایمان لے آئے تھے کہ: ”کیا تمہیں اس بات کا یقین ہے کہ صالح اپنے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں؟“ اُنہوں نے کہا کہ: ”بیشک ہم تو اُس پیغام پر پورا ایمان رکھتے ہیں جو اُن کے ذریعے بھیجا گیا ہے۔ وہ مغرور لوگ کہنے لگے: ”جس پیغام پر تم ایمان لائے ہو، اُس کے تو ہم سب منکر ہیں۔“

یہی حال شعیب علیہ السلام کا ہے جب اُنہوں نے مدین میں اپنی قوم کو دعوت دی تو وہاں کے متکبر سرداروں (الملاء) نے آپ کی مخالفت کی۔ سورۃ الاعراف میں اس کو اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِّنْ إِلَهِ غَيْرُهُ ... ﴿85﴾ (الاعراف: 85) ”اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُنہوں نے کہا: ”اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے ...“

مزید ان کے واقعہ کو اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِنْ قَوْمِهِ لَنُخْرِجَنَّكَ يَا شُعَيْبُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِي مِلَّتِنَا قَالَ أَوَلَوْ كُنَّا كَارِهِينَ ﴿88﴾ (الاعراف: 88) ”اُن کی قوم کے سردار جو بڑائی کے گھمنڈ

میں تھے، کہنے لگے: "اے شعیب! ہم نے پکارا رہ کر لیا ہے کہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ تمام ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال باہر کریں گے، ورنہ تم سب کو ہمارے دین میں واپس آنا پڑے گا۔" شعیب نے کہا: "اچھا؟ اگر ہم (تمہارے دین سے نفرت کرتے ہوں، تب بھی؟"

یہ موسیٰ علیہ السلام ہیں جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو فرعون اور اس کے ہم نواؤں کی طرف بھیجا تو ان کے سرداروں (الملاء) نے آپ کو جھٹلایا اور ان لوگوں کو ڈرایا جو آپ کے ساتھ تھے۔ آپ کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے فرعون کو آپ کے قتل پر اکسایا، اس کو اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهِمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ فَظَلَمُوا بِهَا فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ﴾ (الاعراف: 103) ”پھر ہم نے ان سب کے بعد موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں (الملاء) کے پاس بھیجا، تو انہوں نے (بھی) ان (نشانیوں) کی ظالمانہ ناقدری کی۔ اب دیکھو کہ ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔“

مزید ان کے واقعہ کو اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿قَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ إِنَّ هَذَا لَسَاحِرٌ عَلِيمٌ﴾ (الاعراف: 109) ”فرعون کی قوم کے سردار (ایک دوسرے سے) کہنے لگے کہ: "یہ تو یقینی طور پر ماہر جادوگر ہے۔“

اور اس کو مزید اللہ نے یوں بیان فرمایا ہے: ﴿وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَنْذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ...﴾ (الاعراف: 127) ”اور فرعون کی قوم کے سرداروں (الملاء) نے کہا: "کیا آپ موسیٰ اور اُس کی قوم کو کھلا چھوڑ رہے ہو، تاکہ وہ زمین میں فساد مچائیں اور آپ اور آپ کے خداؤں کو پس پشت ڈال دیں؟“

مزید یوں بیان کیا کہ: ﴿فَمَا آمَنَ لِمُوسَىٰ إِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهِ عَلَىٰ خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِمْ أَن يَفْتِنَهُمْ وَإِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِي الْأَرْضِ وَإِنَّهُ لَمِنَ

المُسْرِفِينَ ﴿۸۳﴾ (یونس: ۸۳) ”پھر یہ ہوا کہ موسیٰ پر کوئی اور نہیں ان کی قوم کے کچھ نوجوان فرعون اور اپنے سرداروں (الملاء) سے ڈرتے ڈرتے ایمان لائے کہ کہیں فرعون ہمیں نہ ستائے، اور یقیناً فرعون زمین میں بڑا زور آور تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر قائم نہیں رہتے۔“

رسول اللہ ﷺ کی سیرت جو انبیائے سابقین کی سیرت سے مختلف نہیں، ہمیں بتاتی ہے کہ مکہ میں بھی سرداروں (الملاء) نے آپ ﷺ کی دعوت کے بارے میں کچھ الگ رویہ نہیں اپنایا تھا، آپ ﷺ کو بھی پہلے انبیاء کی طرح آزمائشوں سے گزرنا پڑا، مکہ میں دعوت کے جامد ہو جانے کی وجہ کیا تھی؟ وہ کیا بات تھی جس نے لوگوں کو روک دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی دعوت سنیں اور اس پر ایمان لائیں، یہ سخت ترین تعاقب اور تشدد تھا جو آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں سے روا رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مومن کو یہ ڈر ہوتا تھا کہ کہیں ان کی قوم انہیں اور ان کے ساتھ اہل و عیال کو ایمان کی وجہ سے آزمائش میں نہ ڈالے، اور جو ایمان لانا چاہتے تھے وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ ان کا بھی وہی حشر ہو گا جو مومنوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ یوں مومنوں اور ان کے مخالفین کے درمیان معرکہ برپا ہو گیا جس کی قیادت سردارانِ قوم (الملاء) کے ہاتھوں میں تھی۔ لیکن بالآخر ان سرکش طاغوتوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی، اور اس کے بعد حق کی طرف دعوت دینے والوں نے اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

بخاری میں ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ: ((بینما النبی ﷺ ساجد وحولہ ناس من قریش جاء عقبہ بن ابي معیط بسلا جزور، فقفہ علی ظہر النبی ﷺ، فلم یرفع رأسہ فجاءت فاطمة علیہا السلام فأخذتہ من ظہرہ و دعت علی من صنع ذلک. فقال النبی ﷺ: ((اللهم علیک الملاء من قریش: أبا جہل بن ہشام و عتبہ بن ربیعہ و أمیة بن خلف،..)) قال

ابن مسعود رضی اللہ عنہ: فرأيتهم قتلوا يوم بدر فألقوا في بئر))  
 (البخاری) ”ایک دفعہ جب نبی ﷺ سجدے میں تھے اور قریش کے کچھ لوگ آپ ﷺ کے  
 آس پاس تھے اتنے میں عقبہ بن ابی معیط او جڑی لے کر آیا اور ان کو نبی ﷺ کے پشت پر ڈال دیا  
 آپ ﷺ سر نہ اٹھاپائے۔ پھر فاطمہؓ آگئیں اور اس کو ہٹایا اور یہ جسارت کرنے والوں کو بد عادی۔  
 نبی ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ، قریش کے (الملاء) سرداروں ابو جہل بن ہشام، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ  
 بن خلف کی پکڑ کر... ابن مسعودؓ کہتے ہیں، سب لوگوں کے ساتھ میں نے ان لوگوں کو بدر میں دیکھا کہ  
 ان کو قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا۔“

رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مکہ میں حاکم کوئی ایک شخص اور اس کے ہم نوا نہیں تھے بلکہ  
 وہاں کئی سارے سردار (الملاء) تھے، اور انہی لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی مخالفت کی اور  
 لوگوں کو اس دعوت سے دور بھگانے اور روکنے کی کوششیں کیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دیگر تمام انبیاء کو صرف ان کی قوم کی طرف بھیجا گیا تھا جبکہ رسول  
 اللہ ﷺ کو اس دعوت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔

قریش کے سرداروں نے اگر شدت سے جھٹلایا اور بڑی رکاوٹیں کھڑی کیں تو اس کے معنی یہ  
 نہیں ہیں کہ دعوت صرف ان سرداروں کو ہی دی جا رہی تھی اور ان تک ہی محدود تھی، بلکہ مکہ کے  
 معاشرے میں رسول اللہ ﷺ نے بلا تفریق سب کو دعوت دی، آپ ﷺ کی دعوت نے کسی امیر اور  
 غریب کے درمیان، مالک اور غلام کے درمیان فرق نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نبی ﷺ نے جب صرف ابن  
 مکتوم کی بات سے توجہ ہٹائی تو آپ ﷺ کے رب نے سورۃ عبس کے ذریعے نرمی کے ساتھ تنبیہ کی، ابن  
 مکتوم ایک نابینا اور غریب مؤمن تھے، جب سرداروں سے آپ ﷺ کی ملاقات ہو رہی تھی، رسول

اللہ ﷺ ان سرداروں یا ان کے پیروکاروں کے ایمان لے آنے کی امید میں فکر مند ہو کر ان سے گفتگو کر رہے تھے اور ابن ام مکتومؓ کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ اس تنبیہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سردارانِ قوم کو دعوت دینے کی ضرورت ختم ہو گئی تھی یا اس سے منع کیا گیا بلکہ تنبیہ، دعوت میں کسی بھی قسم کا امتیاز نہ برتنے کے لئے تھی۔ کیونکہ طلب کے اعتبار سے دعوت کا عام حکم سرداروں اور عام لوگوں کے لئے ایک جیسا ہے۔ اس لئے سرداروں کو دعوت دینا عام لوگوں کو دعوت دینے کی طرح ہے۔

چنانچہ سیرت میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سرداروں اور لیڈروں کو دعوت دیتے تھے تو یہ دعوت صرف ان سرداروں کو دعوت نہیں ہوتی تھی بلکہ آپ ﷺ کی نیت ہوتی تھی کہ ان سرداروں کی پیروی کرنے والے عام لوگ ایمان لے آئیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس دعوت میں سب لوگ مخاطب اور شامل ہوا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ کئی ایسے لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا جو اپنی قوم کے سردار نہیں مانے جاتے تھے جیسے بلالؓ، عمارؓ، ان کے ماں باپ۔ اس طرح دیگر افراد جیسے صہیب اور سلمانؓ یہ بھی قریش کے سردار نہ تھے اور اسی طرح عام بن فہیرؓ، ام عیسؓ، زبیرؓ، الخدیہؓ اور ان کی بیٹی، اور بنی مومل کی باندی یہ سب غلام تھے جنہیں ابو بکرؓ نے آزاد کر لیا تھا، یہ تمام ابتدائی دور کے مومنین میں سے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ابتدا میں ہر اس شخص کو دعوت دیتے تھے جس کے اندر بھلائی محسوس کرتے تھے، بعد میں آپ ﷺ نے تمام لوگوں کو دعوت دی۔ اس لیے آپ ﷺ کی قوم کے چھوٹے بڑے، شرفاء اور عام لوگ سب آپ ﷺ پر ایمان لاتے تھے۔ دعوت کے موضوع میں کسی قسم کی حد بندی نہیں ہے بلکہ اس میں تمام لوگ شامل ہیں۔ دعوت اس طریقہ پر کی جائے گی جو رسول اللہ ﷺ نے



اختیار کیا چنانچہ پھر ان شاء اللہ ہمیں بھی وہ کامیا بیاں ملیں گی جو دارالاسلام کو قائم کرنے میں رسول اللہ ﷺ کو ملی تھیں۔

کچھ مسلمان سمجھتے ہیں کہ اصل مقصد عبادت ہے اسلامی ریاست کے لیے کام کرنا نہیں:

مزید یہ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی تھی اسلامی ریاست کے قیام کی طرف نہیں دی تھی، یا یہ کہ اصل اور بنیادی چیز اللہ کی عبادت ہے اسلامی ریاست نہیں، ضروری نہیں کہ ہم اسلامی ریاست قائم کریں بلکہ ضروری یہ ہے کہ ہم اللہ کی عبادت کریں۔ اس اعتراض کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں ہم بیان کریں کہ عبادت کی حقیقت کیا ہے اور وہ کس طرح ادا ہوتی ہے؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے، چنانچہ عبادت ہی انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔ لا الہ الا اللہ کے معنی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ کے سوا باقی سب باطل ہیں جن کا انکار کرنا فرض ہے اور اس بات کی گواہی دینا مسلمان پر فرض ہے۔ اور محمد رسول اللہ کے معنی ہیں کہ عبادت اور اطاعت اسی طرح کی جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ اپنے رب سے لے کر آئے ہیں اور اس کی گواہی بھی انسان پر فرض ہے۔ پس عبادت صرف اللہ کی ہے اور عبادت صرف اس طریقے پر ہوگی جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے۔

عبادت صرف اللہ کے لئے ہے اور عبادت صرف اللہ کی شریعت کے مطابق ہوگی تو اسے عبادت کہا جائے گا، جس کو ہمارے آقا سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ لے کر آئے ہیں، یہ بنیادی اصول ہے، جس کی موجودگی ہماری زندگی کے ہر فعل اور قول میں ضروری ہے۔

چنانچہ جب ایک مسلمان اپنی زندگی میں کوئی بھی ضرورت پوری کرنے یا کسی اقدار کو حاصل کرنے کے لیے کوئی کام انجام دیتا ہے تو وہ ساری محنت صرف اس مقصد سے کرتا ہے تاکہ اس کی انسانی ضروریات یا جبلتوں کی تکمیل ہو جائے اور اس کی ضروریات اور جبلتوں کو پورا کرنے کے لئے کئی طریقے ہو سکتے ہیں، وہ ان میں سے کسی بھی طریقے سے انہیں پورا کر سکتا ہے۔

چنانچہ ان ضروریات اور جبلتوں کو جب وہ اپنی خواہش کی بجائے خالص شرعی طریقے سے پورا کرتا ہے اور اس طرح اپنے عمل کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے ساتھ جوڑ دیتا ہے تو مسلمان کا یہ عمل اللہ کی عبادت بن جاتا ہے۔

اب چونکہ انسان کے ہر عمل کے پیچھے اس کی انسانی ضرورت یا اس کی کوئی خواہش کار فرما ہوتی ہے اور انسانی ضرورتوں اور خواہشات کا رشتہ زندگی کے ہر پہلو سے جڑا ہوتا ہے یعنی انسان کو ضرورت اور خواہش زندگی کے ہر پہلو میں ہوتی ہے، چنانچہ انسان زندگی کے ہر پہلو میں کوئی نہ کوئی عمل کرتا رہتا ہے۔

اب عبادت یہ ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال کو اللہ کے اوامر اور نواہی کے مطابق انجام دے، یعنی اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان کی بنیاد پر اللہ کے حکم کے مطابق کوئی عمل کرے یا کسی عمل سے رک جائے، یوں انسان کے سارے اعمال عبادت بن جائیں گے۔

جب آپ دوسرے مسلمان سے یہ کہتے ہیں کہ ”اللہ کی عبادت کرو“ تو اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ آپ یہ نہیں کہہ رہیں کہ صرف نماز پڑھو، زکوٰۃ دو یا حج کرو یا ان اعمال کو انجام دو جن کو فقہاء نے عبادات کے باب میں لکھا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان تمام کو بجالائے اور جن باتوں کو حرام بتا کر منع فرمایا ہے ان سے دور ہو جائے۔ رسول

اللہ ﷺ کے زمانہ میں تمام احکام پر پابندی کو عبادت تسلیم کیا جاتا تھا چاہے اس کا تعلق کسی بھی فعل سے ہو، یعنی اس دور میں عبادت کا مطلب تمام اوامر و نواہی کی اطاعت اور فرمانبرداری تھی اور یہی عمل بعد میں بھی رہا اور اس دوران فقہاء نے اسلام کی بہتر سمجھ کے لئے مختلف افعال کی درجہ بندی کی۔ وہ افعال جن میں انسان کا اللہ سے تعلق شامل ہے ان کو 'عبادات' کے فقہی درجہ میں رکھا گیا، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، اس کے علاوہ انسان کے دیگر افعال جن میں انسان کا خود سے اور دوسرے انسان یا مخلوق سے تعلق ہے ان کے لئے دیگر درجات بنائے گئے جیسے معاملات، عقوبات، اخلاقیات وغیرہ، آج امت میں فکری اخطا کی وجہ سے مسلمانوں میں عبادات سے مراد عام طور پر صرف ان افعال کو لیا جانے لگا ہے جنہیں فقہاء نے 'عبادات' کے فقہی درجہ میں رکھا تھا۔ چنانچہ تمام احکامات میں اطاعت و فرمانبرداری عبادت ہے یا دوسرے الفاظ میں دنیا میں بندہ کو جن اعمال کی ضرورت پیش آئے ان افعال میں اللہ اور اللہ کے نبی ﷺ کے حکم پر پابندی و اطاعت کرنا عبادت ہے، کیونکہ مسلمان ہر کام کرتے وقت اللہ کا بندہ ہوتا ہے نہ کہ صرف رسمی عبادات جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے افعال کو انجام دیتے وقت بندگی بجا لاتا ہے۔

اس طرح تمام افعال کی بنیاد اللہ پر ایمان ہے۔ عبادت کا مقصد یہ ہے کہ تمام اعمال اور تمام کاروائیوں کو اللہ پر ایمان کی بنیاد پر استوار کیا جائے، اس طرح پورا دین اللہ کی عبادت ہے اور عبادت کے معنی اطاعت ہیں، اللہ کی بندگی کرنے کا مطلب علیم و خیر رب کے آگے عاجز بننا، اور عبادت کرنا ہے اور یہ کہ ہم رضا اور اطاعت کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کی عبادت اور بندگی میں سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، کفار اور منافقین کے خلاف اللہ کی راہ میں جہاد فی سبیل اللہ، مسلمانوں کی زندگی میں اسلام کو نافذ کرنا، انسانوں

کے درمیان دعوت کو پھیلانا، مسلمانوں کی حفاظت کرنا وغیرہ اعمال بھی شامل ہیں، جیسا کہ اللہ کی عبادت و بندگی میں نماز، زکوٰۃ اور قیام اللیل (تہجد) وغیرہ شامل ہیں۔

عبادت جو انسان کے تمام اعمال پر محیط ہے، ایک مسلمان اس کو اپنے حالات کے مطابق انجام دیتا ہے۔ مثلاً اگر ایک مسلمان نماز نہیں پڑھ رہا ہو تو اس کو نماز کے لئے بلانا عبادت کی دعوت ہے، اور اس کو روزے کی طرف دعوت دینا عبادت کی دعوت ہے، اس کو دعوت دینا کہ وہ شریعت اسلامی کے مطابق خرید و فروخت کرے تو یہ عبادت کی دعوت ہے۔ چونکہ ہر عبادت کی بنیاد اللہ پر ایمان ہے چنانچہ نماز، روزہ وغیرہ کی دعوت سے پہلے ایمان کا تذکرہ کر کے ایمانی تعلق کو بھڑکانا ضروری ہے، چنانچہ جس کسی کو بھی دعوت دی جائے اس کے اندر پہلے ایمان کو متحرک کر دیا جائے تاکہ یہ ایمان اس کو شرع کا پابند بننے اور اعمال کے لئے تیار ہونے پر مجبور کرے۔

اسی طرح لوگوں کو اسلام کے قیام کی دعوت، اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے کی دعوت اللہ کے احکام میں سے ہے، جن کی فرمانبرداری فرض ہے۔ اس دعوت کو وہی انجام دیتا ہے جس کا اللہ پر ایمان ہو۔ چنانچہ ان احکامات کی دعوت سے پہلے ایمان کی طرف دعوت دینا ضروری ہے، چنانچہ اگر دعوت کو اسی ترتیب پر کیا جائے گا تو یہ دعوت ان احکامات کے معاملہ میں اللہ کی عبادت ہے۔

اور چونکہ موجودہ حالات میں مسلمان کفریہ نظاموں کے سائے تلے زندگی گزار رہے ہیں اور ان نظاموں کے قوانین اللہ کے قوانین سے اخذ شدہ نہیں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے مسلمان ان نظاموں تلے اسلامی طریقے پر زندگی نہیں گزار پارہے ہیں، چنانچہ دین کو قائم کرنے کی دعوت ان

حالات میں اللہ کی عبادت کی طرف دعوت ہے، جس کی جانب لوگوں کو تیار کرنا اور اس کے لئے کوششیں بروئے کار لانا ضروری ہے۔

اس وجہ سے ہم پر لازم ہے کہ اللہ کی عبادت کی طرف دعوت کو آج کے دور کے حالات اور مسائل سے جوڑ دیں۔ عبادت کی طرف دعوت اسلامی زندگی کے دوبارہ قیام کی دعوت کی شکل میں ہوتی ہے جہی اللہ کی عبادت مکمل شکل میں قائم ہوتی ہے۔ لہذا اسلامی ریاست کے قیام کی دعوت حقیقت میں دین کے قیام کی دعوت ہے اور دین کو قائم کرنا عبادت ہے، چنانچہ دین کو قائم کرنے کی دعوت اللہ کی مکمل عبادت کی طرف دعوت ہے۔ اس طرح یہ دعوت عبادت کی دعوت ہے، کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے جس پر ہم نے ایمان لایا ہے۔ چنانچہ جو مسلمان اس حکم کو نظر انداز کرے گا اور اس پر کام نہیں کرے گا وہ یقیناً اللہ کی عبادت میں کوتاہی کرنے والا ہوگا۔

اس لئے بعض مسلمانوں کی جانب سے یہ معاملہ جس انداز سے پیش کیا جاتا ہے بالکل غلط ہے کیونکہ اس سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ خلافت کے قیام کے لیے کام کرنا اور عبادت کرنا دونوں ایسی مخالف باتیں ہیں جو آپس میں ٹکراتی ہیں۔ پھر اس وجہ سے بھی یہ زیادہ سنگین غلطی ہے کہ ایسی رائے رکھنا قرآن کے ایک حصہ کے ذریعے قرآن کے دوسرے حصہ پر حملہ کرنا ہے جس سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے، غور کریں۔

**کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت سے ثابت نہیں:**

ایسا کہنے کا مطلب ہے کہ جو نصوص یقینی نہیں ہیں، ہم پر ان کی پابندی لازمی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہمارا ان پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بات ان کی اس رائے کی حمایت

میں دلیل ہے کہ جب خلافت قائم کرنے کے لئے عمل کے وقت رسول اللہ ﷺ کے مکی دور کے افعال کی پیروی نہیں کی جائے گی، حالانکہ یہ بات خود ان کے خلاف دلیل ہے۔

ہم اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ سیرت اخبار (روایتوں) اور واقعات کا مجموعہ ہے، جن میں تحقیق اور چھان بین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور چونکہ اس کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے افعال سے ہے اس لئے وہ وحی کا حصہ ہیں۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرت کا ایسا اہتمام کریں، جتنا وہ کتاب و سنت کا اہتمام کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی مکی سیرت میں وہ افعال و اعمال شامل ہیں جن کو آپ ﷺ نے مکہ میں رہتے ہوئے انجام دیا جس کے سبب مدینہ میں دارالاسلام وجود میں آیا۔ چنانچہ سیرت کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے وہ لوگ گنہگار ہوں گے جو سیرت کی تحقیق کرنے کی قابلیت رکھتے ہوں اور اس کے باوجود انہوں نے سیرت کی تصدیق نہیں کی اور اس معاملہ میں ان کے علاوہ ایسے مسلمان بھی گنہگار ہوں گے جنہوں نے اس تحقیق کی قابلیت رکھنے والے عالموں کو اس طرف ہمت افزائی نہیں کی۔

یہ انتہائی تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے دعوے اکثر وہ لوگ کیا کرتے ہیں، جو عام طور پر احادیث کی تخریج اور ان کی چھان بین کا خوب اہتمام کرتے ہیں۔ یہ رائے اس طرح سامنے پیش کرتے ہیں گویا اقامت دین کے لئے کام کرنے کی ذمہ داری سے وہ آزاد کر دیئے گئے ہیں اور مزید افسوس یہ ہے کہ وہ اس کمزور رائے کا حوالہ اس طرح دیا کرتے ہیں گویا انہوں نے کوئی انتہائی اہم بازی جیت لی ہے۔

کیا یہ مسلمان بھول گئے ہیں کہ دوسرے مسلمانوں کی طرح انہیں بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کریں؟ یہ حکم سب سے پہلے تو سیرت کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق و تفتیش کرنا ان پر فرض قرار دیتا ہے۔ کیونکہ جب حالات نے انہیں مجبور کیا کہ شرعی امور میں وہ

جزوی شرعی احکام کی احادیث کی چھان بین کریں، تو انہوں نے اس پر خوب محنت کی، ان کی یہ جدوجہد قابل قدر ہے کہ انہوں نے طویل وقت نکال کر اس راستہ میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ چنانچہ انہیں سوچنا چاہئے کہ جس وقت معاملہ پورے دین کے قیام سے متعلق ہو تو انہیں کیا کرنا ہوگا؟ کتنا وقت اور کس قدر کوشش ان پر لازم ہوگی؟

اگرچہ سیرت کی کتابیں اس بلند پائے کی نہیں ہیں کہ ان میں موجود تمام روایات کو قبول کیا جائے، لیکن اس درجہ گری ہوئی بھی نہیں ہیں کہ ان میں موجود تمام روایات اور واقعات کا انکار کر دیا جائے۔

یقیناً سیرت نگاروں نے تاریخ نویسی کے میدان میں کام کیا اور اس کام میں انہوں نے محدثین کے طور طریقوں پر ایسی سختی سے پابندی نہیں کی جیسے محدثین روایت کو اکٹھا کرتے وقت ان طریقوں پر سختی سے پابندی کیا کرتے ہیں، یعنی سخت باریکی اور راویوں اور ناقلین کی عدالت کی تحقیق و اطمینان، منقول روایات کی صحت، نہایت مختصر انداز میں نقل روایت اور نقل کرنے میں پرہیز و احتیاط جیسے مشکل امور میں ویسی سختی نہیں کی جیسی کہ محدثین کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے علماء حدیث اور محققین کی نظروں میں سیرت نگار افراد سہولت پسند لوگ قرار پائے۔ حق یہ ہے کہ یہ علم حدیث کا تقاضا تھا جو تفتیش و تحقیق محدثین اور علمائے حدیث نے راویوں کے بارے میں اور روایت کے نقل کرنے میں کی تھی اور ان کی اس محنت، تفتیش و تحقیق کا مظاہرہ حدیث کی کتابوں میں ہوتا ہے۔

علم سیرت کے اس پہلو میں جس کا تعلق رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی زندگی سے ہے تو اس کا بھی یہ تقاضا تھا کہ اس کے لئے تحقیقی طریقہ اختیار کیا جاتا۔ اس کے علاوہ جو دوسرا پہلو ہے جو کہ رسول اللہ ﷺ یا صحابہؓ کے بارے میں نہیں ہے تو اس کی معلومات میں سہولت پسندی اختیار کرنے میں کوئی

حرج نہیں ہے۔ کیونکہ حالات و واقعات بہت زیادہ ہوتے ہیں اور زمانہ بہت تیزی سے گذرتا ہے، چنانچہ سیرت نگار یا مورخ اگر ان کے لئے بھی محدثین کے تحقیقی طریقہ کار کو استعمال کرے تو اس کے لئے ان تمام حالات و واقعات کا احاطہ کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ لہذا سیرت میں سے رسول اللہ ﷺ کی زندگی سے متعلق پہلو کو نہایت اہمیت دینا مسلمانوں پر لازم ہے کیونکہ سیرت کا یہ پہلو رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال، سکوت (خاموشی) اور آپ ﷺ کی صفات کے بیان پر مشتمل ہے اور یہ تمام باتیں قرآن کی طرح شرع کا حصہ بنتی ہیں۔ چنانچہ سیرت رسول اللہ ﷺ اسلامی شرع کا حصہ ہے، اسی وجہ سے اسے حدیث کا جزو مانا جاتا ہے۔ سیرت کا جو حصہ رسول اللہ ﷺ سے صحت کے ساتھ ثابت ہیں وہ شرعی دلیل سمجھا جائے گا۔ مزید برآں یہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کو لازم قرار دیا ہے، قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کا حکم دیا ہے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: 21) ”یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ بہترین نمونہ ہیں۔“

اس لیے سیرت کی جانب متوجہ ہونا اور اس کی تلاش و جستجو کرنا شرعی حکم ہے۔

سیرت کی نقل میں پہلے لوگوں کے طریقہ میں اخبار کی روایت پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ مؤرخین نے اس کو زبانی انداز میں بیان کرنا شروع کیا۔ وہ اولین نسل جس نے پچشم خود رسول اللہ ﷺ کے اعمال و واقعات کا مشاہدہ کیا تھا، یا اس کے متعلق کسی اور سے سنا، اس پہلی نسل نے ان اعمال و واقعات کو دوسروں کو بیان کرنا شروع کیا۔ پھر اگلی نسل نے ان اعمال و واقعات کو پہلی نسل (رسول اللہ کے دور کی نسل) سے سنا، دوسری نسل میں سے بعض نے ان میں سے کچھ احادیث کو متفرق انداز میں مدون کیا جیسا کہ آج بھی اس کو حدیث کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ جب دوسری صدی ہجری شروع ہوئی تو ہم دیکھتے ہیں کہ بعض علماء نے سیرت سے متعلق اخبار و روایات کو جمع کرنا اور بعض اخبار کو بعض کے ساتھ



جوڑ کر انہیں ترتیب دینا شروع کیا اور انہوں نے ان اخبار کو ان کے راویوں اور جن سے نقل کیا گیا ان تمام کے نام کے ساتھ لکھا۔ چنانچہ اس دوران سیرت کے اخبار کو روایات کے طریقہ کار کے مطابق لکھا گیا جس طرح حدیث روایت کی جاتی ہے۔ سیرت کی روایات کی ترتیب ہو جانے سے اب علماء حدیث اور اسناد کی تحقیق و تفتیش کرنے والوں (ناقدین) کے لئے ممکن ہو گیا تھا کہ سیرت سے متعلقہ قابل قبول، صحیح اور کمزور اور غلط روایات کے درمیان فرق کر سکیں، کیونکہ راویوں اور سند کو سمجھنے سے اس کو معلوم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سیرت سے جب کچھ دلیل پیش کی جاتی ہے تو اسی طریقہ پر اعتماد کیا جاتا ہے تاکہ صحیح دلیل بتائی جاسکے۔ پس ضرورت اس بات کی نہیں ہے کہ اسلامی علوم میں کوئی نیا علم وجود میں لایا جائے البتہ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل میں باریک بینی اور صحیح سند کی تلاش ضروری ہے۔ لہذا محققین اگر سیرت کی تحقیق کا اہتمام کریں تو یہ کام دشوار نہیں ہے۔ کچھ فکر مند حضرات نے اس کام کو انجام دیا بھی ہے اور سیرت میں تحقیق کر کے صحیح کو معلوم کیا ہے، کیونکہ وہ جماعت یا حزب جو اقامت دین میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرتی ہے اس کے لیے ان نصوص کی تحقیق کرنا لازمی ہے جن سے وہ کام کی خاطر دلیل حاصل کر کے سنت پر مطمئن ہو جائے۔

مزید یہ کہ سیرت کی کتابیں باہم مختلف ہونے کے باوجود حدیث کی کتابوں کے طرز پر جمع کی گئی ہیں جبکہ دوسری طرف قرآن سے بھی سیرت کے مراحل اور اعمال کی طرف نشاندہی ہو جاتی ہے، جیسا کہ حدیث میں اختلاف کے دوران کئی مرتبہ قرآن شریف سے صحیح رائے کی جانب نشاندہی ہو جاتی ہے اور قرآن کریم نے دعوت کی تفصیل پر اس قدر اور ایسے انداز میں روشنی ڈالی ہے کہ یہ تفصیل، سیرت کی روایات میں جو کچھ نقل کیا گیا ہے، ان کی صحت کو معلوم کرنے کے لئے کافی ہیں۔ قرآن میں کئی مقامات میں بڑی وضاحت اور باریکی سے مطلوب حکم کی تعیین کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے جھوٹے عقائد پر حملہ شروع کیا اور بتوں، دہریت، یہودیت، مجوسیت اور دین سے پلٹنے والے صابین کی زبردست مخالفت اور مذمت کی، قرآن نے کئی آیات شریفہ میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے عادات اور رسوم و رواج پر حملہ کیا چنانچہ آپ ﷺ نے بچیوں کو زندہ درگور کرنے، لگاتار مادہ بچے جننے والی اونٹنی اور وہ نرا ونٹ جو ایک خاص تعداد میں جفتی کر چکا ہو کو بتوں کے نام پر چھوڑ دینے، جڑواں بچوں کی چاہت میں بتوں پر چڑھاوے چڑھانے اور تیر کے ذریعے فال نکالنے وغیرہ کو اڑے ہاتھوں لیا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ نے حکمرانوں کی مخالفت کی، آپ ﷺ نے ان تمام کے نام لے کر ان کے برتاؤ اور کروت بیان کئے اور دعوت کے خلاف ان کی سازشوں کو بے نقاب کر کے ان سرداروں کا سامنا کیا، جماعت پر بھی ان تمام باتوں کو انجام دینا لازم ہے۔ جماعت کا ان تمام اعمال کی پابندی اصل اور اس کے عام معنی (مقصد) کی پابندی کی خاطر ہو گا نہ کہ ان کی تفصیلات، وسائل اور اسلوب پر پابندی کا حکم ہو گا، یعنی یہ کام جوں کہ توں انجام نہ دیئے جائیں گے بلکہ آج کے حالات میں آج کی خرابیوں پر حملے کرنا اور اس کے لئے موجودہ حالات کے مطابق موزوں و مناسب وسائل اور اسلوب اختیار کرنا اصل حکم ہو گا۔ یوں جماعت بھی اپنے زمانہ میں موجود غلط افکار، غلط تصورات اور اسلام سے بھٹکے ہوئے رسوم و رواج اور عادات پر حملے کرے گی، حکمرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہو گی، ان کی سازشوں کو بے نقاب کرے گی، اسلام کے افکار اور احکام کو صاف اور کھول کر بیان کرے گی، اُمت کو ان پر عمل کرنے، ان کو اختیار کرنے اور زندگی میں ان کو نافذ کرنے کے لئے ساتھ مل کر کام کرنے کی دعوت دے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے نہتے ہو کر مقابلہ کیا جبکہ کسی کی طرفداری کی نہ ہی کسی درمیانے حل اور سمجھوتہ پر کبھی راضی ہوئے اور نہ کسی کی خواہشات کی پرواہ کی۔ ہر قسم کی مفاہمت کی پیش کشوں کو ٹھکرایا اور دھمکیوں سے جھکے نہیں، البتہ صبر کیا اور اپنے رب کے حکم سے سر مو انحراف نہ کیا۔ ہمیں

قرآن نے یہ تمام بیان کیا ہے چنانچہ ایک جماعت کے لیے یہی ہدایات ہیں اور اس کے کام کا صحیح طریقہ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا نزول کہ: ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ﴾ (الحجر: 94) ”جس بات کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے، اُسے علی الاعلان لوگوں کو سنا دو، اور مشرکین کی پروا مت کرو“۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تک دعوتِ اعلانیہ طور پر موجود نہیں تھی، بلکہ ڈھکے چھپے انداز میں خفیہ طور پر کی جاتی تھی اور یہ دور آپ ﷺ کے دعوتی عمل میں اعلانیہ دعوت سے قبل کا مرحلہ ہے۔ اسی طرح اللہ کا یہ ارشاد کہ: ﴿لَتَنْذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا﴾ (الشوریٰ: 7) ”اور تم ام القریٰ (مکہ) اور اس کے آس پاس والوں کو ڈراؤ۔“

یہ دعوت کو پھیلا کر مکہ سے باہر لے جانے کا حکم ہے اور قرآن میں مہاجرین اور انصار کا ذکر کیا جانا ہجرت و نصرت کے شرعی حکم اور عمل ہونے کی دلیل ہے۔

یوں اس دعوت کا قرآن ہی مرشدِ اول ہے۔ اس کے علاوہ احادیث کی کتابیں مکی عہد میں مسلمانوں کے حالات کے بارے میں روایتوں سے بھری پڑی ہیں۔ مثال کے طور پر بخاری میں پورا ایک باب: ”مشرکین مکہ نے نبی اور صحابہؓ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا“ مرقوم ہے جس میں وہ خبابؓ بن الارت کی حدیث کا ذکر کرتے ہیں، جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس مسلمانوں کی مدد کے لیے دعا کروانے کے لیے آئے۔ اسی طرح بخاریؒ نے رسول اللہ ﷺ کا سردارانِ قریش کو بدعادی کے واقعہ کو بیان کیا، اس کے علاوہ جب رسول ﷺ طائف گئے تو قوم نے کیسا سخت سلوک کیا اس کو بیان کیا ہے۔ یہ اور اس قسم کے واقعات حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی بیان ہوئے ہیں، چنانچہ ہم ایسے کسی فرمان کو

انجام دینے کے لئے نہیں کھڑے ہوئے ہیں کہ جس کا کوئی حکم موجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی عبارتیں پائی جاتی ہیں، ہمیں صرف ان نصوص پر تحقیق اور ان پر عمل کرنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی بیان کر دینا ضروری ہے کہ کچھ سیرت نگار آئمہ خود ہی نہایت قابل اعتماد اور قابل بھروسہ ہیں جن کی گواہی دیگر کئی علماء نے بھی دی ہے جیسے:

ابن اسحاقؒ (85ھ تا 152ھ) نے ایک کتاب ’المغازی‘ (فوجی مہمات) لکھی، آپ کے بارے میں الزہری فرماتے ہیں کہ: ”جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے دور میں فوجی مہمات کو پڑھنا چاہے اس کو چاہیے کہ ابن اسحاقؒ کو پڑھے۔“ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: ”جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے دور کی فوجی مہمات کے بارے میں مہارت حاصل کرنا چاہے اسے صرف ابن اسحاقؒ پر انحصار کرنا چاہیے۔“ امام بخاریؒ نے بھی اپنی تاریخ میں ان کا ذکر کیا ہے۔

ابن سعدؒ (168ھ تا 230ھ)، آپ کی کتاب ’الطبقات‘ ہے۔ آپ کے بارے میں الخطیب البغدادی نے فرمایا: ”ہمارے نزدیک محمد بن سعد اہل عدالت میں سے ہیں۔ آپ کی بات سے آپ کی سچائی آشکار ہو جاتی ہے آپ اپنی اکثر روایات کے بارے میں تحقیق کرتے ہیں۔“ ابن خلکان نے آپ کے بارے میں فرمایا: ”آپ ایماندار، سچے اور قابل اعتماد تھے۔“ ابن حجر نے آپ کے بارے میں فرمایا: ”وہ عظیم شخصیات میں سے تھے اور قابل اعتماد حافظ تھے جنہیں اکثر احادیث حفظ تھیں اور عظیم تنقید نگار تھے۔“

الطبریؒ (224ھ تا 310ھ) آپ کی کتاب ’تاریخ الرسل والملوک‘ (انبیاء اور حکمرانوں کی تاریخ) ہے جس میں آپ نے اسناد کے طریقے کو اختیار کیا ہے۔ الخطیب البغدادی نے آپ کے بارے میں کہا ہے: ”آپ سنت (احادیث)، حدیثوں کی روایتوں کے سلسلے، کمزور احادیث میں سے مضبوط

حدیث کی پہچان یعنی صحیح اور غلط کے درمیان فرق کرنے والے عالم تھے، لوگوں اور ان کے حالات و واقعات سے باخبر تھے۔“ آپ کی کتاب میں حدیث کی کثیر تعداد ہونے کی وجہ سے آپ نے اپنی کتاب ’تاریخ‘ میں محدثین کے طریقے کو اختیار کیا۔ حدیث میں بھی آپ کی ایک کتاب ہے جس کا نام (تہذیب الآثار و تفصیل الثابت عن رسول اللہ ﷺ من الاخبار) ہے۔ جس کے بارے میں ابن عساکر نے کہا: ”یہ عجیب ترین کتاب ہے جس میں آپ نے رسول ﷺ کی صحیح احادیث کو یکجا کیا ہے۔“

اس طرح ابن کثیرؒ اور الذہبیؒ بھی اُن لوگوں میں سے ہیں جن کو حدیث میں مہارت حاصل تھی۔

کچھ مسلمان سمجھتے ہیں کہ حکمرانوں کے خلاف اسلحے کا استعمال ہی تبدیلی کا واجب الاتباع طریقہ ہے جو واجب الاتباع ہے:

یہ حضرات بُرے حکمرانوں کے بارے میں رسول ﷺ کی حدیث کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں، جس میں رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا ہے کہ انہیں اپنی تلواروں سے ہٹا دیں اگر وہ اللہ کے حکامات کو نافذ نہ کریں۔

ہم ان حضرات کا احترام کرتے ہیں، اگرچہ ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف رائے موجود ہے، البتہ ان حضرات کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ: اس حدیث میں موجود حکم کے مناسبت (یعنی جن حالات کے بارے میں یہ حدیث وارد ہوئی) کی جانچ کرنے پر ہی صحیح رائے سامنے آجاتی ہے، حدیث کا تعلق ایسے حکمران سے ہے جو دارالاسلام کا امام ہے جسے شرعی طور پر بیعت دی گئی ہو۔ اس طرح وہ مسلمانوں سے بیعت لے کر امام بنا ہو، اور وہ زمین جہاں وہ امام حکومت کرتا ہو وہ دارالاسلام ہو (یعنی جہاں اسلام کے احکام کو بالادستی حاصل ہو) اور اس کی امان مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہی ہو۔ ایسی

حالت میں مسلمانوں پر امام کی اطاعت کا حکم واجب ہے اور اگر وہ امام اللہ کے نازل کردہ احکامات کے دائرہ سے نکل کر اعلانیہ طور پر کفریہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے لگے، خواہ کفر سے ایک ہی حکم لے کر نافذ کرے، جبکہ اس حکم کے اسلامی ہونے کی کوئی دلیل یا دلیل کا شبہ بھی اس کے پاس نہ ہو، تب مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کے خلاف تلوار استعمال کریں۔ اس حدیث کے معنی میں غور کریں جو ہماری بحث کا موضوع ہے تو یہ سب بالکل واضح ہو جائے گا۔ حدیث یہ ہے کہ عوف بن مالک الاشجعی نے کہا کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ((خيار أئمتكم الذين تحبونهم و يحبونكم و يصلون عليهم و يصلون عليكم، و شرار أئمتكم الذين تبغضونهم و يبغضونكم)). قيل يا رسول الله: أفلا نناذبهم بالسيف عند ذلك؟ قال: ((لا، ما أقاموا فيكم الصلاة)) (مسلم) ”تمہارے بہترین امام وہ ہوں گے جن سے تم محبت کرو گے اور وہ تم سے محبت کریں گے تم ان کے لیے دعا کرو گے وہ تمہارے لیے دعا کریں گے اور تمہارے بُرے امام وہ ہوں گے جن سے تم بغض رکھو گے اور وہ تم سے بغض رکھیں گے“۔ کہا گیا اے اللہ کے رسول! ہم ان کو اپنی تلواروں سے کیوں نہ نکال باہر کریں؟ فرمایا: ”نہیں جب تک وہ تمہارے اندر نماز کو قائم کرتے رہیں۔“

نماز کو قائم کرنے کا مطلب شرع کے احکام کو قائم کرنا ہے، یہاں جزو کہہ کر گل مراد لی گئی ہے (از قبیل تسمية الكل باسم الجزء)۔

دارالکفر کے حکمران کا معاملہ یا حقیقت بالکل مختلف ہوتی ہے حالانکہ وہ مسلمانوں پر حکمران ہوتا ہے لیکن وہ ان کا امام نہیں ہوتا اور شرع کے تحت لازم کئے گئے طریقہ پر اس کا شرعی تقرر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس نے مسلمانوں کی زندگیوں پر اسلام کے احکامات کو نافذ کرنے کا کوئی عہد کیا ہوتا ہے، حالانکہ اسلامی احکامات کا نفاذ کرنا تو اس پر بھی فرض ہے۔ اس کے برخلاف دارالاسلام کا حکمران

مسلمانوں کا امام ہوتا ہے اور دارالاسلام کے امام کا تقرر شرعی طور پر ہوتا ہے جس میں بیعت کے تحت وہ مسلمانوں کے ساتھ ان کی زندگیوں میں اسلام کو نافذ کرنے کا عہد کرتا ہے۔

پھر اس کے علاوہ جب ہم حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ تبدیلی لانے کے عمل میں اسلحے کا استعمال کافی نہیں ہے۔ تبدیلی کا یہ مسئلہ اس بات سے بہت بڑا ہے کہ اس حکمران کو ہٹا کر ایک سنجیدہ اسلامی حکمران کو بٹھادیا جائے، بلکہ اس حکمران کو ہٹانے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی حکومت کا قائم ہونا ضروری ہے جو اسلام کے مطابق حکومت کر پائے۔ چنانچہ اس بات کو یقینی بنانے کی ذمہ داری کون لے گا؟ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سیاسی بصیرت اور تجربہ کار سیاسی مہارت رکھنے والی قیادت موجود ہو اور ساتھ ہی اسلامی سیاسی ذریعہ بھی موجود ہو۔ اسلام کے ذریعے حکومت کرنا کوئی ایسی آسان چیز نہیں کہ کوئی بھی عسکری رہنما اس کو انجام دے سکے خواہ اس کے پاس کتنی ہی فوجی قوت ہو اور وہ اسلام سے مخلص بھی ہو، اس معاملہ میں تجربہ، معاملہ فہمی اور باریک بینی، جدوجہد اور نہایت اعلیٰ درجے کی شرعی سمجھ کی ضرورت ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہی ان تمام باتوں کو یقینی بناتا ہے۔

1۔ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ (منہج نبوی) اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ایک بے مثال مسلمان سیاسی قائد تیار ہو جائے جو اسلامی ریاست کے قیام سے پہلے دعوت کے راستے کا طویل تجربہ رکھتا ہو، جس کو کفار ریاستوں کی چالوں اور مکر و فریب، دھوکہ بازیوں، مکاریوں، سازشوں اور منصوبوں کا اچھی طرح علم ہو جس کی وجہ سے وہ ان سے کبھی دھوکہ نہ کھاسکے، اس اہلیت کے بعد ہی وہ اسلامی ریاست کی حفاظت کرنے اور پھر ریاست کو دنیا کے ملکوں میں اس منفرد مقام تک پہنچانے پر قادر ہو گا جہاں اسلامی

ریاست دنیا بھر میں اپنی ذمہ داری نبھاسکے گی یعنی دنیا کو ہدایت پہنچانے والی ایک ہدایت یافتہ ریاست کے طور پر سامنے آئے گی اور جو منہج نبوی پر دوبارہ قائم ہونے والی خلافت راشدہ ہوگی۔

2- منہج نبوی یقینی بنادیتا ہے کہ ایسے مومن شباب تیار ہوں جو ریاست کے قیام سے قبل دعوت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں، اس طرح کہ یہ شباب دوسرے ایسے مسلمانوں، جو دعوت اور اس سے جڑے معاملات کے متعلق فکر مند ہوں، انکے ساتھ مل کر سیاسی ذریعہ کو تشکیل دیں گے اور پھر ان سنجیدہ افراد میں سے گورنر، امیر الجہاد، سفراء اور دوسری ریاستوں میں اسلام کی دعوت لے جانے والے بہترین افراد حاصل ہوں گے۔

3- منہج نبوی ایک زبردست رائے عامہ اور مقبول عوامی جذبات کے ذریعہ ایک وسیع عوامی بنیاد قائم کرے گا جو اسلام کو بخوشی سینے سے لگا کر خوش آمدید کہیں گے اور اسلامی ریاست کی حفاظت کریں گے۔

4- منہج نبوی یہ بھی یقینی بنائے گا کہ ایسے ماہر تربیت یافتہ اہل قوت افراد تیار ہوں جو دیگر اہل قوت افراد کو تربیت دیں اور جن کے ساتھ عام لوگ کھڑے ہو کر ان کی قوت و طاقت کو مزید بڑھائیں گے اور ان کے خلاف نہیں کھڑے ہوں گے، خاص طور پر اس وقت کہ جب وہ سمجھ لیں گے کہ حکمران، اس کے ساتھ حکومتی ڈھانچہ اور طاقت جس پر حکمران ٹکا ہوا ہے، ایسی قوت ہے جو اللہ کے فرض کردہ اسلام کا نفاذ اور دین کی عزت و سربلندی کا کام کرتے ہیں۔

مزید براں مسلح جدوجہد کے لیے مال، اسلحہ اور تربیت (ٹریننگ) کی ضرورت ہوتی ہے اور تحریک پر یہ بہت بھاری بوجھ ہو گا کیونکہ یہ سب مہیا کرنا ایک تحریک کے لیے آسان نہیں اور پھر ان اسباب کے لیے یہ تحریک کسی اور سے مدد طلب کرنے پر مجبور یا کسی اور کی محتاج ہو سکتی ہے، اور یہ



بربادی کی جانب پہلا قدم ہوتا ہے، یہی تحریکوں کے سقوط کا سبب بنا ہے، مسلمانوں نے اس راستہ کو خوب آزمایا ہے لیکن اس سے انہیں بھاری نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اب اسے مزید بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ لفظ ’آزمانا‘ تجربہ کرنا کسی بھی شرعی عمل کے طریقے کے طور پر نامناسب اور غلط ہے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلحے کا استعمال تبدیلی لانے کا شرعی طریقہ نہیں تو ہم ان ظالم حکمرانوں کے متعلق نرمی ہر گز نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کی طرف داری کرتے ہیں جنہیں مسلمانوں کی ذرا سی بھی پرواہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم اپنے دینی بھائیوں کے طرفدار ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان تمام مخلصین کی کوششیں اور جدوجہد شرعی کے مطلوب عمل کے لیے یکجا ہو جائیں۔ ہم انہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ میں صحابہؓ کی جانب سے اسلحے کے استعمال کی اجازت طلب کرنے پر انہیں منع کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ: **((لقد أمرت بالعفو، فلا تقاتلوا القوم))** (سیرت ابن ہشام) ”مجھے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تم قوم سے مت لڑو“۔

پھر اللہ تعالیٰ نے مزید یہ ارشاد فرمایا: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ ...﴾ (النساء: 77) ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو اور نماز قائم کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا...“

اس قسم کے دیگر کئی شرعی دلائل ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ کے دعوت میں طریقے کار کی پیروی کرنے کی تائید ہوتی ہے۔ اور اس طریقے میں کوئی کمی اور زیادتی، تبدیلی، ترمیم اور اس سے انحراف کی وجہ سے دعوت، جماعت اور امت مسلمہ کو بہت بھاری نقصان ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے نہایت واضح طور پر شرع کے مطالعہ اور رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو خوب غور سے پڑھنے پر زور دیا

ہے تاکہ آپ ﷺ کی بہترین طور پر پیروی کی جائے اور اللہ پر ہی ہے کہ وہ ہمیں سچا و سیدھا راستہ بتلائے۔

## احکامات کو سمجھنے کا اسلامی طریقہ

وہ کام جو جماعت یا حزب اقامت دین کے لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری کے تحت کرتی ہے اس کام کی بنیاد اس کے شرعی علم پر ہونی چاہیے، کیونکہ جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا کہ علم سے پہلے کوئی بھی عمل نہیں کیا جاسکتا اور علم کے بغیر اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ دین کے قیام کے لئے کام کرنے والی جماعت سے مطلوبہ شرعی علم کی حدود کیا ہیں؟ یعنی ان کو کن کن احکام اور ان سے متعلق کتنی گہرائی کے ساتھ علم اور معلومات ہونا لازم ہے؟ اس کے علاوہ اہم معاملہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے مطلوب ثقافت کیسی ہو جس کو تعمیر کرنا اور پروان چڑھانا جماعت پر لازم ہے اور جس کی بنیاد پر (ثقافتی مواد اور ماحول کے مطابق) جماعت شباب کی تربیت کرتی ہے اور امت کو بھی اس کے لئے تیار کرتی ہے؟

اس جماعت پر کام کے لیے مطلوبہ شرعی علم اور اس کی پابندی کرنا لازمی ہے اس بنا پر اُسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اسی کے مطابق کیا جاتا ہے، جماعت یا حزب اگر کبھی ان مطلوبہ شرعی احکام کی خلاف ورزی کرے تو اس کو نصیحت کی جائے گی اور اگر اس سے بھٹک جائے تو اس کی اصلاح کی جائے گی۔ جو حکم دیگر لوگوں پر عائد ہوتا ہے وہی جماعت پر فرض ہے۔ اصل معاملہ شرع کی مکمل اتباع اور پابندی ہے، جس میں کسی قسم کی خلاف ورزی اور انحراف جائز نہیں ہے۔ یہ نصیحت کرنا ہر کسی پر ضروری ہے اور یہ نصیحت ہر کسی کو کرنا چاہیے۔

اس مقام پر پہنچ کر اب اس بات کو بیان کرنا زیادہ مناسب ہے بلکہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم جان لیں کہ تمام شرعی احکامات کو اخذ کرنے (استنباط) کے لیے ایک متعین ثابت شدہ طریقہ عمل موجود ہے، خواہ ان احکامات کا تعلق زندگی کے کسی بھی پہلو سے ہو چاہے دعوت سے ہو یا عبادات، معاملات، عقوبات، مطعومات، ملبوسات یا اخلاق سے۔

اس طریقے کا تعین اسلام نے خود کیا ہے، یہ مسلمانوں کی ذہانت و قابلیت کی کارستانی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ مسلمان پر لازم قرار دیتا ہے کہ وہ شرع کے دائرہ سے باہر کسی ایک حکم کو بھی اختیار نہ کرے، چنانچہ حکم کو حاصل کرنے (استنباط) کے لئے مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اُن شرعی حدود کی پابندی کرے جن پر شرعی نصوص دلالت کرتے ہیں۔ اس لئے ایسا طریقہ مہیا کرنا ضروری تھا جو حکم کے استنباط کو محفوظ بنائے، یعنی جس پر عمل پیرا ہو کر یہ یقین ضرور حاصل ہوتا ہے کہ حکم اسلام سے لیا جا رہا ہے، نیز یہ طریقہ اسلام کی سمجھ کی نگرانی و حفاظت بھی کرتا ہے، اس طرح رہنمائی لینا اور پابندی کرنا ہمیشہ خالص وحی کے ذریعے نازل شدہ نصوص تک محدود رہتا ہے۔ یوں فقہی نقطہ نظر اور اسلامی عقیدہ کے بارے میں ایک مکمل نقطہ نظر وجود میں آتا ہے۔

شرع سے متعین کردہ اجتہاد کا یہ طریقہ نہایت اہم اور اس قدر ضروری ہے کہ جماعت یا پارٹی کی ثقافت میں اس کا مقام نہایت اعلیٰ اور درجہ اول کا ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ جماعت یا حزب کی ثقافت وجود میں آتی ہے۔ کیونکہ اسی طریقے سے احکام کو حاصل (مستنبط) کیا جاتا ہے۔ اگر استنباط کا طریقہ صحیح ہو گا تو غلبۃ الظن کی حد تک صحیح شرعی احکامات حاصل ہوں گے جن میں شبہ کی گنجائش کم سے کم تر ہوگی اور اس عمل پر اجر بھی ملے گا۔ ورنہ ایسی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہے جو شرعی طور پر متعین طریقہ استنباط کی بنیاد پر نہیں ہوتی، چاہے جھوٹ اور جعل سازی سے اسے شرعی رائے بتلایا جائے۔ کیونکہ اعتبار

نام رکھنے کا نہیں کیا جاتا بلکہ اس حقیقت کا کیا جاتا ہے جس پر اس نام کا درست اطلاق ہوتا ہو۔ چنانچہ استنباط کے لئے طریقہ کی پابندی لازم ہے۔

آج ہم پہلے سے زیادہ اس طریقہ کے ضرورت مند ہیں جو مسلمانوں کو مغربی فکر سے متاثر ہونے اور اس کے طریقہ استنباط (حکم اخذ کرنے کا طریقہ کار) کی پیروی کرنے سے بچاتا اور روکتا ہے، یہ اس زمانے کی ایسی بیماری ہے جس میں بہت سارے ایسے افراد مبتلاء ہیں جنہیں علماء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے اجتہادات اور فتاویٰ، ان کے اخذ کرنے کے اسلامی ضوابط و طریقہ سے بہت آزاد ہوتے ہیں اور وہ وحی الہی سے ہدایات کی بجائے مغربی تصورات سے راہنمائی لیتے نظر آتے ہیں۔

اب یہ بات کہ مسلمان صرف شرع کی طرف رجوع کرے اور اجتہاد کرتے وقت اس کا ایک اٹل اور طے شدہ طریقہ ہو، اس پر سب کا اتفاق ضروری ہے، بھلے ان کے اجتہادات کے نتائج باہم مختلف ہوں۔ یہاں ہم اس طریقہ کو اجمالی طور پر بیان کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسا یہ طریقہ سلف کا تھا، اسی طرح طریقہ خلف (بعد کی نسلوں) کا بھی ہونا چاہیے اور جو بھی ان کے بعد آئیں بلکہ تاقیامت یہی طریقہ ہے۔

## امرواقع کو سمجھنا:

احکامات اخذ کرنے میں اسلام کے طریقہ میں یہ امور بنیادی ہیں: پہلے مسئلہ (واقعہ) کی گہری سمجھ حاصل کر لینا، اس کے بعد ایسے شرعی دلائل کی تلاش اور مطالعہ جو مسئلہ کے حل لئے

ضروری اور اس سے متعلق ہوتے ہیں، اور آخر میں ان شرعی دلائل سے درپیش مسئلہ کا حکم حاصل (استنباط) کرنا۔

تبدیلی کے لئے کام کرنے والی جماعت کا وجود اس حقیقت کے ساتھ مربوط ہوتا ہے جس میں وہ وجود میں آتی ہے، یعنی اسی حقیقت کے مطابق اس کی تبدیلی کے لئے درکار شرعی احکامات کو اختیار کرنا (تبنی) جماعت پر لازم ہے۔

حقیقت حال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس کا زبردست مطالعہ کیا جائے۔

جبکہ شرع کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ: شرعی دلائل کے ماخذ (مصادر) کا تعین کیا جائے اور اصول کے قواعد معلوم کئے جائیں یعنی وہ ضابطے جن کے مطابق استنباط کا عمل کیا جاتا ہے۔ استنباط کی کاروائی کے لیے ایسے مجتہد کی ضرورت ہوتی ہے جو احکامات کو ان کی وقائع پر منطبق کرنے اور علتوں کے مطابق احکام طے کرنے کی قابلیت واستعداد رکھتا ہو۔

لہذا کسی بھی جماعت کا قیام اس کی اس حقیقت سے جڑا ہوتا ہے جس میں جماعت وجود میں آئی ہے، اور چونکہ وہ اسی حقیقت حال کو تبدیل کرنا چاہتی ہے اس لئے وہ اس کو اپنی فکر اور تبدیلی لانے کے لئے موضوع بناتی ہے۔ لہذا جماعت یا حزب پر لازم ہے کہ وہ صورت حال کا گہرائی اور باریک بینی سے مطالعہ کرے اور پھر ان مسئلوں کو پہچانے جنہیں حل کرنا ضروری ہے، مسائل اور مشکلات جب متعدد ہوں اور آپس میں الجھے ہوئے ہوں تو ان کے درمیان فرق کرنا اور یہ دیکھنا ضروری ہے کہ یہ مسائل دیگر مسائل کا نتیجہ ہیں یا یہ ایسے مسائل ہیں جن سے دیگر مسائل جنم لیتے ہیں لہذا فرد کے لئے ضروری ہے کہ اصل مسائل اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل میں فرق کرے اور اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ اور اس کی علامات و اثرات کو واضح طور پر سمجھا جائے، بالفاظ دیگر اصل

بیماری اور اس کے عوارض میں فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس سمجھ کے ذریعے اصل مرض کی تشخیص بھی ہو جاتی ہے اور اس سے پیدا شدہ دیگر عوارض و علامات کی سمجھ بھی حاصل ہو جاتی ہے، اصل مرض معلوم کرنے کے بعد اس کے لئے دوا کی تجویز عمل میں لائی جاتی ہے۔

یہ بالکل اسی طرح ہے کہ ایک ماہر ڈاکٹر کو اصل بیماری کا پتہ لگاتے وقت اس کی ظاہری علامات کو دیکھ کر مرض کے بارے میں دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ اگر کسی انسان کے معدے میں کوئی بیماری ہو اور اس کے رد عمل میں اسے الرجی ہو جائے، جس کے نتیجے میں مریض کی جلد پھٹ جائے یا خراشیں ظاہر ہوں اور بدن میں گرمی پائی جائے، اب اگر ڈاکٹر صرف جلد اور بدن کے بخار کے علاج کو کافی سمجھ کر اس کی دوا تجویز کرے گا اور معدے کی بیماری کو نظر انداز کر دے تو پھر اس قسم کا علاج نامکمل علاج ہو گا کیونکہ اصل بیماری پھر بھی باقی رہے گی۔ اس طرح علاج بھی ناکافی ہو گا اور ڈاکٹر بھی بیماری کا علاج کرنے میں ناکام ہو گا، چنانچہ ڈاکٹر کے لئے ضروری ہے کہ اصل مرض کا علاج کرے جو اس صورت حال میں معدے کا علاج ہے۔ جب اس کا علاج ہو گا تو اصل بیماری اور اس کی ظاہری علامات دونوں ختم ہو جائیں گی۔ اس طرح ایک ماہر ڈاکٹر یہ بھی متعین کر سکتا ہے کہ ظاہری علامات کے لئے مزید علاج کی ضرورت ہے یا نہیں، کچھ علامات ایسی ہوتی ہیں جو اصل بیماری کا علاج ہونے سے وہ بھی ختم ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھار ایسے اثرات چھوڑ جاتی ہیں جن کا مستقل علاج ضروری ہوتا ہے۔ معاملہ جو بھی ہو علاج اگر صرف ظاہری علامات کا کیا جائے گا تو یہ جزوی اور ادھور علاج ہی رہے گا اور مسئلہ جوں کا توں برقرار رہے گا۔

آج ہمیں اسی قسم کی صورت حال کا سامنا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حقیقت میں کچھ بنیادی مسائل ہیں جن کی وجہ سے متعدد جزوی اور فروعی مسائل پیدا ہوئے ہیں جو ظاہر میں نظر آتے ہیں۔

البتہ اُمت آج جن بنیادی مسائل میں مبتلا ہیں ان میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی میں اللہ کی حاکمیت کا وجود ختم ہو چکا ہے، دیگر الفاظ میں ان کی زندگیوں میں اللہ کو حاکمیت حاصل نہیں ہے۔ اسی کے نتیجے میں بہت سارے جزوی مسائل پیدا ہو چکے ہیں جیسے غربت جو ظلم کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، جہالت، بد اخلاقیوں کا پھیلنے جانا اور فاسد تعلقات کا غالب ہوتے جانا وغیرہ، اس صورت حال کے متعلق اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا﴾ (طہ: 124) ”جو میرے ذکر سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی۔“

یہ تمام جزوی مسائل اس بنیادی مسئلہ کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، مستقل اور پائیدار حل تب تک حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک بنیادی مسئلہ کو حل نہیں کر لیا جاتا، غیر اللہ (انسانوں کی خواہشات کے مطابق بنائے گئے قوانین اور نظام) کی حکومت کی وجہ سے پیدا ہونے والے اثرات کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عدل و روحانیت سے بھرپور اسلامی زندگی کی واپسی کے لئے کام نہیں کیا جاتا، اور اس کام کے لئے اسلامی عقیدہ کو دنیا میں اس کا اصل مقام دینا ہو گا یعنی روحانی عقیدہ کے ساتھ ساتھ اسے سیاسی عقیدہ بنانا ہو گا، عقیدہ جو تمام مسلمانوں کو ان کی زندگی کے تمام افعال کے لئے ہدایات دیتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کو اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی (حکم اور منع) کے مطابق انجام دیں اور انہیں مجبور کرتا ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت قائم کریں۔

چنانچہ بنیادی مسئلہ تعلیم کا نہیں ہے اور نہ ہی اخلاق کا یا اقتصاد کا ہے، اسی طرح بنیادی مسئلہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہیں، نہ ہی ان کی سماجی، معاشی اور عسکری پوزیشن کو مستحکم بنانا ہے۔ بلکہ بنیادی مسئلہ حاکمیت کا ہے جو مسلمانوں کے عقیدہ اور عملی زندگی کے افعال کے اندر سے غائب ہو چکی ہے۔ اور یہ حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔ لہذا آج زمانہ کی مادی ترقی اور نئے حالات میں دوبارہ



مسلمانوں میں اسلامی احکامات پر بھروسہ اور اطمینان پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ عقیدہ کا جو حصہ ان کے دلوں سے غائب اور گم ہو چکا ہے اسے دوبارہ بحال کیا جائے، ان کے اپنائے ہوئے عقیدہ سے نکلنے والے نظام کو دنیا میں دوبارہ قائم کرنے میں ان کی دلچسپی کو بحال کیا جائے، جنت کی طلب، چاہت اور فکر اُن میں بھر دی جائے، جہنم کا ڈر اور اس سے بچاؤ کی وہ کوشش کریں اور تمام مسلمانوں کے بارے میں فکر کرنے والے بن جائیں بلکہ وہ اس عقیدہ کے تحت تمام انسانوں کی فکر کرنے والے بن جائیں۔

جماعت اس ادراک اور بصیرت کے ساتھ بنیادی مسئلہ کو متعین کرتی ہے اور وہ صحیح طور پر سمجھتی ہے کہ جوں ہی اس مرض کا علاج ہو چکا تو اس کی تمام ظاہری علامات کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ صورت حال کا صحیح ادراک کتنا اہم ہے۔

اس معاملہ کو علمائے اُصول کے درمیان مناظ (صورت حال یا حقیقت) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے کہ جماعت شرع سے دلائل کی تلاش شروع کرے اس کو صورت حال کی اچھی سمجھ حاصل کر لینا لازمی ہے۔

حقیقت کا احساس اور اس کو سمجھنا یہ اس کے متعلق احکام کو سمجھنے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس کام میں بڑی گہرائی درکار ہوتی ہے کیونکہ اگر ہم حقیقت کو سمجھنے میں غلطی کا شکار ہونگے اور حقیقت کا یہی غلط فہم ذہن پر غالب ہو اور پھر اس کے حل کے لیے شرعی دلائل کی طرف رجوع کریں گے تو ہم ایسے دلائل ڈھونڈ لائیں گے جو اس حقیقت اور مسئلہ کو حل نہیں کرتے ہوں گے کیونکہ حقیقت ہی ہمارے ذہن میں غلط ہوگی اور یوں ہم دلائل کو بے موقع اور غلط حقیقت میں استعمال کر بیٹھیں گے۔

حقیقت کی سمجھ حاصل کرنے کے لیے عقل کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں جائز نہیں ہے کہ ہم حقیقت کو ہی اپنی سوچ کا محور بنادیں اور حقیقت و حالات سے متاثر ہو جائیں اور پھر انہی سے تمام فکروں کو حاصل کرنے لگیں بلکہ حقیقت سے کوئی حل نہیں نکالیں اور حقیقت کو اس کی اصلی حالت میں جوں کا توں سمجھیں۔

## شرع کی سمجھ:

عقل کے ذریعے امر واقعہ کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے بعد اب اس کے شرعی علاج کا نمبر آتا ہے، جو شرعی دلائل سے استنباط کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔ اس شرعی علاج یا حل کو حاصل کرنے کے لئے عقل کا استعمال مصدر (سرچشمہ) یا ثالث کے طور پر نہ ہو، بلکہ اس کا استعمال فقط شرعی دلائل میں موجود علاج کو سمجھنے کے لیے ہو۔ یہاں عقل کا کام یہ ہے کہ اس حل کو سمجھے جو شرعی دلائل میں موجود ہے۔

شرع کو سمجھنے کے لیے اُن شرعی مصادر کی پہچان ضروری ہے جن سے جماعت شرع لیتی ہے اور ساتھ ہی ان اصولی قواعد کی معلومات بھی حاصل کرنا لازمی ہے جن پر اعتماد کرتے ہوئے جماعت شرع کو سمجھتی ہے اور پھر یہ اس سمجھ کے ساتھ بد حالی کو بدلنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ چنانچہ اسی کے مطابق جماعت اپنی نظر میں اس حقیقت کا درست تصور پیش کرتی ہے جس کی طرف جماعت لوگوں کو منتقل کرنا چاہتی ہے اور اس کے لئے جماعت کو اجتہاد یعنی استدلال کے طریقہ کا علم ہو گا۔

## شرع کے مصادر:

ہر حکم کسی نہ کسی مصدر سے صادر ہوتا ہے، لہذا ہر ایک حکم اس کے حقیقی مصدر سے حاصل کرنا ضروری ہے اور اس کے لئے مکمل مطالعہ کے بعد اچھی طرح یقین اور اطمینان کے بعد مصدر کو طے کرنا ضروری ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اسلامی قانون سازی کے لیے بنیادی مصادر قرآن اور سنت ہیں اس میں کسی کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، البتہ ان میں سے کئی دیگر ایسے مصادر حاصل ہوتے ہیں جیسے اجماع، قیاس، استحسان، مذہب صحابی اور شرع من قبلنا وغیرہ، یہ سب مصادر ایسے ہیں جن کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ کسی بھی جماعت کے نزدیک کون سی چیز دلیل بن سکتی ہے اس کا واضح تعین شرع کو اختیار کرنے سے متعلق جماعت کے رجحان کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

یہ بات بھی سب جانتے ہیں کہ ذیلی مصادر کی تبنی کا سہارا قطعی دلائل پر ہوتا ہے، یعنی یہ ضروری ہے کہ قرآن وحدیث سے اس بات کا قطعی ثبوت ملے کہ یہ شرعی دلائل ہیں جن پر مصدر تشریع کی حیثیت سے بھروسہ کیا جاسکتا ہے، دیگر الفاظ میں دونوں اساسی مصدر (قرآن وسنت) اس تیسرے یا چوتھے مصدر کو اختیار کرنے کی طرف قطعیت کے ساتھ رہنمائی کریں۔ شرعی مصادر کو اختیار کرنے میں کسی کی تقلید کافی نہیں، یہ معاملہ ان بنیادی باتوں (کلیات) میں سے ہے، جن کا قطعی ہونا ضروری ہے اور ہم جانتے ہیں کہ تقلید میں ظن (شبہ) شامل ہوتا ہے جو کسی بھی معاملہ کو قطعیت تک نہیں پہنچاتا۔

جب مصادر شرع کو طے کر لیا جائے گا تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے چشمے ہیں جہاں سے جماعت پیاس بجھائے گی اور کون سے چشموں سے پینا ناجائز ہوگا، یعنی کس مبدأ (آئیڈیالوجی) یا مصدر سے دلیل لے گی اور کس مصدر سے دلیل قبول نہیں کرے گی۔ ان مصادر کو طے کرنے میں

انتہائی احتیاط کرنا لازم ہے کیونکہ اگر غلطی سے کسی ایک غلط مصدر کو اختیار کر لیا گیا تو اس سے حاصل ہونے والے تمام احکامات غلطی پر ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ جماعت کے کام سے متعلق احکام شرعیہ کو طے کیا جائے پہلے شرع کے مصادر کو طے کرنا نہایت ضروری ہے، یہ بات قابل قبول نہیں ہوگی کہ ایک جماعت اسلام کا پیغام لے کر اُٹھے اور وہ اپنے تئیں اختیار کئے ہوئے اسلامی شرعی مصادر کو واضح نہ کر دے۔

اس کے علاوہ یہ بھی قابل قبول نہیں ہے کہ قرآن و سنت کے علاوہ دیگر تمام کے تمام مصادر اختیار کر لئے جائیں تاکہ زیادہ بھلائی اکٹھا ہو اور زیادہ سے زیادہ اچھی باتوں کو حاصل کیا جاسکے، بلکہ ایسا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جماعت ہر ردی اور کارآمد چیز کو لے کر خلط ملط کرے گی اور پھر اس کے نتیجے میں شرع کی اس طرح توڑ مروڑ ہونے لگے گی کہ حقیقت، عقل، خواہشات، جذبات اور فائدے کے سامنے شرع گھٹنے ٹیک دے اور ان کے تابع ہو کر رہ جائے گی۔ جب حالت یہ ہوگی تو دلیل کا مقصد صرف یہ ہو کر رہ جائے گا کہ کسی طرح ان خواہشوں اور تمناؤں کو صحیح ثابت کرنے کی بجائے اس امر واقعہ، عقل اور مفاد کو شرع کا تابع کر دیا جائے، جیسا کہ شرع ہم سے چاہتی ہے۔

پس جماعت پر لازم ہے کہ صورت حال کو تبدیل کرنے کے بارے میں رائے دینے سے قبل اپنے مصادر کو طے کر لے، زمانہ کی سوچ اور حقیقت سے متاثر ہو کر مصدر طے نہ کرے، بلکہ مصادر کو طے کرنے یا رد کرنے میں صرف شرعی نصوص اور ان کے قطعی دلائلوں سے متاثر ہو۔ مزید یہ کہ جماعت جن مصادر کو اپنے لئے طے کر دے، یہ اس کے اپنے اصول ہوں گے اور ان کو دوسروں کے لئے لازم قرار نہیں دے گی، ہاں اس رائے کو دوسروں کے سامنے پیش کرے گی تاکہ اُن کو حجت و برہان کے ذریعے قائل کر کے ان مصادر کو اختیار کرنے پر مجبور کرے خصوصاً ان چیزوں کے بارے میں جو

جماعت کے نزدیک قطعی ہیں، ورنہ جماعت اگر اپنے اصولوں کو دوسروں کے لئے جبراً لازم قرار دے گی تو وہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے مشکلات کھڑی کر دے گی۔

## شرع کو سمجھنے کے اصول:

جب ایک دفعہ جماعت نے ان مصادر کا تعین کر لیا ہو جن سے وہ شرع حاصل کرے گی تو اب وہ ان مصادر سے شرع کو اخذ کرنے کی کیفیت پہچاننے کی طرف بڑھتی ہے، بالفاظ دیگر اب اسے اُن قواعد کی معرفت حاصل کرنا ہوگی، جن کے اندر غور و فکر سے ان مصادر سے احکام کا استنباط کیا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فقیہ جب کوئی حکم شرعی اخذ کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن میں اصول کے وہ قواعد ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر وہ اس حکم کی تعمیر کرتا ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی علم نہیں ہے جس کے کچھ متعین اصول نہ ہوں اور اس کے اصولوں کے علم کے بغیر کوئی بھی علم اچھی طرح حاصل نہیں کیا جاسکتا، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اصول لوگوں کے ذہن میں موجود ہوتے ہوں تحریری شکل میں موجود نہ ہوں یا پھر کسی نے اصولوں کو لکھ کر مرتب کیا ہو۔

شرعی نصوص میں عام اور خاص احکام بھی ہیں۔ مجمل بھی اور مفصل بھی ہیں، مطلق بھی اور مُقید بھی، اس میں اوامر بھی ہیں اور نواہی بھی، نسخ اور منسوخ بھی، ان میں مفہوم موافق بھی اور مفہوم مخالف بھی ہیں، اس میں منطوق، مفہوم اور معقول بھی ہیں، ان میں خبر واحد بھی ہے کہاں یہ دلیل ہوتی ہے اور کہاں نہیں، اس کے علاوہ دیگر کئی ساری چیزیں ہیں۔ جماعت پر لازم ہے کہ اپنے فقہی قواعد کو متعین کرے، ان کو اچھی طرح سمجھے اور ان کی تبنی کرے اور ان کو دوسروں کے سامنے پیش کرے۔

ان اصولی قواعد میں سے زیادہ تر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ ہر قاعدے سے کئی فروع سامنے آتے ہیں۔ چونکہ اکثر ان میں اختلافات ہیں، اس لئے اختلاف سے بچنے کے لئے ان قواعد کی تبنی کرے جو جماعت کی نظر میں درست ہوں۔ اصول کے قواعد کی تبنی کر لینے کے بعد ہی فروعی احکام کو ان قواعد کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

اُصول کا علم اور اصولی قواعد کی سمجھ ہونے کے بعد جماعت اس قابل ہو جاتی ہے کہ شرع کو اس کے مصادر سے سمجھ کر معلوم کر سکے، اس کے بعد جماعت کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ طے کردہ طریقہ اجتہاد کی پیروی کرے۔ اسی خاصیت کی وجہ سے جماعت کو دوسروں سے الگ نظر آنا چاہئے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جنہیں لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے اور اس کی خاطر پہلے اپنے شباب کو اس پر تربیت دے کر تیار کرے اور پھر ان کے ذریعے انکو لوگوں تک پہنچائے، یہ وہ پہلی اینٹ ہے جس کی اساس پر جماعت کا ڈھانچہ تعمیر کرنا ضروری ہے۔

ہاں مجتہد کا کام ڈاکٹر کی طرح ہے۔ ایک ڈاکٹر سب سے پہلے مریض سے اس کے حالات سنتا ہے۔ پھر وہ بیماری کی ظاہری علامات سے متاثر ہوئے بغیر اصل بیماری کی تشخیص کرتا ہے، جس کی مریض کو شکایت ہوتی ہے۔ پھر ان معلومات کی طرف رجوع کرتا ہے جو اس نے پڑھائی کے دوران سیکھی ہیں۔ وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کرے گا جو اس مرض کا علاج بتلانے میں مددگار ہیں، پھر آخر کار اس کا علاج کرتا ہے، یعنی اس مرحلہ میں وہ دوائی دے گا، دوسرے الفاظ میں وہ علاج بتلانے میں کتابوں کی طرف واپس پلٹتا ہے۔

جی ہاں وہ جماعت جو تبدیلی چاہتی ہے اور تبدیلی کے لیے کام کرتی ہے اگر وہ اسلامی جماعت ہے تو اس پر لازم ہے کہ وہ تبدیلی بھی اسلامی ہی لائے، تبدیلی کے لئے کام بھی اسلام سے ہی ہو۔ تبدیلی

اسلامی بنتی ہے تو شرعی دلیل کی بنیاد پر نہ کہ شخصی رائے پر یا خواہش یا عقل سے معلوم ہونے والی مصلحت پر اور نہ ہی حالات و واقعات کا اثر لے کر۔ بلکہ صرف شرع ہی جماعت کو حکم شرعی دکھائے۔ اسلام کی محبت یا مسلمانوں کے حالات سے فکر مند ہونا، جماعت کو کوئی حکم املاء نہیں کراتے۔ مسلمانوں کی مصلحت کیا ہے اس کا فیصلہ شرع ہی کرے گی کیونکہ مسلمانوں کی مصلحت شرع ہی میں موجود ہے۔ یہاں کچھ تفصیل ضروری ہے جس سے مصلحت کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر واضح ہو گا؟ اور یہ کہ مصلحت کب اور کن حالات میں شرعاً معتبر ہوگی؟

### مصلحت:

مصلحت کسی نفع کو حاصل کرنا یا کسی نقصان کو دور کرنا ہے، مصلحت کا فیصلہ یا تو عقل کرے گی یا شرع۔ اگر اس فیصلہ کو عقل پر چھوڑ دیا جائے تو لوگوں کو بڑی تکلیف اور مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا کہ حقیقی مصلحت کیا ہوگی کیونکہ عقل محدود ہے۔ عقل انسان کی حقیقت و ماہیت کا مکمل ادراک نہیں کر سکتی۔ اس لئے عقل یہ فیصلہ بھی نہیں کر سکتی کہ اس کے لئے مصلحت کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل کو جب انسانی حقیقت کا ادراک نہیں تو وہ کیونکر یہ فیصلہ کرے گی کہ یہ چیز انسان کے حق میں مصلحہ یا مفسدہ ہے۔ اس کی حقیقت صرف اس کا خالق اللہ جل شانہ ہی جانتا ہے، لہذا اس کے سوا کسی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ حقیقی طور پر انسان کی مصلحت کا تعین کرے۔ ہاں انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ ظن (تخمینی طور پر) کی بنیاد پر یہ طے کرے کہ فلاں چیز اس کی مصلحت (مفاد) میں ہے یا اس کے لیے نقصان دہ ہے، لیکن اس کا یقینی و قطعی تعین نہیں کر سکتا۔ پس مصلحت کے تعین کو ظن کے حوالے کرنا ہلاکت میں پڑنے کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ کوئی چیز کو نقصان دہ خیال کرے پھر اسے

معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں مصلحت (مفاد) ہے، یوں ایک اچھی چیز سے اپنے آپ کو محروم کر دے گا۔ کبھی کسی چیز میں اُسے مصلحت نظر آئے گی بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقصان دہ ہے چنانچہ وہ اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر بیٹھے گا۔ آج عقل کسی چیز پر نقصان دہ ہونے کا حکم لگا دیتی ہے اور کل معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مصلحت (فائدہ) ہے۔ یا آج کوئی شے نقصان دہ معلوم ہوئی اور اس پر نقصان دہ ہونے کا حکم لگایا، کل کو معلوم ہوا کہ اس میں تو مصلحت ہے، اس قسم کا متضاد حکم لگانا جائز نہیں ہے۔ خود ساختہ سیکولر نظام اسی چیز کے لیے تو مشہور ہیں، ان کے قانون بنانے والے انسان لوگوں کے لئے ان نظاموں سے بھلائی کی توقع کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مسلسل قوانین میں تبدیلی اور رد و بدل کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ نظام کی تجدید مسائل کے حل کا ایک لازمہ بن چکا ہے، ایسا اس لئے ہوتا ہے کیونکہ اصل میں وہ آج تک اشیاء اور افعال کے صحیح حکم تک نہیں پہنچ سکے جنہیں فیصلہ کن اور حتمی و حقیقی تسلیم کیا گیا ہو۔ چونکہ انہوں نے انسانی کمزوری کو تسلیم نہیں کیا اور خالق اعلیٰ کو حاکم نہیں مانا ہے اس لئے اب وہ ہر شے کو نامکمل اور ارتقاء پذیر سمجھتے ہیں جنہیں تھوڑے وقت کے بعد پھر تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ ان کے اس نقطہ نظر کے تحت وہ دیگر ایسے نظاموں کو ناقص سمجھتے ہیں جس میں ارتقاء اور ترقی کا عمل نہیں ہوتا اور انہیں یہ کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جو نظام ترقی نہیں کرتا وہ جامد اور ساقط ہے۔ اس معاملہ میں مسلمان بھی کفار کے اس جھوٹ سے متاثر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایسے مسلمان چونکہ اسلام کی صحیح اور حقیقی مزاج کی سمجھ سے دور ہیں اس بنا پر وہ اپنے بچاؤ میں اور اپنے دین کے دفاع کی خاطر یہی طرز فکر اختیار کر کے اپنے دشمن کے پیچھے ہانکے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ اسلام کی فطرت کی صحیح سمجھ رکھتے تو جان لیتے کہ کمزوری تو دشمن کے نظام کی فطرت میں ہے کہ جس میں تھوڑے ہی وقت میں تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے اور ان کا دشمن اپنی کمزوری پر پردہ ڈال کر دوسروں پر اپنا رعب بھار رہا ہے۔



بے شک وہ خالق ہی ہے جو انسان کے امور کی تدبیر کرتا ہے اور انسانی حاجات اور جبلتوں سے پیدا ہونے والی صورتوں اور مشکلات کو صحیح طور پر حل کرتا ہے اور انہیں فطری اور صحیح طور پر پوری کرنے کے قابل کرتا ہے۔ جس حقیقت کا علاج مطلوب ہو اس کے لئے ضرورت بھی ایسے درست حل کی ہوتی ہے جو اس کی صورت حال کے مطابق ہو۔ اور چونکہ انسان کی حقیقت بحیثیت انسان ہمیشہ ایک جیسی ہے اور کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتی تو اس کا علاج (حل) بھی ایسا پائیدار اور مستقل ہونا چاہیے جس میں تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آئے۔ پس مرد کو بحیثیتِ نر اپنی اٹل فطرت کے مطابق عورت سے اپنی خواہش پوری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اب چونکہ مرد اور عورت ان کی طبعی اور فطری حقیقت میں کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتے تو اصولی طور پر ان کے درمیان تعلق بھی ہمیشہ سے باقی رہے گا۔ اس لیے یہ قابل قبول نہیں ہے کہ ہم ایسا نظام بنانے لگیں جو پہلے تو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تعلقات کو طے کرے پھر کچھ عرصے بعد زمانہ اور ترقی کو بہانہ بنا کر اس نظام کو بدل ڈالے جس نے پہلے عورت اور مرد کے تعلقات کو طے کیا تھا، جبکہ ان دونوں کی حقیقت اور فطرت اب بھی وہی ہے اور ان کے تعلقات کی نوعیت بھی بدلی نہیں ہے۔ اسی طرح شراب کی فطرت ہے جو کبھی تبدیل نہیں ہوئی ہے، پھر کیا وجہ ہوئی کہ ہر وقت اس کا حکم بدلتا رہے؟

اسی طرح جوئے بازی کا معاملہ ہے اس کی حقیقت ہمیشہ وہی ہے اور کبھی تبدیل نہیں ہوئی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے حکم میں ہر وقت تبدیلی کی جاتی رہتی ہے؟، اسی طرح ڈھیروں کئی مثالیں ہیں جہاں حقیقت تبدیل نہ ہونے کے باوجود چیزوں کا حکم ہمیشہ تبدیل کیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ”ترقی“، ”لچک“ اور ”جدیدیت“ وغیرہ انسانوں کے بنائے ہوئے موجودہ خود ساختہ نظاموں کے اوصاف ہیں، جن کا راستہ حق سے ہٹا ہوا ہے، اس لئے یہ نظام ہمیشہ تبدیلی کا شکار

رہتے ہیں۔ تبدیلی پھر اس کا تجربہ، چنانچہ پھر تبدیلی، اس طرح تبدیلی کا کبھی ختم نہ ہونے والا یہ سلسلہ انسان کی بے بسی کو واضح کر دیتا ہے کہ وہ خود سے حقیقی ہدایت حاصل کر کے نظام کو صحیح بنانے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ البتہ اس کمزوری اور نقص کو لفظی ہیر پھیر کے ذریعے چھپاتے ہیں اور اپنی کمزوری یعنی ان کے ناپائیدار تبدیلی کے عمل کو نہایت خوشنما الفاظ جیسے ”ترقی“ اور ”انسانی ارتقاء“ کا نام دیتے ہیں۔ اس لئے انسانی کمزوری کے اس معاملہ کو جان کر اس من گھڑت قاعدے کو مسترد کیا جائے جسے لوگ شرعی قاعدے کا نام دیتے ہیں، وہ قاعدہ یہ ہے: **لاینکر تغیر الاحکام بتغیر الازمان والمکان۔** ”زمانے اور جگہ کے بدلنے سے احکامات کے بدلنے میں برائی نہیں ہے۔“

اس وجہ سے ایک معاملہ میں اللہ کا حکم بھی ایک ہی ہے، ایک سے زائد نہیں ہو گا۔ ہاں اگر اس معاملہ کی اصل حقیقت بدل جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا حکم بھی بدل جائے گا۔ مثال کے طور پر انگور کا حکم یہ ہے کہ وہ مباح ہے، لیکن جب اس کی حقیقت بدل جائے یعنی وہ خمیر کے عمل کے ذریعے شراب بن جائے، تو اس کا حکم بدل جائے گا اور اب اس پر شراب کا حکم لگے گا جو کہ حرام ہوگی، پھر اگر اس شراب کا سرکہ بنایا جائے تو اس کا حکم پھر تبدیل ہو گا اور پھر مباح ہو جائے گا، اس میں زمان اور مکان کا کوئی اعتبار نہیں یعنی وقت اور جگہ بدلنے پر حکم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ اس کی ہر حقیقت کا ایک الگ حکم ہے، اس طرح ایسی کوئی چیز نہیں جو ایک جگہ حرام ہو اور دوسری جگہ حلال ہو، اسی طرح ایسی کوئی چیز نہیں جو ایک زمانے میں حرام اور کسی دوسرے زمانے میں حلال ہو، چنانچہ حکم شرعی پر وقت اور جگہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

شریعت اسلامی ماضی کے تمام واقعات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اسی طرح موجودہ تمام مسائل اور آئندہ زمانے میں پیش آنے والے تمام حالات و واقعات کے لئے بھی اپنے پاس حل رکھتی ہے۔ کوئی

واقعہ، مسئلہ اور حادثہ ایسا پیش نہیں آتا جس پر اسلام کی جانب سے کوئی حکم موجود نہیں ہو۔ اسلامی شریعت انسان کے تمام افعال کا مکمل اور جامع طور پر احاطہ کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ (النحل: 89) ”اور ہم نے آپ پر ایسی کتاب نازل کر دی جو ہر ایک چیز کو کھول کر بیان کرتی ہے۔“

یہ اس لئے جامع ہے کہ یہ ہر فعل اور شے کے بارے میں یا تو قرآن و حدیث سے دلیل لاتی ہے یا پھر اس کے حکم کو جاری کرنے کی علت divine reason سے آگاہ کرتی ہے، علت پر شرعی نص کی دلالت ضروری ہے یعنی ”علت شرعی“ جس پر کوئی نص دلالت کرتی ہو، عقلی تاویلوں سے حاصل ہونے والی ”علت عقلیہ“ نہیں ہوگی۔ اس موقع پر عقلی قیاس (Rational Analogy) اور شرعی قیاس (Sharai Analogy) کے درمیان فرق کی وضاحت کی جانی چاہئے۔

## عقلی قیاس:

عقل ایک جیسی دو چیزوں یا دو متشابہ چیزوں کے متعلق ایک جیسا فیصلہ کرتی ہے دونوں چیزوں کے لئے ایک ہی حکم جاری کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسی ہر دو چیزوں میں قیاس (analogy) کرتی ہے جن کے درمیان کوئی نہ کوئی مشابہت پائی جاتی ہو۔ اس طرح فیصلہ کرتے وقت دو مختلف چیزوں میں عقل فرق کرتی ہے، اور ان پر مختلف حکم لگاتی ہے۔ اس کو قیاس عقلی کہتے ہیں۔

یہ شرعی قیاس کے برخلاف ہے، کیونکہ شرع اکثر ایک جیسی چیزوں کے درمیان فرق کرتی ہے اور انہیں مختلف حکم عطا کرتی ہے اور اکثر شرع مختلف چیزوں کو اکٹھا کر کے ایک ہی حکم عطا کرتی

ہے۔ چنانچہ ہم دیکھیں کہ شرع نے ایک ہی چیز میں کس طرح فرق کیا مثال کے طور پر شرع اوقات کے درمیان میں فرق کرتی ہے، چنانچہ لیلۃ القدر کو دوسری راتوں پر فضیلت دی، اسی طرح شرع جگہوں میں فرق کرتی ہے جیسے مکہ کو مدینہ پر فضیلت دی، یا مدینہ کو دوسرے شہروں پر فضیلت دی، اسی طرح سفر کے دوران نمازِ قصر کے لئے چار رکعتوں والی اور تین رکعتوں والی نماز کے درمیان میں فرق کیا یعنی تین اور دو رکعتوں والی نماز میں قصر (کمی) کی اجازت نہیں دی، جبکہ چار رکعتوں والی نماز میں اس کو جائز کیا۔ ان سب میں عقل کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ وہ ان کے درمیان کوئی مماثلت پیدا کر سکے۔ مزید یہ دیکھیں کہ منی جو کہ پاک ہوتا ہے اس کے نکلنے کی صورت میں پاکی کے لئے غسل کو واجب قرار دیا گیا جبکہ مذی جو کہ نجس یعنی ناپاک ہے اور جو منی سے پہلے خارج ہوتا ہے، اس کے نکلنے کی صورت میں پاکی کے لئے صرف وضو کا حکم دیا گیا ہے، حالانکہ دونوں ایک ہی جگہ سے خارج ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم دیکھیں کہ کس طرح شرع نے مختلف چیزوں یا فعل کو اکٹھا کیا ہے اور ایک ہی حکم دیا ہے۔ عورت جس کو تین طلاق ہوئی ہوں، اس کی عدت تین ماہواری (حیض) مقرر کر دی جبکہ وہ عورت جس کا شوہر مر گیا ہو تو اس کی عدت چار مہینے دس دن مقرر کر دی، حالانکہ عورت کے رحم کی حالت دونوں صورتوں میں ایک ہے۔ طہارت حاصل کرنے میں پانی اور مٹی دونوں کو جمع کیا یعنی دونوں سے پاکی حاصل کی جاسکتی ہے باوجود یہ کہ یہ دونوں باہم مختلف ہیں، پانی سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور مٹی سے آلودگی۔ اسی طرح شرع نے شادی شدہ زانی اور عمداً قتل اور مرتد کی سزا قتل قرار دیا ہے، باوجود یہ کہ تینوں جرائم کے درمیان فرق ہے۔

اس طرح شرع نے کچھ ایسے احکامات کو بھی بیان کیا ہے جن کے اندر عقل کی گنجائش نہیں۔ مثال کے طور پر سونے کو سونے کے بدلے بیچنے کو حرام قرار دیا جبکہ ان کی مقدار برابر نہ ہو یا قرض کا معاملہ ہو، مردوں کے لیے سونایا ریشم پہننے کو حرام قرار دیا، لیکن عورتوں کے لیے منع نہیں کیا۔ سود کو

حرام قرار دیا، لیکن تجارت کو حرام نہیں کیا، وصیت کے معاملے میں کافر کی گواہی کو قابل قبول قرار دیا جبکہ خلع کے بعد رجوع میں شرط لگادی کہ گواہ صرف مسلمان ہو۔ اسی لئے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ و رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”لو کان الدین یوخذ بالرای لکان مسح باطن الخف اولی من الظاہرہ“ ”اگر دین میں رائے کی گنجائش ہوتی تو موزے کے نچلے حصے پر مسح کرنا اوپر کے حصے پر مسح کرنے سے بہتر ہوتا۔“

یہ وہ بنیادی امور ہیں جو ایک جماعت یا حزب کے لئے جو اسلامی زندگی کی واپسی کے لیے کام کرتی ہے، ناگزیر ہیں۔ اس جماعت کی ثقافت میں یہ تربیت نظر آنی چاہیے کہ وہ کس طرح حقیقت کو سمجھتی ہے اور لوگوں کے لیے اسے کیسے بیان کرتی ہے؟ تاکہ وہ بھی حقیقت کو جان سکیں اور سمجھ سکیں، اس کے علاوہ جماعت کے لئے ضروری ہے کہ وہ شرعی مصادر اور اصولی قواعد کا تعین کر کے انہیں (تنبی) اختیار کرے اور پھر انہی کی بنیاد پر شباب کی تربیت اور تیاری کروائی جائے، کیونکہ ان کی شخصیتوں کو اسلامی شخصیت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی عقلیہ (ذہنیت) کو اسلامی بنایا جائے، ذہن سازی کی جائے اور جب وہ ان قواعد کو قبول کریں گے تو ان کی عقلیہ اسلامی بنیاد پر تیار ہونے لگے گی یوں یہ عمل بھی جماعت کی ثقافت کا حصہ ہوگا۔ اس کے علاوہ فکری اور اصولی ثقافت کو تعمین کئے بغیر اور اس ثقافت کو جماعت میں پروان چڑھائے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے تاکہ وحی کو بغیر عقلی ملاوٹ سے خالص رکھ سکیں اور اسلامی افکار و نظریات کی شفافیت کی حفاظت کی جاسکے اور وحی کو ایسی تمام چیزوں سے الگ کر سکیں جو صاف ستھری وحی الہی کو غبار آلود کر دیتی ہیں اور دُھندلا بنانے لگتی ہیں، مثال کے طور پر یہ قاعدہ کہ:

**لا ینکر تغیرالا حکام بتغیر الزمان والمکان۔**

”زمانے اور جگہ کے بدلنے سے احکامات کے بدلنے کا انکار نہیں۔“

یابہ قاعدہ کہ:

## الضرورات تُبيح المحظورات

”ضرورت حرام کو مباح کر دیتی ہے۔“

یابہ قاعدہ کہ:

## الدين مرن ومتطور

”دین لچکدار اور ترقی پسند ہے۔“

اسی طرح یہ کہنا کہ:

## حيثما تكون المصلحة فثم شرع الله

”جہاں مصلحت ہوگی وہاں اللہ کی شریعت ہوگی۔“

جی ہاں یہی وہ وجہ ہے جس کی وجہ سے جماعت پر ضروری ہے کہ وہ اپنے لئے اصول متعین اور اختیار کرے جو جماعت کے نقطہ نظر اور شرعی سمجھ کی نگرانی اور دیکھ بھال کرے اور یہ کام جماعت کو اپنی کاروائیوں اور ذمہ داری کے لئے احکام متعین کرنے اور اختیار کرنے سے بھی قبل کرنا ہوگا اور ان قواعد کی روشنی میں اطاعت و پابندی کرے تاکہ اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر سکے۔

ایک ہی مسئلہ میں یہ ممکن ہے کہ کئی اجتہادات ہو چکے ہوں، لہذا جماعت کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ ان اختلافی مسائل میں ٹھوس دلیل کی بنیاد پر شرعی احکامات کو تبنی کر لے اور ان پر ثابت قدم رہے۔ اس کے بعد جماعت لوگوں کے سامنے اپنے اُصول (فقہی اصول) اور فروع (فروعی اصول) کو بیان کرے۔ اسی ثقافت کے ماحول اور اس کی تربیت میں جماعت اپنے شباب کی شخصیت کی تعمیر کرتی ہے، پھر ان کی ہمرکابی میں میدانِ کارزار میں اُترے اور ان کی بنیاد پر لوگوں میں گفتگو اور بحث و مباحثہ کرے، پھر اس اطمینان اور دلیل کی بنیاد پر دعوت و تبلیغ کے ذریعے مزید دیگر لوگوں کو جیت لیتی ہے تاکہ وہ بھی اس ثقافت کو اختیار کرتے جائیں جس طرح اس نے خود اختیار کیا تھا، وہ اسی ثقافت کے مطابق اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرتی ہے ورنہ وہ خود کو فکری طور پر ضائع کر دے گی اور اپنے طریقہ کار میں لڑکھڑانے لگے گی اور پھر بھیڑ میں کہیں گم ہو جائے گی۔

مصادر اور اصول کا مطالعہ اور تعین، تبدیلی لانے کے عمل سے جڑے احکامات کے مطالعہ اور ان کے تعین سے بھی مقدم ہیں۔ جماعت کو اپنے طریقہ کار پر چلتے ہوئے سخت مشکلات اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا، چنانچہ اگر اس نے ٹھوس دلیل کے مطابق اُصول کو باضابطہ طور پر اختیار نہ کیا ہو، تو جماعت تذبذب کا شکار ہو کر بہت جلد لڑکھڑانے لگے گی اور وہ اپنے طریقہ کار اور اپنے اصولوں کو سرعت کے ساتھ تبدیل کرتی ہوئی نظر آئے گی۔ ممکن ہے کہ چاروناچار جمہوریت کے کھیل میں کود پڑے اور اسی موجودہ ناقص نظام میں شامل ہو جائے جو خود ہی ایک بنیادی مسئلہ ہے اور دعوت کے راستے کی بڑی رکاوٹ ہے، جمہوری نظاموں میں شمولیت کے لئے دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ جمہوریت اسلام کے ایک اصول کے مطابق بالکل صحیح ہے اور وہ یہ کہ اسلام میں شوریٰ ہے جو جمہوریت کے مشابہ ہے۔ پھر تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ پچھلے ادیان (عیسائیت، یہودیت وغیرہ) کے ہمنوا بن جائے اور ان سے بھی احکامات لینے لگیں اور کہیں کہ (شرع من قبلنا شرع لنا) یعنی ہم سے قبل قوموں کی شرع

ہمارے لیے بھی دلیل ہے۔ انہیں جس چیز نے اس تبدیلی پر مجبور کیا، دراصل وہ دعوت حق کے صحیح شرعی طریقے کی پیروی کے راستے میں پیش آنے والی مشکلات اور خطرات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحیح شرعی طریقے پر چلنا مشکل ہے۔ اور کبھی وہ دیکھتی ہے کہ دوسری تنظیموں کے اسلوب پر کام کر کے وہ تبدیلی تک پہنچ سکتی ہے، یوں جماعت پھر طریقے کی جگہ اسلوب آزمانے میں مصروف ہو جاتی ہے۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ جماعت حالات سے تنگ آکر حکم شرعی کی بجائے مسلح جدوجہد پر یقین کرنا شروع کر دے۔

چنانچہ جماعت کے لئے اصول اور مصادر کو طے کر کے اختیار کرنا اور پھر شرع سے ثابت شدہ طریقہ اجتہاد کی پابندی کرنا وہ بنیادی افعال ہیں جو تبدیلی کے اس عمل میں جماعت کو ان باتوں پر پابند بناتے ہیں جو اللہ کا مطالبہ ہے اور جن سے وہ راضی ہوتا ہے اور ان باتوں سے متاثر ہونے سے بچائیں گے جو مصائب و حالات کا مطالبہ نظر آتا ہو گا یا مصلحت کو عقل سے طے کر کے اس کے تقاضے پورے کرنے سے روکیں گے۔

اس طرح جماعت جب سوچنے کے شرعی طریقہ کار کو طے کر لے تو اس کے بعد وہ تبدیلی کے لئے کام کرنے کے شرعی طریقہ کار کو طے کرے گی ورنہ جب اس کے سامنے کئی راستے ہوں گے تو وہ نا سمجھی میں ہلاکت کے راستے پر چل سکتی ہے، ایسے ناہنجار ہلاکت کی کسی وادی میں گم ہو جائے، اللہ کو کوئی پروا نہیں۔

تو جماعت کے یہ بنیادی افعال، شرعی طریقہ فکر اور شرعی طریقہ اسے صراط مستقیم کا پابند کریں گے۔ پھر ایک مرتبہ جب جماعت اپنی ثقافت کے مصادر اور اس کے قواعد و ضوابط کو طے کر کے



اختیار کر لے تو اس کے بعد جماعت کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ اپنی جماعتی ثقافت کو بھی ان مصادر اور اصولوں کی ہدایات کی روشنی میں طے کرے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے۔

ان مصادر اور اصول کے مطالعہ کے دوران جماعت اچھی طرح چھان بین سے یقینی بنالے کہ اس کی شرع کی سمجھ میں کوئی ملاوٹ نہیں ہے۔ ساتھ ہی جماعت یہ کام کرے کہ ہر اس ملاوٹ کو دور کیا جائے جو وحی کو صاف و شفاف اور خالص رہنے نہ دے اور جدوجہد میں رہے تاکہ شرع کی سمجھ رکھنے میں وہ خواہشات اور تمناؤں سے متاثر نہ ہو اور عقل کو اجازت نہ دے کہ وہ قانون سازی کے شرعی عمل پر تسلط حاصل کر لے۔ ان تمام شرعی مصادر اور اصول پر بحث اور انہیں طے کئے بغیر جماعت کے لئے جماعت کی ثقافت کو تیار کرنا غیر ممکن ہے جن پر ایک شرعی جماعت قائم ہوتی ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس بنا پر جماعت پر لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اب اس حقیقت کی طرف رُخ کرے جس میں اُمت زندگی گزار رہی ہے اور اس کا مطالعہ کرے۔ جماعت امت میں پائے جانے والے افکار، جذبات و احساسات اور نظاموں کا مطالعہ کرے، تاکہ وہ اندازہ لگا سکے کہ اُمت نے ان کفریہ افکار اور نظاموں کی کس حد تک مزاحمت کر کے انہیں اپنے اندر داخل ہونے سے روک رکھا ہے اور کس حد تک ان کے اندر کفریہ افکار سرایت کر چکے ہیں۔ اُمت کا فرانہ افکار کے حملوں کا مسلسل ہدف بنی رہی ہے، جن کو کفار نے مسلمانوں کے لئے ایسی دوا اور علاج بنا کر پیش کیا ہے کہ گویا کہ انہی کو اختیار کرنے میں امت کی بھلائی اور ترقی ہے۔ سیاسی لحاظ سے کفار نے امت پر ان مہروں اور ایجنٹ حکومتوں کے ذریعے حکومت کی جن کو کافر استعمار نے مسلمانوں پر مسلط کیا ہے تاکہ یہ ان کے ذریعے امت کو اپنی مٹھی میں کر کے ان کی دولت اور وسائل پر قبضہ کر سکیں اور ہر اس سنجیدہ عمل کو روکیں جو امت

کے مفاد میں ہو، جو ان کے مفادات کے لئے چیلنج بن جائے یا جو ان کے استعماری وجود کے لئے خطرہ ثابت ہو۔

چونکہ مغربی استعماری کفار کو اس کی بقاء اور تسلط کے لئے کسی بھی منظم اجتماعی کام کی سنگینی کا احساس ہے، اسی لیے اس نے ہمارے اندر ایسے افکار پھیلا دیئے ہیں جو مسلمانوں کو اجتماعی یا حزبی عمل سے دور لے جائیں۔ اس کی بجائے مغربی کفار نے جزوی اجتماعی افعال (انجمنوں اور خدماتی اداروں کے کام) کی ادائیگی میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کی ہے یا ذاتی اعمال، اخلاقی حالات کو سدھارنے جیسے انفرادی کاموں کو اجتماعی طور پر کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے، حتیٰ کہ اقتدار کی جانب سے براہ راست کبھی اس قسم کی سرگرمیوں کے لئے خدمات مہیا کرائی گئیں، تو کبھی ان کاموں کے لئے چھوٹ دی گئی، اس طرح ان کی ہمت افزائی کی جاتی ہے اور یہ اعمال وہ ہیں جو کہ فروعی مسائل ہیں جیسے غربت اور اخلاقی گراؤٹ کے خلاف کام وغیرہ۔ مغربی کافرنے مسلمانوں کو ان کے دین کے بارے میں تذبذب میں مبتلا کر دیا اور دین پر ان کے اس یقین کو ہلا دیا کہ صرف ان کے دین میں نوع انسان کی تمام مشکلات کا واحد صحیح حل موجود ہے، جب اس نے مسلمانوں کے عقیدے کو ان کی زندگی سے دور کر دیا پھر اس کے بعد ان کی زندگیوں سے دین کی دوری کو زبردستی ان پر مسلط کر دیا اور ان کو روکا کہ اس دوری کو ختم کرنے کے لیے کام نہ کریں، اس وجہ سے جماعت یا حزب کے لئے ضروری ہے کہ وہ صورت حال کی اصل حقیقت، اس میں موجود افکار، جذبات اور نظام کا خوب گہری نظر سے مطالعہ کرے اور اچھی سمجھ حاصل کرے تاکہ اس کو معلوم ہو کہ وہ کس زمین پر کھڑی ہے، اور اس زمین کی حقیقت کیا ہے، پھر جان لے کہ اس پر کس طرح اسے چلنا ہے، وہ یہ بھی جان لے کہ رکاوٹوں کو ہٹانے کے لیے کدال اور کیا کیا اوزار و آلات درکار ہیں۔ اور کس قسم کی کھاد اور دیگر مواد کو زمین میں ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے بنجر زمین واپس دوبارہ زرخیز ہو کر ہریالی لے آئے۔ چنانچہ ان کے لیے سب سے پہلے حقیقت اور

صورت حال کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ چیز بذاتِ خود جماعت کی ثقافت کا اہم حصہ بنتی ہے، کیونکہ یہ حقیقت جماعت کے سامنے صاف واضح ہونی چاہئے۔ جماعت پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اس کو اپنے شباب اور عام لوگوں کے لیے واضح کرے تاکہ وہ حقیقت کے متعلق کسی غفلت میں نہ رہیں اور پھر وہ حقیقت کی سنگینی کی مناسبت سے علاج کی اہمیت سمجھ سکیں گے اور پھر اسی کے مطابق اس کے موزوں و مناسب اور درست علاج کی پہچان کر سکیں گے۔

اس فکری، سیاسی اور سماجی صورت حال کو جس میں امت زندگی گزار رہی ہے، طے کرنے کے بعد جماعت آگے بڑھتی ہے اور افکار، رائے اور احکام شریعہ کو ان فقہی اصول، ضوابط اور شرعی مصادر کی روشنی میں اختیار کرتی ہے جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے۔ جماعت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شباب اور لوگوں کے لیے اس طریقے کی وضاحت کرے جس کے ذریعے جماعت ان افکار، رائے اور احکام شریعہ تک پہنچی ہے، یہی وہ تمام باتیں ہیں جو جماعت کے شباب کے اندر یقین اور اطمینان، بیداری، اسلامی شخصیت پیدا کرے گی، اور امت میں عام بیداری کو جنم دے گی۔

## جماعت کی ثقافت

امت کی حالت تبدیلی کا شدید تقاضا کرتی ہے اور اس کے حالات کی تبدیلی کے عمل کا یہ تقاضا ہے کہ یہ کام ایک سیاسی عمل کی شکل میں ہو جو ایک ایسے سیاسی دھڑے کے ذریعے کیا جائے جس کی مبداء (آئیڈیالوجی) ہو۔ چنانچہ اس دھڑے کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں اور وہ کون سے عناصر ہیں جن سے مل کر ایک مکمل دھڑا تعمیر ہوتا ہے ان باتوں کا مطالعہ اور علم ہونا ضروری ہے، اسی طرح ان باتوں کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ گزشتہ جماعتوں کی خصوصیات کیا تھیں اور وہ کن عناصر سے مل کر قائم ہوئے تھے تاکہ ان کی ناکامی کے اسباب معلوم کیے جاسکیں تاکہ طے کر سکیں کہ ان وجوہات سے کس طرح بچا جائے، خاص طور پر دھڑے کا وہ پہلو جس کا تعلق جماعت کے ڈھانچے اور اس کی تشکیل سے ہے، ڈھانچے کا پہلو بنیادی طور پر اسلوب کے موضوع سے تعلق رکھتا ہے جس کو اختیار کرنا مسلمانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان کے کام کی ضرورت کے اعتبار سے بہترین اور موزوں اسلوب کو اختیار کریں۔ یہ بات بھی جماعت کی ثقافت کے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع ہے۔

چونکہ مسلمان اس وقت میں ایسے معاشرے میں رہ رہے ہیں جن میں ملے جلے مخلوط افکار، جذبات اور نظام ہیں ایسے میں اسلامی ریاست کے قیام میں معاشرہ کا سامنا کئے بغیر کوئی راستہ ممکن نہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ معاشرہ کے ساتھ نمٹا جائے، اس کے لئے معاشرہ کی حقیقت اور اس کے عناصر ترکیبی، اس پر اثر انداز ہونے والے عوامل اور اس کو تبدیل کرنے کی کیفیت جیسی باتوں کو طے کرنا ہوگا تاکہ ایک ایسے معاشرہ کی تعمیر کی جاسکے جو یکساں افکار، جذبات اور نظام رکھتا ہو یعنی ایک جیسے افکار، جذبات اور نظاموں سے تشکیل پانے والا ایک اسلامی معاشرہ وجود میں لایا جاسکے۔

چونکہ فرد واحد کی حقیقت معاشرے کی حقیقت سے مختلف ہوتی ہے اس لیے ایک فرد جن عناصر یا اجزائے ترکیبی سے مل کر بنتا ہے وہ ان اجزائے ترکیبی سے مختلف ہے جن سے مل کر ایک معاشرہ بنتا ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر ایک فرد کے بارے میں جو اسلام کے شرعی احکامات ہیں وہ معاشرے کے متعلق شرعی احکامات سے مختلف ہونگے۔

چونکہ جماعت کے کام کا تعلق معاشرے میں تبدیلی لانے کے عمل سے ہے اس لئے وہ تفصیلی طور پر ان تمام افکار اور شرعی احکامات کی تہنی کرتی ہے جو معاشرہ کی تبدیلی اور اس حقیقت کے علاج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت اپنے افراد اور دوسرے لوگوں کو اس بات کی دعوت دے گی کہ وہ اس عمل میں ان پر عائد ذمہ داریوں سے متعلق شرعی احکامات کو اپنائیں۔ یہ شرعی احکامات چاہے اسلامی معاشرہ کے قیام سے متعلق ہوں جن کا تعلق فرد کے ساتھ بطور فرائض کفایہ کے ہو جن کے نظر انداز ہو جانے پر اس کی پکڑ ہوگی اور اس کے بارے میں کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا، یا چاہے ان شرعی احکامات کا تعلق فرد کی ذاتی زندگی کے ساتھ ہو۔ جیسا کہ جماعت فرد کو معاملات، عبادات اور اخلاق وغیرہ کی دعوت دے گی جو اس فرد کی روزمرہ زندگی میں اسلامی عقیدے کی جانب سے اس پر عائد ہوتے ہیں، اس طرح جماعت مسلمان کی ذاتی اور معاشرتی زندگی میں مکمل طور پر اسلامی عقیدے کو اختیار کرنے کی دعوت دے گی۔

چونکہ مسلمان مغرب سے متاثر ہو کر ان کی طرح عقل کا استعمال کرنے لگے ہیں جس کے نتیجہ میں نفع اور نقصان کو وہ عقل سے طے کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ ایسے حالات میں رسول اللہ ﷺ کی بہترین انداز میں پیروی اختیار کرنے اور خالص طور پر شرع کی پابندی کرنے کی ذمہ داری کے تحت مسلمانوں اور بالخصوص جماعت پر ضروری ہو جاتا ہے کہ مطالعہ اور جانچ کے ذریعہ عقل اور اس کے

عناصر ترکیبی کو سمجھا جائے، تاکہ عقل کے استعمال کا دائرہ کار طے کریں، حقیقت اور مسئلہ کے متعلق سوچنے میں، عقیدہ اور احکام شرعی میں عقل کس طرح استعمال کی جائے گی، ان باتوں کو طے کر دیا جائے۔

چونکہ کام یہ ہے کہ ایسی حکومت کا قیام کریں جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے اور ایک دارالاسلام کو وجود میں لائیں، چنانچہ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ کے اعمال جن پر آپ ﷺ مکہ میں پابند رہے ان کا علم جان لینا ضروری ہے اور رسول اللہ ﷺ کے مکی دور کی سیرت اور ان اعمال کی معرفت حاصل کی جائے جو مدینے میں ایک اسلامی ریاست کے قیام کا باعث بنے، اس کا علم حاصل کر لینے کے بعد اسی ہدایت پر عمل کیا جائے۔ یہ کام تقاضا کرتا ہے کہ وہ احکامات جو طریقے کے متعلق ہوں اور وہ جو طریقے کے اسلوب اور وسائل کے متعلق ہوں ان دونوں کے درمیان میں فرق اور تمیز کی جائے تاکہ اللہ کے رسول ﷺ کی مکمل طور پر باریک بینی کے ساتھ پیروی کی جاسکے۔

یہ کام چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنے اور موجودہ نظاموں کو بدل ڈالنے کا ہے، چنانچہ اس کا تقاضا ہے کہ حکمرانوں کے کاموں اور حرکتوں کا سیاسی تعاقب کیا جائے اور ان حکمرانوں کی حقیقت کیا ہے اور دوسروں سے ان کے تعلقات کی حقیقت کیا ہے ان تمام کو سمجھا جائے، اسی طرح ان بڑے طاقتور ممالک کی پالیسیوں کی معرفت حاصل کی جائے جو ان حکمرانوں کو اپنے قابو میں لے کر اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرتے ہیں، اور ان کے منصوبوں کو بے نقاب کیا جائے۔

چونکہ مسلمانوں کی اراضی (ممالک) پر اس وقت ایسے کفریہ نظاموں کا قبضہ ہے جو ان پر مسلط کر دیا گیا ہے خاص طور پر مغربی تہذیب اور ان کے سیاسی، معاشی، سماجی اور تعلیمی نظام جو ان پر حاوی ہو

چکے ہیں، اس لیے اسلامی ریاست کے قیام کے کام کا اہم تقاضا یہ ہے کہ مغرب کے مبادی ان کے عقائد اور ان پر مبنی افکار اور ان سے نکلنے والے نظاموں کا مطالعہ کیا جائے۔

چونکہ شرعی مقصد اسلام کا نفاذ کرنا، اور اسلام کی دعوت کو ایک پیغام کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے، چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور اس سے جڑے تمام امور کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے ڈھانچے کا بھی مطالعہ کیا جائے اور ساتھ ہی حکومت کی بنیاد کن باتوں پر رکھی گئی ہے اس کا بھی معلوم کر لیا جائے، چنانچہ اس میں عمل کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست، اس کی شکل و صورت، اس کے ستون، ڈھانچے اور دستور پر توجہ دی جائے اور نافذ کئے جانے والے نظام کے بارے میں ایک رائے عامہ پیدا کی جائے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک اجمالی خاکہ بن جائے کہ اسلامی حکومت کیسے ہوگی، اس کے ساتھ موجودہ حکومتوں کا ڈھانچہ اور ان کی حقیقت بیان کی جائے اور اسلامی حکومت اور اس کے ڈھانچے کے درمیان کے فرق کو واضح کیا جائے، اس میں موجودہ نظاموں کی شکلوں سے کوئی اثر نہ لیا جائے۔ اس کے ساتھ ان باطل بنیادوں کو بھی بتلایا جائے جن پر موجودہ ریاستیں قائم ہیں اور وہ بنیادیں جس پر ریاست اسلامی قائم ہوتی ہے۔

اسی نہج پر جماعت اپنا ثقافتی مواد ایسی شکل میں مرتب کرے جو اسلامی زندگی کی دوبارہ واپسی اور خلافت اسلامی کے قیام کے عمل کی مناسبت سے درکار ہو تاکہ ان پر عمل کیا جاسکے اور لوگوں کو اس کی جانب دعوت دی جاسکے، خلافت اسلامی مسلمان اور غیر مسلم شہریوں پر اسلام کے مطابق حکومت کرے گی اور پھر وہ دعوت و جہاد کے ذریعے اسلام کا پیغام دنیا میں پہنچائے گی۔

## عقیدے کی اہمیت:

چونکہ اسلامی عقیدہ ہی وہ محرک ہے جو جماعت یا حزب کو عمل کے لئے ابھارتا ہے اور ان میں روح پھونک کر اس کو تروتازہ رکھتا ہے اور چونکہ جماعت کا مقصد اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کا قیام ہے، اس لئے اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ جماعتی ثقافت جس کو جماعت نے اس کام کی مناسبت سے اختیار کیا ہے، اس انداز میں اختیار کی جائے جو اس ثقافت کو عقیدے کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ جوڑتا ہو، یہ انداز ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے کام کرنے والوں میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو، فکر مندی، سنجیدگی، جوش و جذبہ، دلیری اور انہیں قربانی کے لئے تیار کرے کیونکہ یہ ثقافت ہوتی ہے جو کام کرنے والوں کے اندر احساس ذمہ داری، اہتمام، سنجیدگی، جوش و جذبہ اور قربانی پیدا کرتی ہے اور مسلمان کو ایسا بنادیتی ہے کہ وہ دعوت کے راستے کی مشکلات اور مشقتوں کو استقامت کے ساتھ برداشت کرتا ہے، یہی وہ ثقافت ہے جو داعی کو ایسا بنادیتی ہے کہ وہ لوگوں کے شکریہ کا انتظار کرنے والا اور تعریف کا محتاج نہیں رہتا، وہ تو صرف اپنے رب سے ڈرتا ہے اور قیامت کے دن سے خوف کھاتا ہے جس دن لوگوں کے چہرے فکر اور پچھتاوے میں دہشت زدہ ہوں گے، وہ دنیاوی زندگی کی تکلیف اور مشقتوں اور اس کے عیش و آرام سے محروم ہونے پر راضی ہوتا ہے تاکہ اپنے رب کی رضا و خوشنودی حاصل کرے اور آخرت کی نعمتوں اور ہمیشہ کی خوشی اور چین کو حاصل کر لے۔ عقیدہ کو ثقافت کی بنیاد میں اختیار کرنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں تبدیلی کی شروعات عقیدہ کی بنیاد پر کی جائے یعنی لوگوں میں تبدیلی کی ضرورت اور خواہش اور تبدیلی کی شروعات ان پر ہونے والے ظلم کی مخالفت میں یا جہالت سے چھٹکارا پانے کی خواہش میں یا خوشحالی و ترقی کے نعروں کی بنیاد پر نہ کی جائے بلکہ اسلامی عقیدہ کے مطالبہ کے تحت تبدیلی کی شروعات کی جائے۔ جو چیز مسلمان کو دعوت دینے کے لئے



تیار کرتی ہے اور دوسرے مسلمانوں کو دعوت قبول کرنے کے لئے تیار کرتی ہے وہ ایمانی افکار ہیں، یہی اسلام میں تبدیلی کے لئے اصل راستہ ہے۔

یوں ایمانی افکار جو تبدیلی کے لئے ثقافت کی بنیاد بنائے گئے ہیں ان افکار کو ثقافت کے ساتھ لوگوں میں ایسے انداز میں پھیلانیں کہ اس کے ذریعے اصل مقصد کو حاصل کیا جاسکتا ہو۔

پس عقیدے کو ان کے سامنے اس انداز میں پیش کیا جائے جو اصل مقصد کو حاصل کرنے میں مددگار بنے۔

(تنبی شدہ) اختیار کئے گئے شرعی احکامات اس انداز میں پیش کئے جائیں جس سے صاف طور پر ظاہر ہو جائے کہ اصل مقصد کیا ہے۔

اسی طرح حقیقت کی سمجھ اس انداز میں دی جائے کہ اس سے مقصد کے حصول میں مدد حاصل ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہایت ضروری ہے کہ جماعت کی ثقافت کا اسلامی عقیدے کے ساتھ رشتہ مکمل اور مضبوط ہو، جماعت کی ثقافت ایسی ہونی چاہئے جس کے لیے شرعی دلائل موجود ہوں، ثقافت اس لئے تیار کی جائے اور پھیلائی جائے تاکہ اس ثقافت کی مدد سے شرعی مقصد کو حاصل کیا جاسکے جو اسلامی ریاست کے قیام کے ذریعے عملی طور پر اللہ کی بندگی کرنا ہے، جو اللہ کی حاکمیت کو حاصل کرنا ہے یعنی ہم تمام پر حقیقی طور پر حاکم اللہ کو بنانا ہے۔ چنانچہ یہ لازمی ہے کہ جماعت کے شباب کی بھی اسی سمجھ کے ساتھ تربیت اور تیاری کی جائے۔

چونکہ اسلامی عقیدہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ایک دھڑ کے لئے اس کا سر یا جس طرح جسم کے اعضاء کے لئے دل، بالکل اسی طرح عقیدہ اسلام کا بنیادی حصہ ہے، یہی وہ اساس ہے کہ ہر ایک معاملہ

جس پر کھڑا ہوتا ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو پھر اعمال کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور کوئی انعام نہیں ہے، چنانچہ جب عقیدہ بتلایا جائے تو اس کے ذریعے نیچے دی گئی تمام باتیں صاف طور پر واضح ہونی چاہئیں اور ان پر پابندی حاصل کی جائے۔

اس کے نتیجے میں صرف اور صرف اللہ کی عبادت و بندگی کی جائے اور قانون بنانے والا حاکم بھی صرف اللہ تعالیٰ کو ہی مانا جائے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا حق نہیں کہ وہ قانون بناتا پھرے۔ وہی اکیلا رب ہے، وہی خالق ہے، وہی ہر شے کا علم رکھنے والا العلیم اور ہر ایک بات سے باخبر الخبیر قانون ساز الحاکم ہے، وہی تمام کاموں کی تدبیر کرنے والا ہے۔ انسان فطرتی طور پر اپنی کمزوری کو محسوس کرتا ہے، اس کو یہ احساس ہے کہ وہ ناقص، محتاج اور محدود ہے چنانچہ وہ اپنے معبود کی طرف پلٹتا ہے تاکہ وہ اس کو سیدھا راستہ بتائے، اس کو اندھیروں کی گہرائیوں سے نور کی طرف نکالے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں میں سے ایک رسول بھیجا اور اس کو رسالت سے نواز کر چنا تاکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا تلاش کرنے والے ہیں ان کو ہدایت ملے۔ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ رسول ﷺ اپنے رب کی طرف سے لائے ہیں ہم اللہ کے اس پیغام میں آپ ﷺ کی پیروی کریں۔ رسول معصوم ہیں اور قرآن کو پوری انسانیت کے لیے پیغام ہدایت، نور، رحمت اور دلوں کے لیے شفا بنا کر آپ ﷺ پر نازل کیا، اللہ نے انسانوں سے ہمیشہ ہمیشہ کی دائمی نعمتوں اور آسائشوں کا وعدہ فرمایا ہے اگر وہ ایمان لائیں اور اطاعت کرنے والوں میں شامل ہو جائیں اور جہنم سے دھمکایا ہے اگر وہ اس کا انکار کریں۔ پس انسان صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں بتایا ہے۔

مسلمانوں کو یہ بات خوب اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ اسلام انسان کی حقیقت کو دنیاوی زندگی سے ماقبل پر ایمان کے ساتھ جوڑتا ہے، یعنی اللہ خالق مدبر پر ایمان کے ساتھ۔ اسی طرح زندگی کے مابعد

پر ایمان یعنی بعث و نشور، حساب اور ثواب و عقاب (جزاء اور سزاء) سے جوڑتا ہے۔ عقیدہ کو اس انداز سے بتلائیں کہ مسلمانوں کو یہ رشتہ واضح طور پر نظر آئے اور وہ اس کو محسوس کرنے لگیں۔ جو اس تعلق کو توڑے یا جدا کر دے گا اس کی بات حقیقت سے دور، بے بنیاد اور غیر یقینی ہوگی بلکہ اس کی بات کفریہ کلمات ہوں گے۔

عقیدے کو اس طرح امت کے سامنے پیش کرنا چاہیے جس کے نتیجہ میں امت کا احیاء ہو یعنی وہ دوبارہ بلند فکر اور مرتبہ کو حاصل کرے اور اسلام کو ایک پیغام کی طرح دنیا تک پہنچانے کے لئے امت اٹھ کھڑی ہو جائے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ موجودہ دور کے کفر افکار کے مقابلہ کے دوران اسلامی عقیدہ کی سچائی کو سمجھیں۔ اور موجودہ دور کے تمام باطل افکار جیسے سرمایہ داریت، قومیت یا وطنیت کی برائیوں اور خرابیوں کو بے نقاب کریں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان ان باطل افکار کے مقابلے میں اسلام کے افکار کو لا کر کھڑا کر دیا جائے اور ان دونوں میں ایک فکری موازنہ کیا جائے، جس کے نتیجہ میں دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں پہلی چیز تو یہ کہ اسلام کے علاوہ ہر ایک باطل فکر اور اس پر قائم ہر ایک چیز ڈھے جانے لگتی ہے دوسری چیز یہ کہ اب موقع ہوتا ہے جب آپ صاف طور پر بیان کر سکیں کہ صرف اسلام ہی وہ سچائی اور وہ حق ہے جو پوری دنیا کی اصلاح کر سکتا ہے (کیونکہ انسانوں کے لئے اس کا عقیدہ اور نظام فطری اور عالمی ہے) نتیجتاً اس کے لیے ایسی اسلامی ریاست کا قیام ضروری ہے، جہاں اسلام نظر آئے اور پھر لوگ اسے اختیار کریں۔ اس کے لیے جماعت کو اس میدان میں کام کرنا ہو گا اور ان جھوٹے چمکیلے نعروں، پروپیگنڈوں اور افواہوں کو ختم کرنا ہو گا جن کو استعماری کافرنے مسلمانوں کے ذہنوں میں ڈال دیا ہے، مثال کے طور پر ”تہذیب اور فکر کی آزادی“ ”جوبادشاہ کے پاس ہے اس کے

پاس رہنے دو اور جو اللہ کے پاس ہے اس کے پاس رہنے دو“ ”میرا وطن ہمیشہ سچائی پر ہوتا ہے“ ”اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو“ یہ اور ان جیسے دیگر نعرے جو اسلام سے قبل جاہلیت کے تصورات کے مطابق ہیں۔ اسی طرح جماعت کا یہ کام ہے کہ مسلمانوں کے ذہنوں اور زندگیوں سے مغربی افکار کے اثرات کو کھرچ کر ختم کرے، اس کام کا طریقہ یہ ہو گا کہ ایسے تمام افکار کو جھوٹا ثابت کیا جائے جو ان جیسے نظریات کی بنیاد پر قائم ہوں مثلاً ”شریعت کو ترقی دینا“، ”شریعت کو زمانہ کے مطابق جدید بنانا“، ”موجودہ زمانہ میں عصری ضرورتوں کی تکمیل کے لئے شریعت کی لچک“ اور یہ سب مغربی نظریات کے مطابق ہیں۔ ”دین اور سیاست کو جدا کرنا“، ”دین میں کوئی سیاست نہیں ہے“، ”زمانے اور مکان کے بدلنے پر احکامات کے بدلنے سے انکار نہیں“۔ یہ اور ایسے تمام نعروں کو ختم کرنے کے علاوہ جماعت کا کام یہ بھی ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں متبادل کے طور پر توحید و رسالت یعنی ’لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ محمد رسول الله‘ پر مبنی اور اس سے پھوٹنے والے افکار کو لوگوں میں عام کرے۔

شریعت سے ہم یہ جانتے ہیں کہ ’لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ محمد رسول الله‘ کا معنی اس کے علم اور اس پر عمل کے لحاظ سے اس وقت تک دل میں خالص اور حقیقی طور پر نہیں بیٹھتا جب تک اس کے علاوہ ہر ایک فکر اور ہر ایک عقیدہ کو دل سے نکال کر پھینک نہ دیا جائے، چنانچہ اسلامی عقیدہ اور اس پر ایمان کا خلاصہ یہ ارشاد باری تعالیٰ کرتا ہے: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ (البقرہ: 256) ”تو جس نے طاغوت (غیر اللہ) کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا، تو اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا“۔

ایمان لانے کے لئے اللہ نے اس آیت میں طاغوت کے انکار (لا الہ) کو پہلی شرط بتلایا ہے تاکہ ایمان کا اقرار کرتے وقت کسی قسم کے شرک کے اثرات یا کفر کے داغ صفحہ دل پر باقی نہ رہیں اور ذہن

کو میلانہ کر سکیں اس طرح دل میں اس سلسلے میں کوئی تشویش باقی نہ رہے، یعنی دل میں شرک کی گندگی یا کفر کا شائبہ تک نہ رہے، جس کے بعد تمام ایمانیات خالص ہو کر دل میں اتریں گے۔ اس لئے کہا گیا کہ جو طاغوت سے انکار کر کے اللہ پر ایمان لائے گا تو گویا اس نے مضبوط رسی تھام لی، یعنی اب ایمان اس کا خالص ہو گیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے : ﴿فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ﴾ (محمد : 19)

”لہذا یقیناً جانو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں“

اس کا مطلب ہے کہ تلاش و جستجو اور غور و فکر کے بعد اس بات کا علم پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اور الہ موجود نہیں جو لائق عبادت ہو۔ پھر اس کے بعد (الا اللہ) کا تذکرہ ہے، اس میں صرف اللہ کے لئے معبود ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہ کلمہ غیر اللہ کی نفی اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا اثبات ہے۔ عربی زبان میں ایسے اقرار کو نہایت سخت قسم کا پختہ اقرار تسلیم کیا جاتا ہے اور اس میں حصر (محدود کرنے) کے معنی ہیں زبان و بیان کے اعتبار سے یہ کسی بات کو ثابت کرنے کا مضبوط ترین انداز ہے۔ لہذا نہ تو اشتراکی (سوشلسٹ) یا قومیتی (نیشنلسٹ) اور نہ ہی وطنیت کے افکار انسانیت کو بچانے والے ہیں نہ ہی یہ صحیح ہیں۔ بلکہ یہ فاسد اور باطل ہیں، یہ انسان کی مصیبتوں و بد نصیبی میں اضافہ کر دیتے ہیں اور خوشی نہیں دلا سکتے۔ اللہ کے دین اور اس کی شریعت کے علاوہ کوئی ہدایت و روشنی اور شفاء نہیں۔

اب جماعت افراد سازی کرے اور اپنے افراد کی اسلامی شخصیت بنائے، اس کے لئے ان کو صحیح اسلامی پیمانے دے، ان کے دلوں میں شرع کی پابندی سے محبت اور خلاف شرع امور کے متعلق نفرت بھر دے اور اسی طرح فیصلوں کے لئے وہ شرع کے فیصلے کو پسند کریں اور غیر شرعی فیصلوں سے نفرت کرنے لگیں، جس کی وجہ سے ان کی سمجھ شرع کے پیمانوں اور شرعی افکار کے قابو میں ہو جائیں، یوں شرع ان کی عقلوں کا پیمانہ بن جائیگی، ان کی پسند و رجحانات اسلام کے تابع ہوں گے، جو کچھ اسلام طے

کرے گا، جو اسلام کی پسند ہوگی وہ ان کی پسند ہوگی اور جسے اسلام قابلِ نفرت بتائے اس سے ان کو نفرت ہوگی۔

جماعتِ رواں دواں آگے بڑھتی ہے اور اس ثقافت کو اپنے شباب میں منظم حلقات کے ذریعے پروان چڑھاتی ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ شباب ان افکار کو لے کر زندگی کے میدان میں اُتریں تاکہ لوگوں کو اپنے اختیار کردہ افکار پر قائل کر دیں، یوں شباب کو قیادت کے لئے اور دعوتی ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے تیار کیا جائے۔ حقیقت یا صورت حال کو سمجھنے کے لئے جماعت عقل کو استعمال کرتی ہے، اور اپنے شباب کے سامنے اس فکری عمل کو پیش کرتی ہے جس پر اعتماد کر کے وہ اس کی کچھ عقلی تعریفیں پیش کرنے تک پہنچی۔ اس طرح وہ شباب کی رہنمائی کرتی ہے کہ واقعہ کے ساتھ ان کا معاملہ کیسا ہو؟ اس طرح ان حقیقتوں کی عقلی تعریفات کے مجموعے تک شباب کی رسائی کیسی ہوگی جو شرعی احکامات کے لئے لازمی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ حقائق مناطِ الحکم سے ملتی جلتی صورتحال کے حامل ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب جماعت عقل، جسمانی حاجات، انسانی جبلتوں، النهضة (ترقی) معاشرہ اور تہذیب اور تمدن کو متعین کی تعریف پیش کرتی ہے تو ان کو اس لیے بیان کرتی ہے کیونکہ جماعت اور اس کے شباب کے لئے ان تمام کی حقیقت کا ادراک ضروری ہے، کیونکہ اکثر و بیشتر شرعی احکامات کا تعلق ان امور کے حقائق سے ہے۔

جماعت دلائل کے ذریعے حکم شرعی کو حاصل کرنے کی جانب بڑھتی ہے، جماعت ان احکام کا استنباط کرتی ہے جو مسئلہ سے متعلق ہوں یا صورت حال کا حل دیتے ہوں۔ اس کے لیے ان تمام علوم کی تمینی کی ضرورت ہے جو شرعی نصوص کو سمجھنے کے لیے ضروری ہیں، تاکہ اس کے ذریعے جماعت اپنے اوپر لازم اللہ کے حکم کی معرفت حاصل کرے۔ جماعت پر لازم ہے کہ وہ طریقہ استدلال کو کھول کھول

کر اس قدر عام کر دے، جس سے شباب اور عام مسلمانوں کو اس کے طریقہ استدلال کا علم ہو جائے، یوں ان کے ذہنوں میں شرع کی سمجھ اور احکام کے استنباط میں اسلامی طریقہ کو راسخ کر دے۔

جماعت کے لئے ضروری ہے کہ اپنے شباب کو یہ ثقافت منتقل کرتے وقت اس بات کو ہمیشہ سامنے رکھے اور ان کو ترغیب دے کہ اصل مقصد اس کا عملی پہلو ہے۔ یہ ثقافت محض علم کے لیے ہے نہ ہی معلومات بڑھانے کے لیے ہے، نہ ہی اس کا مقصد شباب کی علمی سطح کو بلند کرنا ہے، بلکہ اس کے ذریعے فکری جنگ کے حالات پیدا کرنے اور سیاسی جدوجہد ہے، اور یہ کہ اس ثقافت کو امت میں ایک فکری قیادت دلائی جائے، جس کا مقصد ایک ایسی ریاست کا قیام ہو جو انہی افکار کا ترجمان بن کر ان کو دنیا کے سامنے پیش کرے۔

جماعت پر لازم ہے کہ عملی طور پر اپنے قول و فعل کے ذریعے صاف و شفاف اور نہایت باریکی سے اس ثقافت کی ترجمانی کرے۔ ایسا نہ ہو کہ جماعت کبھی کچھ ہو اور کرتی کچھ ہو۔ یہ معاملہ اللہ کو سخت ناپسند ہے جو اللہ کو غضب ناک کر دے گا کہ جماعت سچائی اور حق کا درس دے اور عمل اس کے خلاف کرنے لگے۔

جی ہاں جماعت پر لازم ہے کہ اس ثقافت کی تبنی کرے اور اسی پر اپنے شباب کی تعمیر کریں اور انہیں اس کی بنیاد پر تربیت دے یوں یہ ثقافت ان کے ذہنوں میں پیوست ہو کر مضبوطی سے جگہ بنالے۔ پھر اسلام کے ان بنیادی افکار کو لے کر جماعت امت کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ ان میں عام بیداری پیدا کرے، جس سے امت میں اس بنیادی فکر (عقیدہ) کے بارے میں رائے عامہ جنم لے۔ پھر امت کے سامنے عقیدے اور احکام شرعیہ کے متعلق بنیادی احکامات کو اس طور پر پیش کرے کہ جس کی بنیاد پر امت ایک ہی مقصد پر یکجا اور متحد ہو جائے جو کہ ”اللہ وحدہ لا شریک کی شریعت کو حاکم

بنانا ہے۔“ یوں امت صحیح راستہ اور سمت پر چلنے لگے گی اور پھر اس کے حقیقی اور فطری مقام پر واپس لوٹے گی، جو ایک لمبے عرصے سے اس نے گنویا ہوا ہے۔

یہ اساسی افکار اور بنیادی شرعی احکامات وہ اہم ترین اسلامی نظریات ہیں جن کی بنیاد پر حکومت اور قانون سازی اور عبادت و پرستش میں اللہ وحدہ لا شریک کی وحدانیت اور یکتائی ثابت ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ ذات اقدس جس کی نقل و پیروی کی جاسکتی ہے، اس کا حق صرف رسول اللہ ﷺ کو دیتے ہیں، یہ بنیادی نظریات لوگوں میں جنت کی تمنا اور شوق جگاتے ہیں اور ان میں جہنم کا ڈر پیدا کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بنیادی نظریات لوگوں پر صاف طور پر یہ حقیقت کھول دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت کو قائم کرنے کے لئے کام کرنا اسلام کا کتنا اہم ترین فرض ہے، کیونکہ اللہ کے کئی سارے احکام جو فرض ہیں ان کا دار و مدار اسلامی ریاست پر ہے، ان بنیادی نظریات ہی کی وجہ سے امت تمام لوگوں میں سے ایک منفرد امت بنتی ہے، ایسی امت جس کو نہ ہی کوئی نسلی امتیاز الگ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ریاست انہیں امت سے الگ کر سکتی ہے، اور یہ کہ امت مسلمہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور کوئی قومی یا وطنی رشتہ انہیں اس بھائی چارے سے جدا نہیں کر سکتا ہے، اور یہ کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی شریعت سے دوری اور اس کو ترک کرنے پر ان کا یہ حال ہوا ہے کہ آج وہ ذلت و خواری سے دوچار ہیں، یہ افکار یہ بھی بتاتے ہیں کہ مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے معبود کی جانب سے دی گئی شرع کی پابندی کرے اور وہ کوئی کام نہ کریں، جب تک انہیں اس بارے میں ان کے رب کا حکم معلوم نہ ہو، اس لیے وہ دلیل کی معرفت کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔

بلاشبہ یہی افکار ہیں جو ایسی زمین فراہم کرتے ہیں جن پر اسلام کے احکامات نشو و نما پا کر پھل لائیں گے اور دنیا میں امن و سلامتی پھیلانیں گے۔



جو کچھ بھی ہم نے اوپر بیان کیا اس جماعت کی ثقافت میں یہ تمام باتیں شامل ہونی چاہئیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم اس درست اسلامی طریقے کی نشاندہی کریں جس کا شرع ہمیں حکم اس لئے دیتی ہے تاکہ اس کے ذریعے اس ثقافت کو متعین کریں اور جس کی روشنی میں ہی اس ثقافت کی تبنی کی جائے۔

یوں جماعت کے پاس افکار، رائے اور احکام شرعیہ کی ایک بڑی مقدار وجود میں آتی ہے جو اس کے لیے ضروری ہیں، تاکہ جماعت ایک فکری جدوجہد اور سیاسی کشاکش میں کود پڑے اور ان افراد کے اندر زبردست ثقافت پروان چڑھائے، جو اس دعوت کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھائیں، یہ افکار اُمت میں رائے عامہ بنانے کے لئے ضروری ہیں، چنانچہ اُمت رائے عامہ کے نتیجے میں اس فکر کو قبول کر لے گی جس فکر پر یہ جماعت قائم ہے۔

یہ وہ دائرہ کار (فریم ورک) ہے جس سے باہر قدم نہ رکھنا جماعت پر لازم ہے۔ جماعت اگر اس کے تعین میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر اس کے بعد اگر فروعی احکام میں اس سے کچھ غلطی بھی سرزد ہوتی ہے تو جماعت پر کوئی الزام نہیں ہو گا یا وہ کسی دوسری جماعت سے اختلاف کرتی ہے یا دوسری جماعتیں اس سے اختلاف کرتے ہوں تو یہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ فروع میں اختلاف ہونا ایک ایسا امر ہے جس کی کوئی خلاصی نہیں۔

یہ ہے وہ ثقافت، جس کی جماعت کو اپنے عظیم مقصد تک پہنچنے کے لیے ضرورت پڑتی ہے اور یہ عظیم مقصد اللہ کی شریعت کو حاکم بنانا اور پورے عالم میں اسلام کی دعوت کو پھیلانا ہے۔ بے شک وہ اللہ ہی ہے جو توفیق اور کامیابی عطا کرتا ہے۔

# جماعتی کام کے لیے لازمی افکار کی تبنی کی فرضیت

شرع کے نزدیک فقط جماعت کا وجود مطلوب نہیں ہے، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ایسی جماعت موجود ہو جو مذکورہ کام کر سکے۔ جماعت کی موجودگی کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ:

﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔“ (آل عمران: 104)

شرع نے یہاں ایک ایسی سیاسی جماعت بنانے کو واجب قرار دیا ہے، زندگی گزارنے کے لئے جس کا مبداء (نظریہ حیات / آئیڈیالوجی) اسلام ہو اور وہ ان شرعی افکار اور احکام کی علمبردار ہو جو اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہیں جس کے لیے وہ جماعت وجود میں آئی ہے اور یہ مقصد غلبہ دین، اقتدار دین اور خلافت ہے۔ چنانچہ اس حکم میں مسلمانوں سے مطالبہ جماعت قائم کرنے کے لئے جماعت بنانا نہیں ہے، بلکہ جماعت کے لئے یہ ضروری ہے کہ مطلوبہ حکم کو پورا کرے، یعنی اسلام کی دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے حکم کو پورا کرنا ہے۔ اسی طرح اسلام کی دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عمل سے مراد صرف ان اعمال کو انجام دینا نہیں، بلکہ یہ اعمال بھی اُسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں جن کی تکمیل کے لئے دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے اور یہ مقصد غلبہ دین، اقتدار دین اور خلافت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: (( لا يحل لثلاثة نفر يكونون بأرض فلاة إلا أمروا عليهم أحدهم )) (رواہ احمد بن حنبل) ”اگر تین افراد بھی کسی صحرا میں ہوں تو ان کے لیے بغیر امیر کے رہنا جائز نہیں، ان کو اپنے میں سے ایک کو اپنا امیر مقرر کرنا چاہیے۔“

چنانچہ ایسا کوئی بھی مشترکہ اجتماعی کام جس کو انجام دینے کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے تو شرع نے یہ بتایا ہے کہ اس کے لیے اُن میں سے ایک جماعت کا وجود ضروری ہے، اس جماعت کا ایک واجب الاطاعت امیر ہونا چاہیے، جماعت پر اس کی اطاعت اس کام میں واجب ہوگی جس کے لئے اُسے امیر بنایا گیا ہے، تاکہ اس مشترکہ کام کا وہ خاطر خواہ نتیجہ نکلے جو شرع کو مطلوب ہے۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مسلمانوں پر بہت سارے ایسے احکام فرض کئے ہیں جن کی ادائیگی کی ذمہ داری خلیفہ پر ڈالی گئی ہے اس لیے ان فرائض کی ادائیگی کے لیے خلیفہ مقرر کرنا فرض ہے۔ چونکہ خلیفہ کا تقرر اور خلافت کا قیام جماعت کے بغیر ممکن نہیں، چنانچہ اس قاعدہ : **(ما لا يتم الواجب إلا به فهو واجب)** ”جس عمل کے بغیر فرض ادا نہیں ہوتا وہ عمل بھی فرض ہے۔“ کے بموجب ایک ایسی جماعت کا ہونا لازمی ہے جو خلافت قائم کرے اور خلیفہ مقرر کرے۔

یوں معلوم ہو گیا کہ جماعت کا وجود مطلوبہ شرعی مقصد کے وجود سے ایسا مربوط ہے کہ جس سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا، پس وہ جماعت ایسی نہیں ہوگی جو صرف اسلام کی طرف دعوت دے گی، یہ کوئی تبلیغی جماعت نہیں جو صرف تبلیغ کے لیے ہوتی ہے، بلکہ یہ ایسی جماعت ہوگی جو مسلمانوں کی زندگیوں میں اسلام کو نافذ کرنے کے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ نفاذ اسلام اسلامی ریاست کے قیام کے

ذریعے ہو گا جو انفرادی اور اجتماعی تمام اسلامی احکامات کو نافذ کرنے کا شرعی طریقہ ہے۔ اس لیے ایسی جماعت کا وجود لازم ہے جو اس مقصد کو پورا کرے جس مقصد کے لیے جماعت بنائی جاتی ہے۔

اس جماعت سے جو مطلوب ہے کیا یہ اس پر پورا اترتی ہے اس کے لیے مندرجہ ذیل امور ضروری ہیں:

ان تمام شرعی افکار، احکام اور آراء کی تنبیہ جو اس کام کی خاطر اس کے لیے ضروری ہیں۔ اس جماعت کے افراد قولاً، عملاً اور فکری لحاظ سے ان کی پابندی کریں۔ کیونکہ تنبیہ جماعت کی وحدت کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے۔ اگر جماعت کے افراد کے افکار مختلف ہوں گے اس میں متعدد اجتہادات ہوں گے، تو اگرچہ اس کے افراد کا مقصد ایک ہی ہو اور عمومی طور پر اسلام کے بارے میں وہ ایک ہی ہو، لیکن وہ بہت جلد منتشر ہوں گے اور اس کی کئی شاخیں بن جائیں گی، جماعت کے اندر ہی جماعتیں بنیں گی، یوں یہ دعوت لوگوں کو اس فرض کی ادائیگی کے لیے دعوت دینے کی بجائے ایک دوسرے کو اپنی جماعت کی طرف دعوت دینے میں بدل جائے گی، پھر یہ آپس میں الجھ پڑیں گے اور ہر ایک اپنی رائے کو صحیح سمجھنے لگے گا۔ اس وجہ سے تنبیہ اہم اور شرعی ہے۔ جماعت کی وحدت شرع کو مطلوب ہے، یہ مطلوب اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکے گا جب تک کام سے متعلقہ تمام ضروری افکار کی ایک ہی تنبیہ نہ کی جائے، پھر جماعت کے شباب پر اس تنبیہ کو لازم نہ کیا جائے۔ تنبیہ بھی اس قاعدے کی رو سے مطلوب ہے کہ: (ما لا یتیم الواجب إلا به فهو واجب) ”جس عمل کے بغیر فرض ادا نہیں ہو تا وہ عمل بھی فرض ہے۔“

تو جب تک کام کے بارے میں جماعت کے افکار، احکام اور آراء شرعی ہیں اور جب شباب جماعت پر بھروسہ کریں، تو پھر عملی افکار کی پابندی اصلاً شباب کے لیے جائز ہوگی، یہ بھی ایسا ہے کہ

مسلمان کے لیے یہ جائز ہوتا ہے کہ اپنی رائے ترک کر کے دوسرے کی رائے پر عمل کرے۔ عثمانؓ کی بیعت میں جب یہ شرط رکھی گئی کہ آپؐ اپنا اجتہاد ترک کریں گے اور سیدنا ابو بکرؓ اور سیدنا عمر بن الخطابؓ کے اجتہاد پر کاربند رہیں گے تو سیدنا عثمانؓ نے یہ شرط مان لی اور صحابہؓ نے اس کو تسلیم کیا اور آپ کی بیعت کی۔ ہاں یہ جائز ہے فرض نہیں کیونکہ علیؓ عمرؓ اور ابو بکرؓ کے اجتہاد کے مقابلے میں اپنے اجتہاد کو ترک کرنے پر تیار نہیں ہوئے اور صحابہؓ نے اس کا انکار نہیں کیا۔ اس طرح امام شیعہؒ نے فرمایا کہ ابو موسیٰ، علیؓ کے قول کے مقابلے میں اپنے قول کو ترک کرتے تھے، اس طرح زید ابی بن کعبؓ کے قول کے مقابلے میں اپنے قول کو ترک کرتے تھے، عبد اللہؓ، عمرؓ کے قول کی وجہ سے اپنا قول ترک کرتے تھے کئی واقعات ہیں کہ ابو بکرؓ اور عمرؓ نے اپنے اقوال چھوڑ کر علیؓ کے قول پر عمل کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ مجتہد کے لیے جائز ہے کہ وہ دوسرے مجتہد پر اعتماد کی وجہ سے اپنا اجتہاد ترک کرے۔ اس جماعت کے شباب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو جماعت کے فہم کے پابند بنائیں، اور ان سے مل کر واحد فکری اور شعوری کل وجود میں آئے۔

جس طرح جماعت پر اپنے عمل سے متعلقہ احکام شرعیہ کی تبنی لازم ہے، ایسا ہی اس پر ان احکام کی تنفیذ کے لیے اسالیب کی تبنی بھی لازم ہے۔ اسلوب حکم شرعی کو نافذ کرنے کی ایک صورت ہے۔ یہ وہ حکم ہے جس کا تعلق اس اصل حکم کے ساتھ ہے جس کے اثبات کی دلیل موجود ہے، مثلاً جماعت سے اس بات کا مطالبہ کہ وہ اسوۂ رسول اللہ ﷺ پر عمل کرتے ہوئے اپنے شباب کو زبردست ثقافت (تربیت) دے، یہ حکم شرعی ہے جس کی پابندی فرض ہے۔ لیکن اس حکم شرعی کو کس طرح اور کس صورت میں نافذ کیا جائے گا؟ اس کے لیے ایک معین اسلوب کی ضرورت ہے جس کے ذریعے اس حکم شرعی کو ادا کیا جاتا ہے۔ یہ اسلوب حلقات بھی ہو سکتے ہیں، خاندانی نظام کے ذریعے یا کوئی اور اسلوب استعمال کیا جاسکتا ہے۔

اسلوب کو اختیار کرنا عقل کی بنیاد پر ایسا مناسب عمل اختیار کرنا ہے جس کے ذریعے حکم شرعی کو ادا کیا جائے، اصلاً اس کا حکم اباحت کا ہے۔ شرع نے حکم شرعی کی ادائیگی کا حکم دیا اور اسلوبِ تنفیذ کو مسلمانوں پر چھوڑا ہے۔

ایک ہی حکم شرعی کے کئی اسالیب ہونے کی وجہ سے ایک جماعت پر دباؤ ہوتا ہے کہ وہ ایک متعین اسلوب کی تبنی کرے اور وہی اپنے شباب کو بتائے، یوں جماعت کے پاس حکم شرعی کی تنفیذ کے لیے ایک پائیدار اسلوب ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب کا وہی حکم ہے جو اصل حکم کا ہے۔ یعنی اسلوب بھی حکم شرعی کے تابع ہونے کی وجہ سے اسی کی طرح لازمی ہے۔

جب ایک جماعت پائیدار تربیت کے لیے حلقات کا نظام بطور اسلوب اختیار کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ ایک لازمی اسلوب کے طور پر اس کی تبنی بھی کرے، اس اسلوب کی تبنی کرتے وقت اس مقصد پر نظر رکھی جائے جس کا حصول اس اسلوب سے متوقع ہے، یہ مقصد پائیدار تربیت ہے، لہذا حلقات کے اسلوب میں ہر اس چیز کی تبنی کرے، جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے، مثلاً: حلقہ کے افراد کی تعداد مقصد کو پیش نظر رکھ کر مناسب انداز سے مقرر کی جائے، اگر تعداد زیادہ ہو جائے تو تربیت صحیح طور پر نہیں ہو سکے گی اور اگر تعداد بہت کم ہو تو حلقات بہت زیادہ ہو جائیں گے یوں معاملہ پیچیدہ اور پریشان کن بن جائے گا۔ لہذا افکار کو مرتکز کرنے کے کام کے ساتھ بلا کم و کاست مناسب تعداد رکھنا ضروری ہے۔ تعداد کی یہ تعیین عقلی ہوگی۔ اس طرح حلقہ کی مدت بھی اتنا وقت ہو کہ دارِ سین خوب بیداری کے ساتھ افکار کو سمجھیں کیونکہ یہ وقت اگر بہت زیادہ ہو گا تو افکار کا احاطہ کرنا مشکل ہو گا، کم ہو گا تو افکار مکمل صورت میں بیان نہیں ہو سکیں گے۔ پھر حلقہ روزانہ ہونا چاہیے یا ہفتہ وار یا پندرہ روزہ؟ یہ دورانیہ بھی اس طرح ہو جس کا عملی دعوت کے اوپر کوئی برا اثر نہ پڑے، ورنہ شباب

عملی پہلو کی بجائے علمی پہلو ہی میں مشغول رہیں گے۔ اسی طرح تمام احکام شرعیہ کے لیے اسالیب کی مناسب تنبی ہونی چاہیے، تاکہ منظم انداز سے اس حکم کو ادا کیا جاسکے جس کی ادائیگی مقصود ہے۔ اسالیب کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وسائل کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ امیر کے لیے جائز ہے کہ وہ عمل کی تفہیم کے تقاضوں کے مطابق اسالیب اور وسائل میں رد و بدل کرے۔

چونکہ جماعت کا کام روئے زمین کے ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے، پھر ملکوں کے درمیان فاصلے ہیں، لہذا اس بھاری ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے جماعت یا حزب کے پاس ایسی انتظامی مشینری ہونی چاہیے جس کے واسطے سے حزب دعوت اور اس کے اہداف کے حصول کے لیے آسانی سے کام جاری رکھ سکے۔ دعوتی تحریک کو منظم کر سکے اور اس کو منضبط کر سکے۔ شباب کو کام پر لگائے رکھنے کو جاری رکھ سکے اور اپنی فکر کے حق میں عمومی فضا تیار کرے اور فکری کشمکش اور سیاسی جدوجہد میں کود جائے، اُمت کی نگرانی اس طرح جھانکتے ہوئے کرے، جیسے ایک جسم جو خاص اس مقصد اور فرض کے حصول کے لئے کھڑا ہوا ہو۔ اس کے لیے ایسے انتظامی ڈھانچے کی ضرورت ہے جو بہتر طریقے سے اس کام کو کر سکے اور اس کی نگرانی کر سکے۔

پس اس کے لیے انتظامی مشینری یا تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت ہے، جو دعوتی کاموں کی نگرانی انتہائی کامیابی سے کرے جو مطلوب کو حاصل کرنے کا سبب ہو۔

پھر اس تنبی کے بعد تنظیمی و ادارتی قانون ہے، جس میں حزب کا پورا جسم اور اس کی حرکت سما جاتی ہے۔ یہی قانون امیر کے اختیارات کی تعیین کرتی ہے، وہ کس طرح حزب کو چلائے، اس کا چناؤ کیسے کیا جاتا ہے؟ علاقوں اور ولایات کے ذمہ داروں کی تقرری کون کرے گا۔ ان کے اختیارات کی حدود کیا

ہوں گی؟ یہی قانون ہے جو حزب کے تمام کاموں کی تنظیم کرتا ہے اور سب کے اختیارات کی حدود متعین کرتا ہے۔

یہ سب اسلوب اور وسائل کے حکم میں ہیں جو کہ عمل سے متعلق احکام شرعیہ کی تنفیذ کے لیے لازم ہیں۔ تبنی شدہ انتظامی اسالیب کا التزام اس وقت تک واجب ہوتا ہے جب تک امیر ان کو لازمی سمجھے، کیونکہ امیر کی اطاعت فرض ہے۔

جو چیز تبنی شدہ ہے اُس کا التزام واجب ہے۔ پھر اس کی مخالفت کی صورت میں حزب کیا کرے گی؟ کیا تنبیہ کر کے یا جھڑک کے ذریعے مخالفت کا علاج کیا جائے گا یا انتظامی سزا دی جائے گی؟

جماعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ تبنی شدہ احکامات کی خلاف ورزی کرنے والوں یا شرعی حدود سے نکلنے والوں کے لیے سزائیں بھی تبنی کرے۔ ان سزاؤں کا جواز (امیر کی مخالفت) کے تحت ہوگا۔ چونکہ حکم شرعی نے امیر کی موجودگی کو واجب قرار دیا ہے، اس طرح اس کی اطاعت کو واجب اور اس کی مخالفت کو حرام قرار دیا ہے۔ ورنہ جماعت کے لیے امیر کی موجودگی کا کیا معنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((من أطاعني فقد أطاع الله، ومن يعصني فقد عصى الله، ومن يطع الأمير فقد أطاعني ومن يعص الأمير فقد عصاني)) (مسلم) ”جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جو میری نافرمانی کرے، وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، جو امیر کی اطاعت کرتا ہے وہ میری اطاعت کرتا ہے اور جو امیر کی نافرمانی کرتا ہے وہ میری نافرمانی کرتا ہے۔“

انتظامی سزائیں سب کے لیے ہونی چاہئیں، یعنی امیر سے لے کر جماعت کے ایک ادنیٰ رکن تک کے لیے۔ یہ سزائیں ہر تبنی شدہ امر کی مخالفت پر ہونی چاہئیں۔ جو تبنی شدہ احکام شرعیہ کی



مخالفت کرے یا اسالیب کی یا انتظامی ڈھانچے یا انتظامی قانون اور یا اپنے اختیارات سے تجاوز کرے اس کا محاسبہ کرنا واجب ہے۔ اس طرح فکری دائرہ کے ساتھ تنظیمی دائرہ بھی ہو، جو عمل کے افکار اور طریقے کے احکام کی دقیق ترجمانی کی نگرانی کرے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے کئی اسلامی اور غیر اسلامی تنظیموں کے زوال کو دیکھا جس کی وجہ تنظیمی پہلو کے بارے میں عدم آگاہی تھی۔

یہ طبعی بات ہے کہ جماعت اس قسم کی تنبی نہیں کرے گی تو اس میں اختلافات پیدا ہونگے، وہ اندھیرے میں رہیں گے اور خالی دائرے میں چکر کاٹی رہ جائے گی، تجاوزات ہوتے رہیں گے اور کوئی احتساب نہیں کر سکے گا، یوں یہ وہ جماعت ہی نہیں رہے گی جو شرعی ضرورت کے حصول کی خاطر وجود میں آئی تھی۔

یہ بھی طبعی بات ہے کہ اراکین اور مسئولین کا انتخاب منظم شرعی شروط کی بنیاد پر نہیں ہوگا، قربت، معاشرتی مرتبے، منصب یا علمی مرتبے کے لحاظ سے ہوگا، تو اس سے ذمہ داریوں کی صحیح طور پر ادائیگی نہیں ہوگی اور جماعت کے افراد مناصب کے خواہش مند ہوں گے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک ایسے تنظیمی قوانین نہیں ہونگے جن کے سامنے سب سرنگوں ہوں، تب تک محاسبہ نہیں ہوگا اور انصاف نہیں ہو سکے گا۔

یہ بھی طبعی بات ہے کہ جب تک انتظامی سزائیں نہیں ہونگی جن کے ذریعے چھوٹی بڑی ہر مخالفت کو روکا جائے، تو کام میں نافرمانی اور غلطیاں بڑھتی جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ تنظیمی پہلو اور حزب کو ایک متحرک اور فعال جسم بنانے پر توجہ مرکوز ہونی چاہیے، جو اپنے افکار اور اپنے شباب دونوں کے لحاظ سے منظم ہو اور جس کی وجہ سے کام آسان ہو۔

جماعت یا حزب کی ترکیب مکمل طور پر اس طرح ہونا ضروری ہے کہ اس مقصد و غایت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جس کے لیے جماعت بنائی گئی ہے۔

کوئی یہ گمان نہ کرے کہ تنظیمی پہلو ثانوی چیز ہے، بلکہ یہ انتہائی اہم چیز ہے۔ جب تک اس پہلو کو مد نظر نہیں رکھا جائے گا اور اس کے لیے ضروری احکامات کی تبنی نہیں کی جائے گی اور لازمی نہیں قرار دیا جاتا، تو ماقبل میں ذکر شدہ امور کی جو توفیق اس کو ملی تھی اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گی اور سارا کچھ ضائع ہو جائے گا۔

پھر حزبی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے حزب یا جماعت پر بعض مادی ذمہ داریاں بھی فرض ہو جاتی ہیں، کچھ شباب کا بالکل فارغ ہو جانا جماعت کے لیے ضروری ہے، نقل و حمل کے اخراجات، چھپائی کے اخراجات اور اس کے علاوہ دیگر اخراجات جو اسلامی دعوت کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ان مالی ضروریات کو بھی خود حزب یعنی اس کے شباب کو برداشت کرنا چاہیے، جو اپنی جان کو دعوت کے لیے پیش کرتا ہے تو اس کے لیے اس سے معمولی چیز (مال) پیش کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔

جماعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ جماعت کے باہر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے، چاہے یہ باہر والا فرد ہو، جماعت ہو یا حکومت ہو، جماعت کو اسی راستے سے نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں اور دعوت کے دشمن جماعت کی مالی محتاجی سے فائدہ اٹھانے کا سوچیں گے، پھر وہ شروع میں جماعت کو بے لوث مالی معاونت کی پیشکش کرتے ہیں پھر تعاون کی شکل بدل کر ذاتی اغراض و مقاصد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

# کیا اسلام کی طرف دعوت دینے والی جماعتوں کا ایک سے

## زائد ہونا جائز ہے؟

اس کتاب کے موضوعات میں ہم نے کوشش کی ہے کہ ہم کسی بھی تحریک یا حزب یا جماعت کے پروگرام کے حوالے سے ایک کامل اور مکمل تصور دیں۔ ہم تفصیلات میں نہیں گئے صرف ان بنیادی باتوں کا ذکر کیا جن کی رعایت ضروری ہے، جماعت کی تفصیلات کو اس کے مجتہدین پر چھوڑا جاتا ہے۔ اس میدانِ عمل میں بہت ساری کوششیں کی جا رہی ہیں جن کی اساس ہی صحیح نہیں، بہت ساری ایسی جماعتیں ہیں جن کے بارے میں یہ کہنا ہی درست نہیں کہ وہ جماعت کے حوالے سے شرعاً مطلوب شرائط کو پورا کرتی ہیں۔ صرف اتنا ہے کہ ان کو مسلمانوں کی انجمنیں کہہ سکتے ہیں جو ایسے جزوی کام کے لئے مصروف عمل ہیں جو کہ جزوی مسائل تک کو حل نہیں کر سکتے اور یہ مکمل شرعی طریقے سے غافل ہیں۔ یہ اسلام کو اس طرح اختیار ہی نہیں کرتیں، کہ اسلام کو مکمل طور پر اُمتِ مسلمہ کی زندگیوں تک پہنچائیں۔ یہ جماعتیں بہت زیادہ ہو گئیں ہیں حتیٰ کہ ایک ایک ملک میں سینکڑوں تک پہنچ گئیں ہیں، یہ دکانیں اور کھیتیاں بن چکی ہیں جہاں کوششیں جھوٹی جاتی رہتی ہیں اور مسلمانوں کی درست توجہ اور کام کی صلاحیتوں کو ضائع کیا جاتا ہے۔ ان بہت ساری جماعتوں (انجمنوں) کی موجودگی کے ساتھ بہت ہی کم بڑی جماعتیں رہتی ہیں جو اسلامی اہداف اور ان کے حصول کے کام میں دور بین کہلائی جاسکتی ہیں۔ اگر ہم ان دکانوں اور کھیتوں کا ذکر ہی نہ کریں، بلکہ ہم ان بڑی جماعتوں کا ہی ذکر کریں جو دور رس ہیں اور مکمل کام کر رہی ہیں، تو کیا شرعاً مطلوب یہ ہے کہ: ایک ہی ایسی جماعت ہونی چاہیے جو مطلوبہ تمام کام

کرے اور ہدف کو حاصل کرے؟ یا شرعی اصول کے اندر تبدیلی کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کا متعدد ہونا جائز ہے؟ کام جزوی ہونا چاہئے یا مکمل اور متوازن؟ یہ کوششیں علاقائی ہونی چاہئیں یا عالمی؟ اس سب کے بارے میں صحیح نقطہ نظر کیا ہے؟

اسلامی اعمال کا ایک یا متعدد ہونا ایسا موضوع ہے جس کے اختیار یا رد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، کچھ لوگ تبدیلی لانے کے لئے وحدتِ عمل کو واجب سمجھتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ اس کے متعدد ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ جب ہم فروعات کو اصول کی طرف لوٹائیں گے، تب ہم اعذار اور شرعی دلائل میں تمیز کر پائیں گے۔ یوں ہمیں کھرا اور کھوٹا معلوم ہو جائے گا۔

اگر ہم اسلامی کام کی وحدت والی رائے پر نظر دوڑائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کے نزدیک وجوب مندرجہ ذیل دو عنوانات کے تحت ہے:

پہلا: اسلامی کام کی وحدت ایک شرعی فریضہ ہے۔

دوسرا: اسلامی کام کی وحدت تحریکی ضرورت ہے۔

1۔ اس کے ایک شرعی فریضہ ہونے کے دلائل درج ذیل ہیں:

(الف) مسلمانوں اور امت مسلمہ کی وحدت ہی اصل چیز ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ﴾ (الانبیاء

: 92) ”بے شک تمہاری یہ امت ایک امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں پس میری عبادت

کرو۔“ فرمایا: ﴿وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ﴾ (المؤمنون:

52) ”اور بے شک تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں مجھ سے ڈرو۔“ ((مثل

المؤمنين في توادهم و تراحمهم و تعاطفهم مثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر و الحمى))۔ ﴿ (البخارى و مسلم و احمد ) ” آپس میں محبت، رحمت اور مہربانی میں مومنوں کی مثال ایک جسم کی ہے، جب اس کے ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بخار اور بے چینی کا شکار ہوتا ہے۔“

(ب) اصلاً وحدت کی ترغیب دی گئی ہے اور اختلاف سے منع کیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (ال عمران: 105) ”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آچکے تھے، اس کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اختلاف میں پڑ گئے۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا ہوگی۔“

مزید فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (الانعام: 159) ”یقین جانو کہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے حوالے ہے۔ پھر انہیں جتلائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔“

(ج) ایک جماعت کا التزام اصل ہے، کئی جماعتوں کا نہیں:

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((ستكون هنات و هنات. فمن أراد أن يفرق أمر هذه الأمة وهي جميع فضر به بالسيف كائناً من كان)) (مسلم) ”عنقریب فتنے ظاہر ہونگے، پس جو شخص اس امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے، حالانکہ امت ایک ہے تو اس کو تلوار سے مارو خواہ کوئی بھی ہو۔“ (شرح الامام النوویؒ 1882)

دوسری حدیث ہے کہ: ((دعانا النبی فبايعناه. فقال فيما أخذ علينا أن بايعناه على السمع و الطاعة في منشطنا و مكرهنا، و عسرنا و يسرنا، و أثرة علينا، وأن لا ننازع الأمر أهله قال إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان)) (مسلم) ”نبی ﷺ نے ہمیں بلایا تو ہم نے آپ ﷺ کو بیعت دی۔ آپ ﷺ نے ہم سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم اپنی پسند اور ناپسند، اپنی تنگی اور خوشحالی اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دے جانے کی صورت میں بھی سنیں اور اطاعت کریں، اولو الامر سے تنازع نہ کریں فرمایا: مگر یہ کہ تم واضح کفر دیکھو، جس کی تمہارے پاس اللہ کی طرف سے دلیل ہو۔“

رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بھی ہے کہ: ((الجماعة رحمة و الفرقة عذاب)) (الامام احمد) ”جماعت رحمت ہے اور فرقہ بازی عذاب ہے۔“

رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان بھی ہے کہ: ((يُذُ الله مع الجماعة)) (الترمذی والنسائی) ”اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہے۔“

2۔ جہاں تک اس کی تحریری اور شرعی ضرورت کی بات ہے اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں:

(الف) بے شک اسلام کے ذریعے تبدیلی ایک پُر مشقت کام ہے، جاہلیت کی قوت کو ختم کرنا آسان نہیں، معاشرے کے اوپر فکر، رجحان اور نظام کی حیثیت سے اسلام کی سر بلندی اور سر پرستی کے لیے ادغام اور پیوستگی کی وحدت ضروری ہے جس کے دائرے میں رہ کر قوت مجتمع ہو کر عمل کیا جائے۔ صرف کو آرڈینیشن یا یکجہتی کے انداز میں کام کرنے سے یہ مقصد حاصل نہ ہو گا۔

(ب) اسلام اور اسلامی تحریک کے خلاف عالمی گٹھ جوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی کام اور جماعت کی وحدت ضروری ہے۔ جب اسلام کے ازلی دشمن عالمی طاقتیں اسلام کے خلاف سازش کرتے ہوئے آپس میں تعاون اور اتحاد قائم کرتے ہیں اور وہ ایک محاذ پر ہوتے ہیں، تو کیوں نہ عالم اسلام کی اسلامی طاقتیں وحدت کی دعوت دے دیں تاکہ یہ ترنوالہ نہ بن جائیں اور ان کا خاتمہ اور کچل دینا آسان نہ ہو؟

اگر اسلامی عمل کی وحدت اپنی بنیاد میں ایک شرعی فریضہ نہ بھی ہوتی، تب بھی اسلام اور مسلمانوں کو عبرت ناک انجام سے بچانے اور اسلامی مشن کو معطل ہونے اور بکھرنے سے محفوظ کرنے کے لئے یہ ایک شرعی فریضہ بن جاتا ہے۔

(ج) آج اسلام دشمن علاقائی قوتیں اور پارٹیاں اسلام کے خلاف متحدہ محاذ بنا رہی ہیں۔ یہ محاذ مسلسل مطالعہ کرتے رہتے ہیں، گھات لگائے بیٹھے ہیں تیاری کرتے ہیں، منصوبے بناتے ہیں اور ہر سطح پر بھرپور کوشش کرتے ہیں، کیا پھر اسلامی قوتوں کو اس صورتحال کا ادراک نہیں کرنا چاہیے، تو کیا ان کا منتشر اور بٹے ہوئے رہنا اچھا ہوگا؟ یا یہ اس لائق ہیں کہ اپنی وحدت کے راستے میں رکاوٹ بننے والے ہر قسم کے اعتبارات اور اسباب سے بالاتر ہو کر وحدت اختیار کریں۔

یہ اور اس قسم کی دوسری کئی وجوہات کی بنا پر اس میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ ایک واحد عالمی تحریک کے قیام کی ضرورت ہے۔ فکری، تنظیمی منصوبہ بندی اور تیاری ہر لحاظ سے اعلیٰ سطح کی ہو۔ یہ ہیں وہ دلائل اور وجوہات جن کی بناء پر کچھ لوگ اسلامی عمل کی وحدت کو فرض اور اس کے متعدد ہونے کو حرام سمجھتے ہیں۔ ہم صورت حال پر ان دلائل کو منطبق کرنے کے لیے اجتہاد کا اسلامی طریقہ اختیار کریں۔ ہم پہلے بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ مسلمانوں کی صورتحال یہ ہے کہ وہ دارالکفر میں زندگی گزار رہے

ہیں۔ اب اس دارالکفر کو دارالاسلام میں بدلنا فرض ہے۔ ہم یہ بھی کہہ چکے ہیں کہ اس کام کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے جو اس مقصد کو حاصل کر سکے۔ اس کام کے لیے رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلنا فرض ہے۔

اس رائے کے اختیار کرنے والوں نے جن شرعی دلائل پر اعتماد کیا ہے ان کی طرف آنے سے قبل، جو چیز ضروری ہے، وہ اس کام کو کرنے والی جماعت کی حقیقت کی وضاحت ہے۔ کیا یہ مسلمانوں کی جماعت ہے یا مسلمانوں کی جماعت میں سے ہے، یا دوسرے الفاظ میں، یہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہے؟

اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض فرض کئے ہیں جن کی ادائیگی کے لیے کام کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ ان فرائض میں سے کچھ انفرادی ہیں، یعنی مسلمان ان کو انفرادی طور پر ادا کرے گا اور جب تک ان کو ادا نہیں کرے گا وہ ساقط نہیں ہوگے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن کی ادائیگی کے لیے جماعت کی ضرورت ہے، اس قسم کے فرائض میں سے ایک فرض اسلامی ریاست کے قیام کے لیے کام کرنا ہے۔ پس اللہ کی شریعت کا نفاذ فرض ہے ایک فرد انفرادی طور پر اس کی استطاعت نہیں رکھتا، بلکہ اس کے لیے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایک ہونا اور بہت سارے ارادوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔

یہ اس اصول کے تحت ہے کہ: **(ما لا یتم الواجب إلا به فهو واجب)** ”جس عمل کے بغیر فرض ادا نہیں ہوتا وہ عمل بھی فرض ہے۔“ یہ فرض ان کفایہ فرائض میں سے ہے جن کی ادائیگی فرض ہے۔ ان کی عدم ادائیگی سے ادائیگی کے لیے کوشش نہ کرنے والے سخت گنہگار ہونگے۔ لیکن اس کی ادائیگی کے لیے تمام مسلمانوں کی ضرورت نہیں بلکہ اتنے لوگ کافی ہیں جو اس کام



کو کر سکیں۔ یعنی مسلمانوں میں سے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ اس جماعت کی طرف سے اس فرض کی ادائیگی کے لیے کام کرنے سے جماعت کے افراد سے تو گناہ ساقط ہوگا، لیکن ان لوگوں سے گناہ ساقط نہیں ہوگا جو کام نہیں کر رہے ہیں۔ مسلمانوں میں سے یہ جماعت ہی مسلمانوں کی جماعت نہیں کیونکہ بہت سارے مسلمان افراد ہیں جو اس کے ساتھ کام نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے کسی اور کے ساتھ کام کرتے ہیں جس کا ذکر ہم جماعتوں کے متعدد ہونے کے جواز کے بارے میں گفتگو میں کریں گے، یا کچھ مسلمان کسی بھی جماعت کے ساتھ کام نہیں کرتے۔ یہ جماعت خلیفہ نہیں، نہ ہی اس کا قائم مقام ہے۔ خلیفہ سے متعلق متعدد احکام اس کے لیے نہیں، اس کو یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ ان اعمال کو خود انجام دینے کی کوشش کرے جن کو انجام دینا خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ بلکہ یہ صرف مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہے، جبکہ پوری امت مسلمہ مسلمانوں کی جماعت ہے۔ جماعت یا جماعتیں، افراد اور خلیفہ سب اس میں شامل ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت امت مسلمہ ہے جن کو احکام شرعی نے نہیں بلکہ اسلامی عقیدے نے جمع کیا اور بھائی بنایا۔ اس لیے مسلمان فروع میں اختلاف کرتے ہیں لیکن اس اختلاف کی وجہ سے اپنے بھائیوں پر عیب نہیں لگاتے۔ اگر احکامات بھائی بندی کا معیار ہوتے تو کوئی مسلمان کسی مسلمان کا بھائی نہ ہوتا۔ کسی بھی فرد یا جماعت کا مسلمانوں کے عقیدے سے خروج امت مسلمہ سے خروج ہے اور اس کی وجہ سے یہ جہنم میں جائیں گے، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا مقصد بھی یہ ہے کہ: ((التارك لدينه المفارق للجماعة)) (البخاری و مسلم) ”اپنے دین کو چھوڑنے والا جماعت سے جدا ہے۔“ یعنی مسلمانوں کی جماعت سے جدا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اس دوسری حدیث کا بھی یہی مقصد ہے کہ: ((... و تفرق أمتي على ثلاث و سبعين فرقة كلها في النار إلا واحدة قالوا: ومن هي يا رسول الله؟ ما أنا عليه و أصحابي))۔

(ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن حنبل) ”اور میری امت ستر فرقوں میں بٹ جائے گی ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے عرض کیا گیا وہ ایک کونسا ہوگا؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔“

مسلمانوں کی جماعت یا امت مسلمہ دوسرے لوگوں سے الگ امت ہیں۔ مسلمانوں کا خون اور ان کا مال برابر ہے، ان میں قریب والا دور کو پناہ دے گا، دوسروں کے خلاف یہ ایک ہیں، اگرچہ ان کے افہام متعدد اور اجتہاد مختلف ہو۔

اس وجہ سے ”مسلمانوں کی جماعت“ اور ”مسلمانوں میں سے ایک جماعت“ میں واضح فرق ہے۔ یہ بہت بڑی غلطی ہوگی کہ ہم ”مسلمانوں کی جماعت“ سے متعلقہ دلائل کو ”مسلمانوں کی ایک جماعت“ پر منطبق کرنے کی کوشش کریں۔

لہذا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ﴾ (الانبیاء : 92) ”بے شک تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں تو میری ہی عبادت کرو“ اور یہ ارشاد: ﴿وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ﴾ (المؤمنون: 52) ”اور بے شک تمہاری یہ امت ایک ہی امت ہے میں ہی تمہارا رب ہوں اس لیے مجھ سے ڈرو“۔ اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد: ((مِثْلُ الْمُؤْمِنِينَ فِي تَوَادِهِمْ وَتَرَاحِمِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ مِثْلُ الْجَسَدِ، إِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عَضْوٌ تَدَاعَى لَهُ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهْرِ وَالْحُمَى)) (البخاری و مسلم و احمد) ”آپس میں اُلفت و محبت، رحمت اور مہربانی میں مومنوں کی مثال ایک جسم کی ہے، جب اس کے کسی ایک عضو میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم بخار اور بے چینی کا شکار ہوتا ہے۔“

اس سے مراد پوری امت مسلمہ ہے نہ کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت۔ اگر کوئی بھی جماعت یہ سمجھنے لگے کہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہے تو یہ فاش غلطی اور عجیب و غریب بات ہوگی جس کے بہت خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو اس جماعت میں نہیں وہ اخوت میں شریک نہیں، گویا کہ وہ دین کو چھوڑنے والے اور مسلمانوں کی جماعت سے جدا ہیں اور جہنم میں جائیں گے۔

رہی بات ان کے بقول متعدد جماعتوں کے ممنوع ہونے کی، جس کے یہ دلائل ہیں کہ:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (ال عمران: 105) ”اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جن کے پاس کھلے کھلے دلائل آچکے تھے، اس کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال لی اور اختلاف میں پڑ گئے۔ ایسے لوگوں کو سخت سزا ہوگی۔“

یہ دلائل اس صورت حال پر منطبق ہی نہیں ہوتے، جہاں اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان دو آیتوں کا جماعتوں کے متعدد ہونے کے موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کے موضوع کا تعلق عقائد سے ہے، احکام شرعیہ سے نہیں تو اس کی تفسیر اس طرح ہے: ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جو دین سے الگ ہوئے اور اس میں اختلاف کیا، جبکہ ان کے پاس واضح دلائل آئے تھے، یعنی واضح عقائد اور قطعی دلائل۔ تو اس سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، (وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ) ”ان کے واسطے بڑا عذاب ہے۔“ عظیم مفسر قرآن امام بیضاویؒ نے اس کی تفسیر میں یہی کہا ہے، وہ فرماتے ہیں: (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا) ”جیسے کہ یہود و نصاریٰ نے توحید اور تقدیس اور آخرت کے احوال کے بارے میں معروف و مشہور عقائد سے اختلاف کیا (من بعد ما

جاءهم البينات )“ یعنی نشانیاں اور وہ دلائل جو حق کو واضح کرتی تھیں اور جو اتفاق کو واجب قرار دیتی تھیں۔ سب سے زیادہ واضح یہ ہے کہ اس آیت میں جو نہی آئی ہے، یہ اصولِ دین میں تفرقہ اور اختلاف کے ساتھ مخصوص ہے نہ کہ فروغ میں۔ اس کی دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: (( من اجتهد فأصاب فله أجران ومن أخطأ فله أجر واحد )) ”جو اجتہاد کرے اور وہ درست نتیجہ پر پہنچے تو اس کو دو اجر ملیں گے اور جس سے اجتہادی غلطی ہو جائے تو اس کا ایک اجر ہو گا۔“ ( وأولئك لهم عذاب عظيم ) ”یہ ان لوگوں کے لئے وعید ہے جنہوں نے اختلاف کیا اور یہ ان لوگوں کے لئے بھی ڈر اوا ہے جو ان کی مشابہت اختیار کریں۔“ اس کو بیضاویؒ کی تفسیر سے نقل کیا گیا۔

جو جماعت صورتحال کو تبدیل کرنے کے لیے کام کر رہی ہو، وہ احکام شرعیہ کی وجہ سے دوسروں سے منفرد ہے۔ یہ مسلمانوں کی ایک جماعت ہے جس کا عقیدہ اسلامی ہے۔ دوسروں سے اس کا اختلاف یا دوسروں کا اس سے اختلاف عقیدے میں نہیں، بلکہ احکام میں ہے۔ لہذا یہ آیت ان لوگوں کو دین سے خارج قرار دیتی ہے، جو عقیدے میں مسلمانوں سے اختلاف کریں۔ یہ احکام میں اختلاف کرنے والوں کے بارے میں نہیں۔ اجتہاد کے متعدد ہونے کے موضوع سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ آیت عام ہے اور اعتبار لفظ کی عمومیت کا ہوتا ہے، سبب کے مخصوص ہونے کا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں جو عمومیت ہے وہ صرف اس موضوع میں ہے جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ یہ عام ہے لیکن صرف عقائد میں مخالفت تک، کسی اور چیز میں نہیں، یہ ایک لحاظ سے ہے۔ دوسرے لحاظ سے یہ سمجھنا ان احادیث کی مخالفت ہے، جن میں اجتہاد میں

اختلاف کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ تیسرے لحاظ سے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ان سے اختلاف دین سے ہے۔

جہاں تک دوسری آیت کا تعلق ہے: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسَتْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (الانعام: 159) ”یقین جانو کہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کیا ہے اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے حوالے ہے۔ پھر انہیں جتلائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔“ ابن کثیرؒ نے کہا: مجاہد، قتادہ، ضحاک اور سدی کہتے ہیں: یہ آیت یہود و نصاریٰ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: (ہم أصحاب البدع) یعنی ”یہ بدعتی لوگ ہیں“ اور (وَكَانُوا شِيَعًا) ”یعنی یہ فرقے تھے“، جیسے اہل ملل اور نحل اور نفس پرست اور گمراہ لوگ، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو ان سے بری قرار دیا۔ حمزہ اور کسائی کی قرات کے مطابق علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ: ﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ﴾ یعنی وہ لوگ جن کو دین کا حکم دیا گیا تھا لیکن انہوں نے چھوڑ دیا اور یہ یہود و نصاریٰ ہیں۔ ﴿لَّسَتْ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ ”آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں“۔ امام بیضاویؒ نے کہا: ”یعنی انہوں نے دین کو منتشر کر کے رکھ دیا اور بعض پر ایمان لائے اور بعض کا انکار کیا، فرقے بن گئے۔“

جی ہاں عقائد میں اختلاف فروع میں اختلاف سے مختلف ہے۔ مذکورہ دلائل پہلی چیز کے بارے میں ہیں جن میں منع کیا گیا ہے کہ ہم یہود و نصاریٰ کی طرح ہو جائیں جنہوں نے اپنے انبیاء سے اختلاف کیا اور اپنے دین کو چھوڑ کر بدعتوں اور گمراہیوں کی طرف گئے، یوں ان کے فرقے بن گئے۔ اس آیت کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس قول میں ہے: ﴿وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ

وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ﴿ (البقرہ: 253) ”لیکن انہوں نے اختلاف کیا، پس ان میں سے بعض ایمان لائے اور بعض نے کفر کیا۔“

یہاں موضوع ہی ایمان اور کفر ہے۔ رہی بات دوسری قسم کے اختلاف کی، تو نص کے ضمن میں فہم کے اختلاف اور اس کے جواز کے بارے میں تو بہت سارے دلائل ہیں۔ علمائے اسلام کے ہاں یہ معلوم بالضرورة ہے۔ یہ سادگی ہوگی کہ عقائد میں اختلاف کے عدم جواز کے دلائل کو جماعتوں کے ایک سے زائد نہ ہونے کے لیے دلیل بنائی جائے، بشرطیکہ یہ جماعتیں احکام شرعیہ کی بنیاد پر قائم ہوں۔ یہ دلائل کہ: ((ستكون هنات و هنات. فمن أراد أن يفرق أمر هذه الأمة وهي جميع فضريوه بالسيف كائناً من كان)) (مسلم) ”عنقریب فتنے ظاہر ہونگے، پس جو شخص اس امت میں تفرقہ پیدا کرنے کی کوشش کرے، حالانکہ امت ایک ہے، تو اس کو تلوار سے مار دخواہ کوئی بھی ہو (اگر قتل کئے بغیر وہ اپنی بات پہ اڑا رہے)۔“ (شرح امام النوویؒ 1882)

اور یہ کہ: ((من فرق ليس منا)) ”جو تفرقہ بازی کرے وہ ہم میں سے نہیں“

اور یہ کہ: ((دعانا النبي فبايعناه. فقال فيما أخذ علينا أن بايعناه على السمع و الطاعة في منشطنا و مكرهنا، و عسرنا و يسرنا، و أثره علينا، وأن لا ننازع الأمر أهله قال إلا أن تروا كفراً بواحاً عندكم من الله فيه برهان)) (مسلم) ”نبی ﷺ نے ہمیں بلایا تو ہم نے آپ کی بیعت کی۔ آپ نے ہم سے جو بیعت لی وہ یہ کہ ہم اپنی اپنی پسند اور ناپسند، اپنی تنگی اور خوشحالی اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دینے کی صورت میں بھی سنیں اور اطاعت کریں، اولوالامر سے تنازع نہ کریں فرمایا: مگر یہ کہ تم کھلم کھلا کفر دیکھو جس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے قطعی دلیل ہو۔“

ان تمام دلائل کا تعلق خلیفہ، اس کی بیعت پر اطاعت اور سوائے ایک حالت کے کہ جب وہ واضح کفر کرے، اُس کے خلاف خروج نہ کرنے کے حوالے سے ہیں۔

تو جب کوئی ایسا شخص آتا ہے جو خلیفہ سے جھگڑتا ہے اور اس امت کو منتشر کرنا چاہتا ہے تو اس کو تلوار سے مارا جائے گا، خواہ کوئی بھی ہو، ان دلائل کا مسلمانوں کی کسی جماعت سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں، کیونکہ یہ خلیفہ سے متعلق احکام ہیں جماعت اس کا قائم مقام نہیں، بلکہ جماعت کا کام خلیفہ کو مقرر کرنا اور اس کا احتساب کرنا ہے۔ یہ حدیث کہ: ((يَدُ اللَّهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ)) (الترمذی والنسائی) ”اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہے۔“

یا یہ حدیث کہ: ((الجماعة رحمة و الفرقة عذاب)) (الامام احمد) ”جماعت رحمت ہے اور تفرقہ بازی عذاب ہے۔“

ان دو حدیثوں کا بھی جماعتوں کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں، مسلمانوں کو مسلمانوں کی جماعت یا مسلمانوں میں سے ایک جماعت کے ساتھ رہنے میں اللہ کی رحمت کا احساس ہوتا ہے۔ جماعت سے دوری اور فرقہ واریت سے مسلمان شیطان کے قریب ہوتا ہے اور اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان صادق آتا ہے کہ: (( فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذُّبَابُ الْقَاصِيَةَ )) ”بھیڑیا ریوڑ سے الگ ہونے والے کو کھاتا ہے۔“

یہی عذاب ہے، ان دونوں حدیثوں کے لفظی معنی اور مفہوم میں کہیں بھی اس بات کی دلیل نہیں کہ شریعت کے قیام کے لیے اسلامی عمل کی وحدت واجب ہے۔

یہ تو جماعتوں کے تعدد کے عدم جواز کے بارے میں شرعی دلائل تھے، حالانکہ یہ سب اس پر منطبق نہیں ہوتے، جیسا کہ واضح کیا گیا۔

جو عقلی وجوہات بیان کی گئی ہیں اور تعدد کے جو منفی اثرات ذکر کئے گئے ہیں، ان سے کوئی چیز ممنوع، حرام یا واجب نہیں ہو سکتی بلکہ ممنوع یا واجب صرف شرع کرتی ہے، صورتحال اگر خراب ہے تو اس کو اچھی طرح سمجھنا چاہیے، اس کی حقیقت کا ادراک ہونا چاہیے، تو اس کے علاج کے لیے شرع کی طرف رجوع کرنا چاہیے، تاکہ اس کے حرام یا واجب ہونے کے دلائل سامنے آئیں۔ اس بنیاد پر ہم صورتحال سے کوئی حکم شرعی نہیں لے سکتے۔

### متعدد اسلامی تحریکوں کا جواز:

اب جبکہ ہم اس کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اسلامی عمل کی وحدت کے جو دلائل بیان کئے گئے ہیں، یہ اس درجہ کے نہیں کہ ان کو دلیل سمجھا جائے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اب دوسری رائے یعنی اسلامی عمل کا ایک سے زائد ہونے کا جواز ہی شرعی ہوا، اس بنا پر کہ کسی چیز کی نفی اس کی ضد کا اثبات ہے، تو یہ غلط ہے۔ اس کے لیے ایسے دلائل کی ضرورت ہے جن کے اندر صحیح استدلال اور دقیق استنباط کا عنصر واضح ہو۔ اب یہ دلائل کیا ہیں؟

یقیناً اصول کو چھوڑ کر فروع یعنی عقائد کو چھوڑ کر احکام میں اختلاف جائز ہونے کے دلائل بے شمار ہیں۔ سنت فروع میں اختلاف کے جواز پر دلالت کرتی ہے، صحابہؓ نے بھی اس بارے میں اختلاف کیا، اسی طرح تابعین اور علمائے سلف نے اس میں اختلاف کیا۔ جس اختلاف سے منع کیا گیا ہے یہ وہ



اختلاف ہے جو کفار نے آپس میں کیا، یہ اصولِ دین میں اختلاف تھا، فروع میں نہیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے انبیاء کے بارے میں اختلاف کیا، یہاں تک کہ یہ اس بنیاد پر فرقے اور گروہ بن گئے، اور اُس حق سے ہٹ گئے جس کو اللہ نے انبیاء پر نازل فرمایا اور انہوں نے اپنے پیروکاروں کو بھی اس حق سے روکا۔ ارشاد ہے: ﴿فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ﴾ {19:37} ”پھر ان میں سے گروہوں نے اختلاف کیا، چنانچہ پیشی کے عظیم دن ان کافروں کے لیے تباہی ہے۔“ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قسم کے اختلاف سے محتاط رہنے کا حکم دیا ہے۔

خندق کے دن صحابہؓ نے آپ ﷺ کے کلام کو مختلف انداز سے سمجھا آپ ﷺ نے اس کو درست قرار دیا: ((مَنْ كَانَ سَامِعًا مَطِيعًا فَلَا يَصْلِيَنَّ الْعَصْرَ إِلَّا بَنِي قَرِيظَةَ)) ”جو سننے اور اطاعت کرنے والے ہیں وہ نماز عصر بنو قریظہ کے علاوہ کسی اور جگہ نہ پڑھیں۔“ (سیرت ابن ہشام)

اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((إِذَا اجْتَهَدَ الْحَاكِمُ فَأَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا اجْتَهَدَ فَأَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ)) (البخاری) ”جب حکمران (خلیفہ) اجتہاد کرے اور وہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں اور جب وہ اجتہاد کرے لیکن غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک ہی اجر ہے۔“ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ:

1۔ بے شک مجتہد کبھی غلطی کرتا ہے اور کبھی درست اجتہاد کرتا ہے اس کے مجتہد ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غلطی نہیں کرے گا۔

2۔ یقیناً وہ حکم جو مجتہد نے مستنبط کیا ہے وہ حکم شرعی ہے اگرچہ غلط ہو۔

3- مجتہد کو اپنی غلطی کا علم نہ ہو، ورنہ اس کے لیے اپنے غلط اجتہاد پر قائم رہنا جائز نہیں، بلکہ اس کو غلطی معلوم ہونے کے بعد رجوع کرنا پڑے گا۔

4- مجتہد کو ہر صورت میں اللہ اجر دے گا، چاہے اس کا اجتہاد غلط ہو یا صحیح، لیکن ان دونوں صورتوں میں اجر مختلف ہو گا۔

اسی لئے آئمہ کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقہ کے ظنی مسائل میں اگر مجتہد احکام شرعیہ میں غلطی کر جاتا ہے تو یہ گناہ معاف ہے۔

امام قرطبیؒ اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ: ”صحابہ کرامؓ پیش آنے والے مسائل میں اختلاف کرتے رہتے تھے، مگر اس کے باوجود آپس میں الفت کرتے تھے۔“ بغدادیؒ نے اپنی کتاب ”الْفَقِيهُ وَالْمُتَفَقُّهُ“ میں نقل کیا ہے کہ عمر بن عبدالعزیزؒ فرمایا کرتے تھے کہ: ”اگر صحابہؓ اختلاف نہ کرتے تو مجھے خوشی نہ ہوتی کیونکہ اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو رخصت نہ ہوتی۔“

مسلمان علماء نے بڑی بڑی تالیفات کی ہیں، جن میں اختلاف کے ان اسباب کو بیان کیا گیا ہے کہ:

ان اسباب میں سے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت میں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اپنی سمجھ کے لحاظ سے دوسرے انسان سے مختلف ہے، صلاحیتیں مختلف ہیں اور افہام مختلف ہیں۔ اس وجہ سے صحابہؓ کے زمانے سے لے کر آج تک اجتہادات اور استنباطات مختلف ملتے ہیں اور یہ قیامت تک ہو گا، اور دوسرا یہ کہ شرع کا مزاج بھی مسلمانوں کے اختلاف کی گنجائش دیتا ہے اور یہ رحمت ہے۔

چنانچہ قرأت کے اختلاف کی وجہ سے افہام کا اختلاف ہونا بدیہی امر ہے، کیونکہ ہر مجتہد اپنی قرأت کے مطابق آیت کا مفہوم لیتا ہے۔ جیسا کہ وضو کی آیت میں اختلاف ہے، کہ پاؤں کو دھونا فرض ہے یا مسح کرنا۔

علماء اور فقہاء کا بعض احادیث کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض دفعہ ایک حدیث ایک عالم یا فقیہ کے نزدیک صحیح اور دوسرے کے نزدیک ضعیف ہوتی ہے، کیونکہ حدیث کو قبول کرنے یا اس کو رد کرنے کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر حدیثِ مرسل کو لیجئے: اُمت کے محدثین، اصولیین اور فقہانے مرسل کو دلیل بنانے کے بارے میں اختلاف کیا ہے، کچھ اس کو حجت سمجھتے ہیں اور اسے دلیل کے طور پر قبول کرتے ہیں، جبکہ بعض اس کو حجت نہیں سمجھتے اور اس کو حدیث منقطع کی طرح سمجھتے ہیں۔

دلائل کے تعارض کی وجہ سے بھی اختلاف پیدا ہوتا ہے، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ ایک نص حرام اور نجس چیز کو دوا کے طور پر استعمال کرنے سے منع کے بارے میں وارد ہو، جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ: ((إِنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ الدَّاءَ وَالدَّوَاءَ وَجَعَلَ لِكُلِّ دَاءٍ دَوَاءً، فَتَدَاوُوا، وَلَا تَتَدَاوُوا بِحَرَامٍ)) (ابوداؤد) ”بے شک اللہ تعالیٰ نے بیماری اور دوا نازل کی اور ہر بیماری کے لیے ایک دوا بنائی، پس تم دوا استعمال کرو، حرام چیز کو دوا مت بناؤ۔“

جبکہ دوسرا نص یا فعل ایسا روایت کیا جائے جو نجس یا حرام کو دوا بنانے کو مباح قرار دیتا ہے جیسا کہ اس حدیث میں ہے کہ: ((أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَخَّصَ لِعَبْدِ الْحَمَنِ بْنِ عَوْفٍ وَ الزَّيْرِ فِي لِبْسِ الْحَرِيرِ لِحِجَّةٍ كَانَتْ بِهِمَا)) (رواہ الجماعة) ”نبی ﷺ نے عبد الرحمن بن عوفؓ اور زبیرؓ کو ریشم پہننے کی اجازت دی کیونکہ ان دونوں کو خارش (کی تکلیف) تھی۔“

اس طرح یہ حدیث کہ: ((كَانَ الْمُسْلِمُونَ يَتَدَاوُونَ بِأَبْوَالِ الْإِبِلِ لَا يَرُونَ بِهَا بِأَسَاءً)) (البخاری) ”مسلمان اونٹ کے پیشاب کو دوا کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کو برا نہیں سمجھتے تھے۔“

کبھی کسی مسئلے کے بارے میں صریح نص نہیں ملتا، تو اس مسئلے میں اللہ کا حکم معلوم کرنے کا طریقہ اجتہاد ہے۔ اجتہاد ایک ظنی حکم ہے جس میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

اختلاف کے اسباب میں سے عربی زبان کی وسعت بھی ہے، کیونکہ اس میں الفاظ کے کئی مدلول ہو سکتے ہیں مثلاً اصل لغت میں ایک ہی لفظ کئی معانی کے لئے مشترک طور پر وضع کیا جائے، جسے اشتراک کہتے ہیں، یا حقیقت اور مجاز ہے، مطلق و مقید ہے، عام اور خاص ہے، تو عربی زبان جس میں وحی نازل ہوئی، طبعی طور پر اس کے الفاظ اور تراکیب میں مختلف معانی اور متعدد مدلولات کی گنجائش ہوتی ہے۔

جیسا کہ طلاق شدہ عورتوں کے بارے میں یہ آیت کہ: ﴿يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ﴾ {البقرة: 228} ”(مطلقہ) تین قُرُوء گزاریں گی۔“ یہاں لفظ (قُرُوء) لغت میں ”پاکی“ اور ”ماہواری“ دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، یہاں کونسا معنی مراد ہے؟ یہی اس مسئلے میں فقہاء کے اختلاف کا سبب ہے۔

یہ تو شریعت کے بارے میں ایک عمومی بات تھی۔ اب اس کا تعلق اس موضوع سے ہے جس پر ہماری گفتگو ہو رہی ہے یا نہیں؟ یعنی احکام شرعیہ میں اختلاف کے جواز سے ان تحریکوں، جماعتوں یا احزاب کے تعدد کا جواز بھی پیدا ہوتا ہے جو تبدیلی کے لیے کام کر رہی ہیں، یا اس موضوع کے لیے مخصوص دلائل ہیں جو سابق میں ذکر شدہ حکم سے اس کو الگ کرتی ہیں؟

جماعت یا حزب بھی شرعی فہم کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے اور شرعی فہم متعدد ہو سکتی ہے، اس کا فہم بھی کسی بھی شرعی فہم کی طرح ہے، البتہ اگر یہ قطعی احکامات ہوں تو الگ بات ہے۔ جماعت نے جن شرعی احکامات کی تنبی کی ہے، یہ اجتہادی شرعی احکامات ہیں جن میں صحیح یا غلط ہونے کا احتمال ہے۔ مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ کسی جماعت میں بہت ساری غلطیاں دیکھے، پھر بھی اس کے ساتھ کام کرے، بلکہ اس کو چاہیے کہ اس کو نصیحت کرے اور اس جماعت کو تلاش کرے جس کے ساتھ کام کرنے سے یہ اللہ کے سامنے بری الذمہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا کہ لوگوں اور علماء کی طبیعت اس طرح شرع اور عربی زبان ولغت کا مزاج سب کے سب سمجھ کے متعدد ہونے کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، جس سے جماعتوں کے تعدد کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی نقصان بھی نہیں جب تک اس اختلاف کی وجہ فہم ہو۔ اس صورت میں اس جماعت یا حزب کے ساتھ کام کرنا فرض ہو جاتا ہے جو زیادہ صحیح ہو۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ ”اور تمہارے درمیان ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد (لوگوں کو) بھلائی کی طرف بلائیں، نیکی کی تلقین کریں اور برائی سے روکیں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں“ (آل عمران: 104)

اس آیت میں کم از کم ایک ایسی جماعت کی موجودگی کو واجب قرار دیا گیا ہے جس کا کام خیر کی طرف دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ آیت سے مقصود صرف ایک جماعت کی موجودگی نہیں۔ ورنہ یوں ہوتا (أُمَّةٌ وَاحِدَةٌ) ”ایک جماعت“ بلکہ مقصود جنس جماعت کا وجود ہے جس کا کام دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو۔ یہ فرض کفایہ ہے، جو ایک جماعت سے

بھی ادا ہو جاتا ہے۔ جب جماعتیں ایک سے زیادہ ہوں تو عمل کے بارے میں فہم بھی متعدد ہوں گے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس قسم کی تعبیر سینکڑوں آیات اور احادیث میں وارد ہے۔ جیسے یہ حدیث کہ: (من رای منکم منکراً فلبغیرہ بیدہ۔۔۔) ”تم میں سے جو بھی کوئی منکر دیکھے تو اس کو ہاتھ سے روکے۔“

یہاں کوئی ایک منکر مراد نہیں بلکہ جنس منکر مراد ہے۔ ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی کتاب ”دین اور ریاست کے بارے میں اسلامی تصورات“ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت کے باب میں ذکر کیا ہے: ”اس سب سے ظاہر ہے کہ اس آیت ﴿وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ﴾ {آل عمران: 104} میں جو (مِنْ) تبعیض لایا گیا ہے، اس تبعیض کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں صرف ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی طرف دعوت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام کرے جبکہ باقی مسلمانوں پر یہ فرض نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ واجب ہے کہ امت کسی بھی حالت میں ہو، کم از کم ایک ایسی جماعت سے خالی نہ ہو جو حق کے چراغ کو روشن رکھے، ظلم اور شر و فساد کے خلاف جنگ جاری رکھے۔ اگر امت کے اندر ایک بھی ایسی جماعت نہ ہوگی، تو امت اللہ کی لعنت کی مستحق ہوگی چہ جائیکہ وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔“ مودودیؒ کی بات یہاں ختم ہو گئی۔

### جو کچھ پہلے گزر گیا اس کی بنیاد پر:

ہمیں یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ شرع جس چیز کی اجازت دیتی ہے وہ رحمت ہے۔ لیکن جب یہ رحمت، عذاب میں بدل جائے تو یہ مسلمانوں کی غلط فہمی کی وجہ سے ہوتی ہے اس کی اور کوئی وجہ نہیں۔ اس امت کے دو جلیل القدر آئمہ اور فقہاء کی سمجھ کو ذرا دیکھئے۔ کتاب ”شذور الذہب“

میں ہے کہ: امام شافعیؒ کے شاگرد ایک دن آپ کے پاس آئے اور شکایت کی آپ امام حنبلؒ کی زیارت کیوں کرتے ہیں، حالانکہ ان کے شاگرد اختلافِ رائے کے سبب آپ کے شاگردوں سے لڑتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے ان سے فرمایا:

قالوا يزورك احمدٌ وتزوره قلت: الفضائل لا تفارق منزله  
ان زارني فبفضله اوزرته فلفضله، والفضل في الحالين له

”مجھ سے کہتے ہیں کہ احمد تم سے ملتا ہے اور تم بھی اس سے ملتے ہو؟ میں نے کہا: فوقیتیں اُن کے مرتبے سے الگ نہیں ہوتی، اگر وہ مجھ سے ملتا ہے تو یہ بھی اس کی فضیلت یا میں اس کی زیارت کروں تو یہ بھی اس کی فضیلت ہے، ہر حال میں فضیلت ان کو حاصل ہے۔“

اسی قسم کا ایک واقعہ امام احمدؒ اور ان کے شاگردوں کے درمیان بھی پیش آیا۔ آپ نے ان سے فرمایا:

ان نختلف نسباً يؤلف بيننا علم اقمناه مقام الوالد  
او يختلف ماء البئار فكلنا عذب تحدر من انا واحد

”اگرچہ نسب کے لحاظ سے ہم مختلف ہیں لیکن وہ علم ہمیں مانوس بناتا ہے، جس کو ہم نے والد کا قائم مقام بنایا ہے، اگر سمندروں کا پانی مختلف ہو تو ہو، ہماری مثال تو اس میٹھے پانیوں کی ہے جو ایک ہی برتن کے ہیں۔“

جو لوگ تمام مسلمانوں کو ایک ہی کام کے لیے اکٹھا کرنا چاہتے ہیں، تو وہ شرع کی حقیقت سے بھی غافل ہیں، لوگوں کی حقیقت سے بھی غافل ہیں، ہم ان لوگوں سے وہی کہیں گے جو امام مالکؒ نے ہارون الرشید سے اس وقت کہا جب ہارون الرشید نے ارادہ کیا کہ وہ امام مالکؒ کی فقہ اور ان کے مذہب کی تہنیتی کرے اور لوگوں پر اس کو لازم کر دے، یا دوسروں کی فہم کو منع کرے۔

امام مالکؒ نے فرمایا: ”اللہ نے جس چیز میں مسلمانوں کو وسعت دے رکھی ہے تم اس میں مسلمانوں پر کیوں تنگی کرتے ہو؟“

اس بارے میں چوکس رہنا ضروری ہے کہ کافر ممالک اور ان کی تابع حکومتیں جب ایک جماعت یا جماعتوں کو اسلامی حکومت کے قیام کے لئے کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو ان کے خلاف افواہوں اور پروپیگنڈوں کے غلیظ اسلوب کے استعمال کے ساتھ ساتھ ان جماعتوں کے اندر سے دوسری جماعت بنا کر ان کو ناکام کرتے ہیں۔ اگر ہم فرض کریں کہ تعدد جائز نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جماعت کو دوسری جماعتوں سے اتحاد قائم کرنا چاہیے، یوں اس میں رطب و یابس سب ہوں گے۔ حالانکہ مطلوب توفضولیات کو باہر کر کے صرف اس چیز کو باقی رکھنی ہے، جو مسلمانوں کے لیے مفید ہو۔

چونکہ یہ تجویز یعنی اسلامی عمل کی وحدت کا وجوب اور تعدد کا عدم جواز شرع، انسان اور اس لعنت کی حقیقت کے خلاف ہے، جس میں وحی نازل ہوئی ہے چنانچہ یہ ایسی تجویز ہے جو حقیقتاً ممکن ہے۔ یوں یہ اہم ترین کام یعنی خلافت کے قیام کے کام سے جان چھڑانا ہے۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اللہ اس وقت تک مسلمانوں کی مدد نہیں کرتا، جب تک وہ ایک نہ ہوں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ اللہ اس وقت تک مسلمانوں کی مدد نہیں کرتا جب تک وہ شرع کی پابندی نہ کریں۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں اور اسلام کو نافذ نہ کریں۔ اگر مسلمان یہ کریں تو اللہ ان کی مدد کرے گا خواہ وہ بہت کم ہوں۔ اس لئے حق پر کاربند ایک بھی بہت ساروں پر بھاری ہے اور باطل کے پیروکار بہت سارے بھی ہوں وہ جھاگ ہیں۔

اس موقع پر ایک بات رہتی ہے اور وہ یہ کہ خلیفہ کی موجودگی اور اسلامی ریاست کی موجودگی مسلمانوں کی وحدت کا اہم مظہر ہے، اس کے بغیر وحدت ممکن ہی نہیں۔ خلیفہ کی موجودگی کی صورت



میں لوگوں کی سمجھ آپس میں مختلف ہو سکتی ہیں، مگر ہمیں خلیفہ کی اطاعت کا حکم ہے۔ امام ایک تہنی کرتا ہے اور اپنی تہنی کے ذریعے اختلاف اٹھا دیتا ہے، اس اختلاف کو خلیفہ ممنوع یا جڑ سے ختم نہیں کرتا۔ مسلمانوں پر اس کا حکم ظاہر و باطن نافذ ہوگا۔ جہاں تک امیر الحزب کا تعلق ہے تو اس کا حکم صرف اپنے حزب کے اندر نافذ العمل ہوگا اگر حزب کے ارکان کے مابین کوئی اختلاف رونما ہوتا ہے تو وہ اس کو رفع کرے گا نہ کہ تمام مسلمانوں کے اختلاف کو۔

## تحریک عالمی یا علاقائی؟

بعض مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی تحریک کا عالمی ہونا واجب ہے، کیونکہ اسلام عالمی دین ہے، محمد ﷺ کی بعثت بھی ساری دنیا کے انسانوں کے لیے تھی، حقیقت بھی یہ ہے کہ اسلامی تحریک عالمی سطح پر پھیلی ہوئی تحریکوں کا سامنا کر رہی ہے تو اس کے پیش نظر بھی ساری دنیا ہونی چاہیے، اس طرح اسلامی تبدیلی کے لیے جس بڑی محنت کی ضرورت ہے اس کا بھی تقاضا ہے کہ یہ تحریک عالمی ہو۔ اس قسم کی رائے رکھنے والے حضرات یہ قرآنی شواہد پیش کرتے ہیں: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ {البقرة: 143} ”اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔“

اور فرمایا: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ {الاعراف: 158} ”(اے رسول! ان سے) کہو کہ: "اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔“

اس طرح فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا﴾

{سبا: 28} ”اور ہم نے تمہیں تمام لوگوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔“

رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت میں پوری دنیا کو مخاطب کیا، ہر چھوٹی بڑی طاقت، ہر لشکر اور بادشاہ کو دعوت دی، نجاشی (حبشہ کے بادشاہ)، ہر قل (روم کے حکمران)، مقوقس (قبط کے سربراہ)، کسریٰ (فارس کے سربراہ) کو دعوت دی۔ اسلامی دعوت ادھر ادھر کے دکانداروں اور کسانوں تک محدود نہیں ہونی چاہیے، ورنہ صد ابالصحرا بن کر رہ جائے گی۔

جی ہاں اسلام ایک دین کے طور پر یقیناً عالمی ہے اور اس کا عقیدہ اور نظام عالمی ہے:

اللہ ہی ہر چیز کا خالق، مدبر اور علیم و خبیر ہے۔ گھٹیا پانی سے پیدا کیا گیا ضعیف اور عاجز انسان پر فرض ہے کہ وہ اسی سے التجا کرے۔ کیونکہ اللہ ہی انسان کا خالق اور ہر انسان کا رب ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد بھی عبادت ہے۔ اس کے وجود کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور حشر و نشر سے تعلق ہے، اس طرح جنت اور جہنم، ایمان اور اطاعت پر جزا اور کفر و معصیت پر سزا سے مربوط ہے۔ عقیدے کو بھی تمام انسانوں تک پہنچانا لازم ہے۔ ﴿لَيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ {انفال: 42} ”تاکہ جسے برباد ہونا ہو وہ واضح دلیل دیکھ کر برباد ہو اور جسے زندہ رہنا ہو وہ واضح دلیل دیکھ کر زندہ رہے“

وہ نظام جس کو اللہ نے اپنے رسول ﷺ پر نازل کیا اور اس کو اس عقیدے سے نکالا یہ نظام انسان کے لیے ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ انسان کس رنگ، کس نسل اور کس حقیقت کا ہے۔

جی ہاں اسلام ایک عالمی دین ہے۔ یہ ایک عالمی اسلامی ریاست کے بچ بونے کو فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام جماعت کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس طرح تیار کرے کہ اس ذمہ داری کو ادا کرے، اس لیے اصلاً اسلام یہ فرض کرتا ہے کہ جماعت اپنے کام میں تنگ نظری سے نہ دیکھے۔ اپنے آپ کو اس ملک کی حد تک محدود نہ کرے جس میں وہ کام کرتی ہے، نہ ہی جزوی تجاویز یا تدریجی عمل کو قبول کرے جن میں حق کے چند ٹکڑوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جو اسلام کی بیخ کنی کا باعث ہو گا۔ بلکہ اس پر فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس نے پوری انسانیت کو کفر و شرک کی ظلمتوں اور تاریکیوں سے نجات دلانا ہے، چاہے کفر و شرک کوئی بھی صورت اختیار کر لیں، (پہلے کفار بتوں سے خیر و شر کی توقع کرتے تھے۔ موجودہ کفار چند متعین افکار کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مفید ہیں انہی میں ان کی خیر ہے، اس کے علاوہ میں شر ہے۔) انسانیت کو اس حق کی طرف لائے جو متعدد نہیں۔ جماعت کا نقطہ نظر ایسا ہونا چاہیے، اور اسی پر اپنی ثقافت کی بنیاد رکھے۔ اور یہ کہ اس کا کام اور نشانِ راہ پہلے سے متعین ہیں، تو جب ذرا برابر ہٹے بغیر اس پر چلے گی، اس پر بغیر کسی کج روی، کسی صلح جوئی اور لچک کے، صبر کے ساتھ وہ سب کچھ برداشت کرے جو اس راستے میں پیش آئے، تو وہ یقین کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو (عملی اور نظریاتی طور پر) عالمی سطح پر اس کام کو کرنے کے لیے تیار کر دیا ہے۔ اللہ اس سے عالمی کام لینا چاہتے ہیں جو ظاہر ہے کہ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد ہو گا۔ پس یہ جماعت (تحریک) فکر کے لحاظ سے تو عالمی ہو گی جبکہ عملی طور پر وہ ایک ایسی جماعت ہوتی ہے جو کسی ایک جگہ خلافت کو قائم کرنے کے لیے کام کرتی ہے۔ اور جب خلافت قائم ہو جائے گی تو وہ اس عظیم ترین ذمہ داری کو ادا کرے گی۔

موضوع کے حوالے سے ایک نقطہ ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کی سرزمین ملکوں میں تقسیم ہے، ان ممالک میں مسلمان عام طور پر ملتے جلتے ماحول میں رہتے ہیں، اگر تھوڑا بہت اختلاف ہے بھی تو چنداں مؤثر نہیں، جس سے طریقہ تبدیل ہوتا اور نہ ہی ایک سے زائد ممالک

میں ایک منظم کام کے پھیلنے سے مانع ہے۔ یہ وسعت اور پھیلاؤ جماعت کو اور مضبوط کرتی ہے اور اس کو فعال اور چوکنا بناتی ہے، جس سے خلافت ایک ایسے ملک میں قائم ہوگی جس میں وسعت پانے اور پھیلنے کی صلاحیت ہو۔ یہ امر اس ذمہ داری کی ادائیگی میں جماعت کے لیے معاون ثابت ہوگا جو ریاست کے قیام کے فوراً بعد اس پر آئے گی۔ اور جو ریاست کو عالمی کشمکش کے مرحلے میں کودنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ ان دونوں امور میں وہ اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتی ہے۔

## عمل جزوی ہو گا یا مکمل اور متوازن؟

کچھ کام کرنے والے مسلمان یہ تجویز دیتے ہیں کہ موجودہ اسلامی کام مکمل اور متوازن ہونا چاہیے، اس کے مقابلے میں جزوی اور مبالغہ آمیز تجاویز بھی پیش کی جاتی ہیں۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ کام ہر لحاظ سے مکمل ہو، یہ جائز نہیں کہ بعض جزئیات اور پہلوؤں پر انحصار کیا جائے۔ اس عالمی منہج کی خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں عبادات کا نظام، اقتصادی نظام، معاشرتی نظام، سیاسی اور عسکری نظام ہیں۔ پھر یہ بھی کہ پہلا اسلامی عمل عہد نبوت میں مکمل تھا۔ رسول اللہ ﷺ مختلف جانب سے اس اسلامی کام کی دیکھ بھال کرتے اور مسلسل اس کو جاری رکھتے تھے۔ تربیت کے دائرے میں بہترین مربی تھے، تعلیم کے دائرے میں آپ ﷺ استاذ تھے اور جہاد کے میدان میں قائد تھے، منصوبہ بندی کے لحاظ سے ایک ماہر منصوبہ ساز تھے۔ اسلامی کام میں ہر جگہ اور ہر وقت رسول اللہ ﷺ کی پیروی لازمی ہے اس میں یہ اختیار نہیں کہ کونسا طریقہ اپنایا جائے اور کس کو چھوڑا جائے۔

اس کے مقابلے میں اسلامی عمل کا جزوی ہونا یہ ہے کہ اس کے کسی ایک جزو کو اختیار کر کے اسی کا التزام کیا جائے اور اسی پر ایمان لایا جائے، اس کے ماسوا کا انکار کیا جائے۔ جزوی کام سے تشنت اور گروہ بندی پھیلتی ہے اور طاقت منتشر ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی اس روش کو منکر قرار دیا ہے ارشاد ہے: ﴿أَفْتَوْمُنُونَ بِنِعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ {البقرة: 85} ”تو کیا تم کتاب (تورات) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اُس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں اُس کی رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔“ پھر یہ بات بھی ہے کہ جاہلیت کے چیلنج کی وجہ سے بھی اسلامی عمل کا مکمل ہونا فرض ہے۔

مسلمانوں کا یہ فریق توازن کے بارے میں سمجھتا ہے کہ کامل عمل کے ہر پہلو کو وزن اور اس کا لازمی معیار دینا توازن ہوتا ہے، ورنہ خلل اور غلو کا شکار ہو گا، اور توازن کا تقاضا ہے کہ ترجیحات کا لحاظ رکھا جائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مکمل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ پورے کے پورے اسلام کو اختیار کیا جائے۔ اس وجہ سے یہ فرض ہے کہ کام کرنے والی جماعت کا کام ہمہ گیر انداز سے ہو۔ توازن کا تقاضا ہے کہ مناسب مقداروں اور معیارات کے لحاظ سے ہر پہلو کا اہتمام ہو۔ اس میں زیادتی نہیں کی جائے گی تاکہ غلو نہ ہو، نہ اس میں کمی کی جائے گی تاکہ خلل واقع نہ ہو۔

یقیناً تکمیل اور توازن کے قوانین ہی اشیاء اور افعال کی طبیعت کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہی دو قوانین ہیں جن کا مسلمان اور غیر مسلم دونوں لحاظ رکھتے ہیں اپنی زندگی میں ان دونوں کی موجودگی کی اہمیت کا احساس کرتے ہیں اور ان کے حصول کے لیے کام کرتے ہیں تاکہ پسندیدہ نتائج حاصل ہوں۔

ہاں اس بات کا لحاظ رکھنا انتہائی ضروری ہے کہ اشیاء کی تکمیل اور ان میں توازن کے حصول کا حکم لگانے کا دار و مدار عقل پر ہے، برخلاف افعال کے کہ ان کے حوالے سے صرف شرع پر اعتماد کیا جائے گا۔ کیونکہ عقل اشیاء اور ان کے اجزائے ترکیبی کی حقیقت اور ان کی متعین نسبتوں کا ادراک کرتی ہے، یہی محققین کا راستہ ہے، اسی پر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث منطبق ہوتی ہے کہ: ((أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ)) (مسلم) ”تم خود اپنے دنیاوی معاملات کو بہتر سمجھتے ہو۔“

پس کسان، ڈاکٹر، انجینئر اور کمپنک میں سے ہر ایک اپنے کام کے مدار اور اس کے قوانین سے باخبر ہوتا ہے۔ اپنے کام میں اس قانون پر عمل کی رعایت کرتا ہے۔ رہی بات افعال کی، تو ان کی تعیین تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے جس پر رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث صادق آتی ہے کہ: ((كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)) (البخاری، مسلم) ”ہر وہ عمل جس کے بارے میں ہمارا حکم نہ ہو وہ مردود ہے۔“

یہ شرعی قاعدہ بھی اس پر منطبق ہوتا ہے: (الاصول في الافعال التقيد بالحكم الشرعي) ”افعال میں اصل حکم شرع کی پابندی ہے۔“

اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے خیال کے مطابق افعال پر حسن اور قبح کا حکم لگاتا ہے، اس فعل کی ذات کی وجہ سے نہیں۔ پس مسلمان جن افکار پر ایمان رکھتا ہے، ان کے لحاظ سے اس کے فعل پر حکم لگایا جائے گا۔ اگر فعل اللہ کے اوامر اور نواہی کے مطابق ہے تو وہ حسن ہے ورنہ قبیح۔ اس وجہ سے

یہ شرعی قاعدہ ہے کہ: (الحسن ما حسنہ الشرع، و القبیح ما قبحہ الشرع)  
 ”حسن وہ ہے جس کو شرع حسن کہے اور قبیح وہ ہے جس کو شرع قبیح قرار دے۔“

یہی وجہ ہے کہ مسلمان جب اشیاء میں تکمیل اور توازن کا ارادہ کرے تو کسی بھی دوسرے انسان کی طرح اپنی عقل پر اعتماد کرے گا، لیکن جب افعال میں اس کا ارادہ کرے تو فرض ہے کہ حکم شرعی کے مطابق ہو۔

یہاں ایک اور بات بھی ہے، وہ یہ کہ تکمیل اور توازن کا قانون مطلوبہ شرعی فعل کے حجم کے لحاظ سے ہو گا اور اس سے متجاوز نہیں ہو گا۔ اس میں مزید تفصیل کی ضرورت ہے:

- اسلام مکمل ہے تمام مسلمان یعنی امت مسلمہ اسلام کا کام کرے گی۔

- امت میں افراد، جماعتیں اور خلیفہ سب داخل ہیں۔

- ان میں ہر ایک کو شرع نے کچھ خاص احکامات سپرد کئے ہیں۔

ایک مسلمان فرد اس فعل کو انجام دے گا جو ایک فرد کی حیثیت سے شرعاً اس پر فرض ہے، اور جماعت اس کام کو انجام دے گی جو ایک جماعت کی حیثیت سے اس پر فرض ہے، خلیفہ اس کام کو کرے گا جو خلیفہ کی حیثیت سے اس پر فرض ہے۔ جب مسلمان افراد کی حیثیت سے ان کاموں کو ادا کریں گے جو شرعاً ان سے مطلوب ہیں، اسی طرح جماعت اور خلیفہ اپنا اپنا کام کریں گے، تب کام کامل اور مکمل ہو گا۔ فرد، خلیفہ یا جماعت کی طرف سے اپنے سے متعلقہ کسی بھی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی سے یہ سمجھا جائے گا کہ اس نے مکمل کام نہیں کیا اور وہ گنہگار بھی ہو گا۔

خليفة کی موجودگی کے بغیر مکمل اسلام پر کامل عمل نہیں ہو سکتا کیونکہ دین کے بہت سارے احکامات کا انحصار خلیفہ کی موجودگی پر ہے، اس لئے خلیفہ کا وجود شرعاً فرض ہے، جس کی وجہ سے اس کو وجود میں لانے کا کام بھی شرعاً فرض ہے جس کے نتیجے کے طور پر اس جماعت کی موجودگی بھی شرعاً فرض ہے جو خلیفہ کو وجود میں لانے کے لیے کام کرے۔ وہ جماعت ہر وہ کام کرے گی جو خلافت کے قیام کے ذریعے اقامت دین کے حوالے سے اس کے لیے ضروری ہے۔ اس کو اسلامی زندگی کے احیاء کا کام کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مطلوبہ شرعی تکامل ہے، اس سے مراد ہر حکم شرعی کی ادائیگی نہیں جس کی ذمہ داری جماعت پر ڈالی ہی نہیں گئی ہو، بلکہ کچھ احکام شرعی ایسے بھی ہیں جن کی انجام دہی جماعت کے لیے ممنوع ہے، جیسے حدود، جماعت خلیفہ کا کام کرنے کی کوشش نہیں کرے گی بلکہ جماعت کا کام خلیفہ کو وجود میں لانے کے لیے کام کرنا ہے: **((فالأمر الذي على الناس راع وهو مسؤول عن رعيته)) (مسلم)** ”پس وہ امیر جو لوگوں پر مقرر ہے وہ اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے۔“ **((... فإن الله ساءلهم عما استرعاهم)) (مسلم)** ”یقیناً اللہ ان سے ان کی رعایا کے بارے میں پوچھے گا۔“

یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک فرد اسلام پر پورا ایمان رکھتا ہے دعوت بھی اجمالی طور پر پورے اسلام کی طرف دیتا ہے، لیکن تفصیل سے تبی ان احکامات کی کرتا ہے جو شرعاً اس سے مطلوب ہیں، یا اس جماعت سے مطلوب ہیں جس کے ساتھ یہ کام کرتا ہے۔ ان میں سے کسی بھی حکم کے بارے میں سستی پر اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ کریں گے۔ خلیفہ بھی ایک فرد کی حیثیت سے ان احکامات پر عمل کرے گا جو ان سے مطلوب ہیں، وہ بھی نماز پڑھے گا، حج کرے گا، زکوٰۃ ادا کرے گا۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے گا، زنا، سود اور خیانت وغیرہ سے اجتناب کرے گا۔ اس طرح خلیفہ کی حیثیت سے جو چیزیں ان پر فرض ہیں ان کو ادا کرے گا، قوانین کو نافذ کرے گا، جہاد کا اعلان کرے گا،



مسلمانوں کی شیرازہ بندی کرے گا، اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرے گا، حدود کو قائم کرے گا ان میں سے کسی بھی چیز میں کوتاہی کی صورت میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ اس کا محاسبہ کریں گے۔

یہ ہے وہ صورت حال جس کے بارے میں شرعی احکامات ہیں جس کی وضاحت جماعت کے واسطے انتہائی ضروری ہے تاکہ وہ ان احکامات کے درمیان فرق کرے جو اس سے مطلوب یا غیر مطلوب ہیں، یوں جماعت ان احکامات کو سمجھ لے جو خلیفہ سے مطلوب ہیں جماعت سے نہیں۔ جماعت جب صورت حال کی تعیین کرے گی تو اپنے مطلوبہ کاموں کی بھی تعیین کرے گی۔ جس کی وجہ سے اس سے ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ یہ تکمیل کے حوالے سے ہے۔

جماعت جب مطلوبہ احکامات کی تعیین کرے گی پھر اگر جماعت مطلوبہ احکامات میں سے ایک پہلو پر انحصار کرے، یا صرف ایک جانب توجہ مرکوز رکھے، اس کو دوسرے پہلوؤں کے لحاظ سے زیادہ اہمیت دے یا اپنے کام میں ترجیحی پہلوؤں کی رعایت نہ رکھے تو وہ مطلوبہ توازن کھو بیٹھے گی۔ تاہم، یہ بات ضرور ذہن نشین رہے کہ اس میں جو بھی چیز ترجیحات کا تعین کرتی ہے وہ شرع ہے عقل نہیں۔ پس جماعت کا کام سیاسی ہے اور وہ ایسے مبداء (آئیڈیالوجی) پر قائم ہے جس کو وہ امت پر نافذ کرنا چاہتی ہے۔ دعوت میں عقیدہ ہی بنیادی حیثیت کا حامل ہے کیونکہ یہی وہ اساس ہے جس پر تمام ذیلی شاخوں کا دارومدار ہے اور تمام احکام شرعیہ اسی کے حوالے سے طے ہوتے ہیں۔ خلافت کے قیام کو ملحوظ خاطر رکھنا ریاست کے معاملات میں بنیادی نقطہ ہونا چاہیے کیونکہ زیادہ تر احکامات اسی پر منحصر ہیں اور اسی وجہ سے خلافت کو تمام فرائض کا تاج کہا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر جماعت اپنے معاملات میں توازن کے حصول میں اس بنیادی نقطہ کو پیش نظر نہ رکھے تو وہ اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ کرے گی جو کہ اللہ نے اس پر عائد نہیں کیے۔ یوں جماعت

نفاٹس اور غیر متوازن ہونے کی اسی طرح شکایات کرتی رہے گی جس طرح وہ کثرت کی شکایت کرے گی۔ یوں پھر یہ ایک ایسی جماعت بن کر رہ جائے گی جو بس شکایت کرتی اور روناروتی رہتی ہے اور اپنی منزل کھودے گی کیونکہ اس نے اپنی سمت ضائع کر دی ہے۔

اسلامی منہج کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عبادات کا نظام ہے، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور عسکری نظام ہے۔ اب اس جماعت کا ان تمام نظاموں سے کس نوعیت کا تعلق ہے؟

جماعت اللہ کی حکومت کو وجود میں لانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ جب یہ حکومت قائم ہوگی تو یہ سارے اسلامی نظام قائم ہوں گے۔

اقتصادی نظام میں ایسے شرعی احکامات ہیں جو زمین سے متعلق ہیں، ایسے احکام بھی ہیں، جو ملکیت سے متعلق ہیں، دیگر احکامات صنعت سے متعلق ہیں، کچھ احکامات اندرونی و بیرونی تجارت سے متعلق ہیں۔ ان سب کی انجام دہی کو شرع نے خلیفہ کے ذمہ ڈال دیا ہے، وہی ان کی نگرانی کرتا ہے نہ کہ جماعت۔

سیاسی نظام میں ریاست ان بنیادوں اور ستونوں پر قائم ہوتی ہے، جو کہ شرع نے متعین کر دیئے ہیں، جس میں خلیفہ، معاونین، والی، قاضی، انتظامی ڈھانچہ اور مجلس امت شامل ہے۔ خلیفہ، معاونین اور گورنروں کے اپنے اختیارات ہیں، فوج کی اپنی ذمہ داری ہے، انتظامی ڈھانچے کا اپنا دائرہ ہے جماعت کا کیا کام ہے کہ اندر مداخلت کرے؟

اسلامی افواج جن کی تیاری کا مقصد اس غایت کا حصول ہے جس کے لیے ان کو بنایا گیا ہے یعنی دنیا میں اسلامی دعوت کو پھیلانا۔ ان کی تیاری بھی عالمی معیار اور بڑے پیمانے پر ہونی چاہیے نہ کہ

تحریکی (جماعتی) پیمانے پر، جہاں ایک مسلمان صرف اتنا سیکھتا ہے کہ گولی کیسے چلانی ہے، ٹریگر کیسے دبانا ہے، وغیرہ۔ یہ بات بھی اچھی طرح جانی جاتی ہے کہ بعض اسلحہ جات صرف افراد کے لیے ہوتے ہیں اور بعض اسلحہ ایسے ہیں جن کو صرف ریاست رکھ سکتی ہے، لہذا اس کا تقاضا ہے کہ یہ تیاری اور مشق انتہائی اعلیٰ پیمانے پر ہو، اور اس میں توپ، بکتر بند گاڑیاں، جنگی طیارے، ایٹمی طاقت، ایئر فورس وغیرہ، لیبارٹریز، اسلحہ سازی کی فیکٹریوں، ایئر پورٹوں اور ٹریننگ سنٹروں وغیرہ کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو جماعت کا ان چیزوں سے کیا تعلق؟

رسول اللہ ﷺ جب اپنے صحابہؓ کو ٹریننگ دیتے اور ان کو تیار کرتے تھے تو ایک جماعت کے ذمہ دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک ریاست کے حاکم کی حیثیت سے ان کو تیار کرتے تھے۔ اس وجہ سے آپ ﷺ کی پیروی یہ ہے کہ ہم بھی اس سے انحراف نہ کریں۔

پس جماعت کا کام ان نظاموں کو نافذ کرنا نہیں بلکہ جماعت کا کام اس خلیفہ کو وجود میں لانا ہے جو ان نظاموں کو نافذ کرے گا کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اگر جماعت خلیفہ کو مقرر کرنے کے کام کو چھوڑ کر ان اعمال کو خود انجام دینے کی کوشش کرے گی تو یہ شرع سے انحراف ہوگا۔

جماعت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ فکری طور پر ان نظاموں کی تبنی کرے جن کو وہ اللہ کی توفیق سے لوگوں پر نافذ کرنا چاہتی ہے۔ جماعت اسلامی نظام کے ڈھانچے اور ریاست کے دستور کی تحدید کرے گی، لوگوں کو اسلامی احکامات کی اجمالی تصویر بتائے گی، تاکہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ اسلام میں ان مسائل کا حل موجود ہے اور لوگ اللہ کی عبادت کرنے اور احکام شرع کی تطبیق کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے لیے اس کے ساتھ کام کریں۔

مذکورہ رائے والوں نے جس جزویت کا ذکر کیا ہے تو یہ اگر خیر اتی انجمنیں یا اخلاقی انجمنیں ہوں، یا صرف ایک حکم شرعی کی ادائیگی کے لیے وجود میں آئی ہوں، تو ان کی بات ہی الگ ہے جیسے حفظ قرآن کے ادارے، ایسی انجمنوں پر کوئی قدغن نہیں، جب تک کہ ان کے ممبران کسی حکم شرعی پر اکٹھے ہوئے ہوں۔ اگر ایسی انجمنیں دعویٰ کریں کہ وہ اس طرح اقامت دین کے لیے کام کر رہی ہیں تو اب ہم کہیں گے کہ یہ مقررہ شرعی طریقے سے انحراف کر رہی ہیں اور اس کی یہ جزویت مسترد کر دی جائے گی۔

جبکہ ایک جماعت قائم ہو جاتی ہے اور خلیفہ یا فرد کے ذمہ واجب احکامات کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیتی اور اپنے آپ کو مسلمانوں کی جماعت نہ سمجھے بلکہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت تصور کرے، اپنے ہدف کی تحدید کرے، جو کہ اللہ کی حکومت کا قیام اور اسلامی زندگی کا احیاء ہے پھر اپنے ہدف کے حصول کی خاطر ان اعمال کی تبنی کرے جو اس کے لیے لازم ہیں، اسلامی عقیدے کی صحیح تبنی کرے، اس سے متعلقہ افکار کی تبنی کرے، اپنے شباب کو اس تبنی شدہ عقیدے کے مطابق اچھی طرح تیار کرے۔ ہدف تک پہنچنے کے لیے صحیح طریقے کی تبنی کرے، اس دستور کی تبنی کرے جس کے مطابق وہ حکومت کرے گی، ان افکار کی تبنی کرے جن کے ذریعے مسلمانوں میں موجود باطل افکار کی کجی کو بیان کرے، غلط تصورات کی تصحیح کرے، اس فرد سے بھی ذاتی فرائض کا مطالبہ کرے جو اس کے ساتھ ہے تاکہ وہ ایک نیک مسلمان فرد ثابت ہو، جیسے: عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، اور یہ جماعت اپنے کام کو اسی اسلامی معاشرے کے قیام پر مرکوز کرے جس کے اندر اسلامی تعلقات ہوں گے اور جس کی نگرانی خلافت کرے گی۔ جماعت حکمرانوں اور سربراہوں پر نظر رکھے تاکہ مسلمانوں کے بارے میں ان کے منصوبوں کو پہچانے، ان کو بے نقاب کرے، پھر اس کے متبادل ان احکام شرعیہ کی تبنی کرے، جن میں مسلمانوں کے مفادات مضمر ہوتے ہیں، ان سرکش حکمرانوں سے زمام اقتدار

چھین لینے کے لیے عملی کام کرے جو مسلمانوں کے بارے میں قرابت اور عہد کا لحاظ بھی نہیں رکھتے ہیں۔ ایسی جماعت ہی وہ جماعت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے، جس نے اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کے قیام کے لیے بحیثیت جماعت اپنی پوری تیاری کی ہوئی ہے۔

ایسی جماعت کی ثقافت اور عمل کا دائرہ کار وسیع ہوگا، اسی وجہ سے اس کو وہ سارے کام کرنا پڑیں گے جو اس سے مطلوب ہیں، جو کہ بہت زیادہ ہیں، اس میں بھی مطلوبہ توازن برقرار رکھے گی چنانچہ وہ ریاضت و مجاہدہ والی، اخلاقی یا اقتصادی جماعت یا ادارہ بن کر نہیں رہتی۔ بلکہ یہ اپنے سیاسی رجحان اور سیاسی کام کی حفاظت کرے گی۔ اس کے افکار معاملات کی نگرانی اور امت کے مفادات کے لیے تبنی شدہ ہوں گے۔

یہی وجہ ہے کہ مذکورہ جزوی تجویز مسترد ہے۔ یا جماعت کا اتنا وسیع ہونا کہ مطلوبہ اور غیر مطلوبہ دونوں امور پر مشتمل ہو، غلط اور مسترد ہے۔

## تدرّج

ہم جس فکر کی طرف توجہ مبذول کرانے اور اس کو حل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے فساد کو بے نقاب کرنا چاہتے ہیں وہ ہے تدریجی طور پر اسلام کا نفاذ کی سوچ۔ اسی سے موجودہ نظاموں میں مسلمانوں کی شرکت کا جو ازپیدا ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ جمہوریت اسلام سے ہے، اس فکر کا تبدیلی کے لئے کام کرنے والی بعض جماعتوں کے کام کے ساتھ جو مضبوط تعلق بن گیا ہے، یہ دراصل اسلام کو عقل کے قریب کرنے کے تحت داخل ہے۔

یہ تدرّج کیا ہے؟ اس کے ماننے والوں کی نظر میں اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس کے وجوہ کیا ہیں؟ اس کے بارے میں حکم شرعی کیا ہے؟

جب مسلمان روحانی زوال، مادی پستی، سیاسی انحطاط اور فکری پسماندگی کا شکار ہوئے تو ان کے افکار بھی ان کی بد حالی کے مطابق ہو گئے، اسلام پر کاربند رہنے والوں کے افکار بھی ایسے ہو گئے جو حقیقت میں اسلام اور زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر سے پیدا ہونے والے افکار نہیں تھے، بلکہ یہ افکار اسلام کے حقائق کے بارے میں غلط فہمی، ناسمجھی اور زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطہ نظر کو نہ سمجھنے کی وجہ سے تھے۔ استعماری کافر، جس نے مسلمانوں کے امور اپنے ہاتھ میں لے لئے، اور اپنی مرضی سے جیسے چاہتا ہے ان کے امور کو تبدیل کرتا رہتا ہے، اپنے مفاہیم اور پیمانوں کو مسلمانوں کے درمیان پھیلانے میں کامیاب ہوا۔ استعمار نے مسلمانوں کے اندر اپنے افکار کا ایسا بیج بویا کہ جس کا کھانا اس کے دشمنوں کو بھی اچھا لگتا تھا ان کے منہ کو میٹھا کرتا تھا، جبکہ وہ ایسا اپنے مفادات کے لیے کرتا

تھا۔ اس کی وجہ اسلام نہیں تھا، بلکہ کمزوری ان اہل اسلام کی تھی، جو اسلام کی صحیح طرح پابندی نہیں کرتے تھے اور صحیح فہم کھو بیٹھے تھے۔ انہوں نے مقابلہ تو کیا، لیکن ان کے اذہان حقیقت سے متاثر اور مصلحت پسندی کا شکار ہوئے تھے، لیکن یہ کوششیں کج فہمی پر مبنی اور لو لے لنگڑے اقدامات تھے، جن کی وجہ سے بالآخر انہیں بہت جلد ناکامی ہوئی اور سپر انداز ہوئے۔ استعماری کافر ہمارے ملکوں میں برابر دندناتا پھرتا رہا اس کو روکنے والا یا دھتکارنے والا کوئی نہیں تھا۔ اب استعماری کافر نے اسلام پر کس طرح حملہ کیا؟ اور مسلمانوں نے اس کا کیا جواب دیا؟

اسلام پر یہ حملہ کیا کہ اسلام زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا، اسلام نئے مسائل کا حل نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں نے سرمایہ داری نظام کی بنیاد پر ان مسائل کا اسلامی حل دینے کی کوشش کی۔ باوجود اس کے کہ سرمایہ دارانہ نظام جس بنیاد پر قائم ہے وہ اسلام کی بنیاد سے بالکل متناقض ہے مسلمانوں نے ان دو تفتیشیں (متضاد) کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی کوشش کی، یوں انہوں نے ایسی غلط تاویلات کرنا شروع کیں جس سے غلط مفہیم اور غلط بیمانے پیدا ہوئے، پھر جھوٹ اور بہتان سے ان کی نسبت شرع کی طرف کی گئی۔ اس کا مقصد ان دونوں کو خلط ملط کرنا تھا اس کو اس طرح بیان کیا جس سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی کہ اسلام موجودہ ترقی کے ساتھ ساتھ چل سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان افکار، قواعد اور پیمانوں کو اسلامی بنیاد پر اختیار کیا جانے لگا، اور یہ کہ اس کے ذریعے اسلام کو سمجھا جائے۔ یہ اسلام کو چھوڑ کر سرمایہ داریت کی پیروی کا مترادف تھا۔ موافقت یا موافقت سے متاثر ہر دعوت اسلام کو چھوڑنے اور کفر کو اختیار کرنے کی دعوت ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسلمانوں کو کفر افکار دیئے جائیں اور ان کو دعوت دی جائے کہ وہ ان کو اختیار کریں اور سچی اسلامی دعوت کو چھوڑ دیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب مسلمانوں نے انحطاط کے زمانے میں ان جیسے افکار سے امت کے لیے نہضت (نشاۃ ثانیہ) کی کوشش کی تو یہ مصیبت بالائے مصیبت بنی۔ یہ لوگ امت کو پستی کے اس کھڈے میں سے نہیں نکال سکے کیونکہ وہ خود اس میں اتر گئے تھے۔

اس لئے ہم نے کچھ لوگوں کو جان بوجھ کر یا انجانے میں اسلامی شریعت کے خلاف زبان درازی کرتے سنا، کہا جاتا ہے کہ یہ غیر معقول اور ناقابل فہم بات ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے چودہ سو سال بعد آئے ہیں اور ہم چودہ سو سالہ قدیم سوچ کو فیصلہ کن تسلیم کر لیں، ہمیں اس پرانی سوچ کے مطابق نہیں سوچنا چاہیے بلکہ ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے، حالات کے مطابق نئے سرے سے اس کو پیش کرنا چاہیے، اس کو نیا لباس پہنانا چاہیے، اس میں کچھ نئے افکار کو ضم کرنا چاہیے تاکہ دل نئے سرے سے اس کو قبول کریں، اس کے ابہام کو بھی دور کیا جائے، دوسروں کی تہمتوں سے بھی بچا جائے۔ کیونکہ اس کی قدیم صورت مقبول نہیں رہی۔

اسی سوچ کی بنا پر بعض مسلمانوں نے کئی افکار کو اپنایا جو ان کے لیے فکری قواعد متعین کرتے ہیں، اور اس کے کہنے والوں کی راہ کو طے کرتے ہیں، زندگی کے بارے میں ان کے جدید نقطہ نظر کا تعین کرتے ہیں۔ یہ دور انحطاط کے افکار کے نام سے جانے جاتے ہیں، یہ ہمارے ملکوں میں فاسد مغربی تہذیب کی ترقی کے ساتھ ظاہر ہوئے، ان مسلمانوں نے یہ خیال کیا کہ زمانے کے ساتھ چلنا، مغرب کی ابھرتی ہوئی ترقی پسند فکر سے استفادہ کرنا، زمانے میں اسلام کو باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے۔

اس کے نتیجے میں متاثرہ افکار کی بھرمار ہو گئی جیسے ”دین لچکدار اور ترقی پسند ہے“، ”لے لو اور مطالبہ کرو“، ”اس چیز کو قبول کیا جائے جو شرع کے موافق ہے، یا شرع کے مخالف نہیں ہے۔“، ”خفیف ترین ضرر اور کم ترین شر کو اختیار کیا جائے۔“، ”جو چیز پوری نہ ملے تو اس کو بالکل نہ چھوڑا



جائے۔" "اسلام کو تدریجی طور پر نافذ کیا جائے۔" "جمہوریت اسلام سے ہے۔" "زمانے اور جگہ کے بدلنے سے احکامات بدلنے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔" اور "جہاں مصلحت ہے وہ شریعت ہے۔" یہ افکار یا اس قسم کے افکار فکری اصول اور فکری قواعد بن گئے، جس کو نام نہاد جدید اسلامی ترقی کہا جانے لگا جس کے سب سے بڑے داعی فری میسن (تحریک کے) جمال الدین افغانی اور اس کے شاگرد فری میسن محمد عبدہ تھے جس کو شیخ الاسلام بھی کہا جاتا تھا۔ اس قسم کی باتیں کچھ لوگوں نے بدینتی اور خباثت سے کیں، تاکہ مسلمانوں کی قوت کو منتشر کیا جائے، ان کو اس قدر کمزور کیا جائے کہ وہ دوبارہ اللہ کے حکم کی اقامت کے لیے اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ جبکہ کچھ لوگوں نے یہی باتیں حسن ظن اور نیک نیتی سے یہ سمجھ کر کیں کہ اس میں موجودہ پستی سے نکلنے کا کافی سامان ہے۔

یہ بات چاہے نیک نیتی سے کی جائے یا بدینتی سے حقیقتاً اس کا اثر ایک ہی ہے۔ ہم بہر حال مسلمانوں کو اس دین کے بارے میں کفار کی ریشہ دوانیوں سے محتاط رہنے کی تاکید کرتے ہیں، ہم مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ان افکار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں جن کا بانجھ پن واقعات کی بساط پر ثبت ہو چکا ہے ان میں کوئی بھلائی نہیں بلکہ شر ہی شر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب سے بے پروا کر دیا ہے۔ اسلام میں سب کچھ ہے اس لیے دوسروں سے کچھ لینے کی ضرورت نہیں۔ اسلام طبعی طور پر ہی اپنے طریقے کی فرضیت کو بیان کرتا ہے۔ پس دین اسلام اللہ کی طرف سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے نازل کیا گیا ہے۔ مسلمان پر جو فرض ہے وہ یہ ہے کہ صرف نازل شدہ شرعی نصوص میں اجتہاد کر کے اللہ کا حکم معلوم کرے، ادھر ادھر نہ دیکھے۔ زندگی کے لیے فکری قواعد بھی شرعی دلائل سے مستنبط ہونے چاہئیں اور یہی احکام شرعیہ ہیں جن کے لیے تفصیلی دلائل ہیں۔ طریقہ اجتہاد بھی ثابت شدہ اور ایک ہی ہے، اس میں کسی حالت میں تبدیلی جائز نہیں۔ یوں ہماری مکمل ترقی اسی طرح ہو سکتی ہے جس طرح اس سے قبل ہوئی تھی۔

یہاں بعض اہل قواعد اور افکار کا ذکر کرنا بے محل نہیں ہوگا، جن کو ذہن میں راسخ کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ ان قواعد کی مثالیں یہ ہیں:

”جہاں شرع ہوگی وہی مصلحت ہے، اس کے برعکس نہیں۔“، ”افعال میں اصل حکم شرعی کی پابندی ہے۔“، ”اشیاء کی اصل اباحت ہے، جب تک کوئی شرعی دلیل وارد نہ ہوئی ہو۔“، ”حسن وہ ہے جسے شرع حسن قرار دے اور قبیح وہ ہے جسے شرع قبیح قرار دے۔“، ”خیر وہ ہے جو اللہ کو راضی کرے اور شر وہ ہے جو اللہ کو ناراض کرے۔“، ”شرع کے آنے سے پہلے کوئی حکم نہیں۔“، ”جو اللہ کے ذکر سے اعراض کرے تو اس کی زندگی تنگ ہو جائے گی۔“، ”امت مسلمہ دوسرے لوگوں کے علاوہ ایک ہی امت ہے۔“، ”اسلام و طہنیت، قومیت، اشتراکیت یا جمہوریت کو برقرار نہیں رکھتا۔“، ”اسلام ایک منفرد طرز زندگی ہے جو دیگر طرزہائے زندگی سے کلی طور پر مختلف ہے۔“

جس طریقے پر سلف صالحین کا رہند تھے، بعض شرعی نصوص اس کی پابندی کی اہمیت پر واضح دلالت کرتی ہیں اور یہ کہ اس کو چھوڑ کر بدعت کی طرف نہیں جانا چاہئے، کیونکہ دین میں ہر نئی چیز انتہائی مذموم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((وقد ترکت فیکم ما إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبداً، أمراً بیناً، کتاب اللہ و سنة نبیہ)) (سیرت ابن ہشام) ”میں نے تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑی کہ جب تک تم اس کو مضبوطی سے تھامے رہو گے ہر گز گمراہ نہیں ہو گے وہ ایک واضح چیز ہے، یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔“

اور (ابدأ) کے لفظ میں ہم بھی داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: ((... و تفرق أمتی علی ثلاث و سبعین فرقة کلها فی النار إلا واحدة قالوا: ومن ہی یا رسول اللہ؟ ما أنا علیہ و أصحابی)) (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، ابن

حنبل) ”میری امت ستر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے۔ عرض کیا گیا وہ ایک کونسا ہو گا؟ فرمایا: جس پر میں اور میرے صحابہؓ ہیں۔“

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((ترکتکم علی المحجة البيضاء لا یزیغ عنها بعدي إلا کل ضال)) (ابن ماجہ وابن حنبل) ”میں نے تمہیں ایک روشن راستے پر چھوڑا ہے میرے بعد صرف وہ اس سے ہٹ جائے گا جو گمراہ ہو گا۔“

فرمایا: ((خیر الناس قرنی ثم الذین یلونہم، ثم الذین یلونہم...)) (مسلم) ”بہترین لوگ میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر اس کے بعد والے پھر ان کے بعد والے۔“

مزید فرمایا: ((إنه من یعش منکم فسیری اختلافاً کثیراً. وإیاکم ومحدثات الأمور فإن کل محدثة بدعة، و کل بدعة فی النار. علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدين المہدیین، عضوا علیہا بالنواجذ)) (ابوداؤد، ترمذی) ”جو تم میں زندہ رہا وہ بہت اختلاف دیکھے گا۔ تم نئی باتوں سے پرہیز کرو کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہوتی ہے، ہر بدعت جہنم میں پہنچا دیتی ہے۔ تم میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی کرو، اسی کو دانتوں سے پکڑے رکھو۔“

فرمایا: ((کل عمل لیس علیہ أمرنا فهو رد)) (بخاری و مسلم) ”ہر وہ کام مردود ہے جس کے لیے ہمارا حکم نہیں۔“

ان احادیث میں اچھے طریقے سے پیروی اور بدعات سے اجتناب کی دعوت ہے، بہتری کی ترتیب اس بات کی دلیل ہے کہ جوں جوں رسول اللہ ﷺ کا زمانہ دور ہوتا رہے گا،

احکامات کا التزام ضعیف تر ہوتا جائے گا، اس وجہ سے زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ خیر کو زیادہ مضبوطی سے تھامنا چاہیے اور صحیح کی زیادہ جستجو ہونی چاہیے۔ اخلاص کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ جب ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو زیادہ مضبوطی سے تھامیں اور ہم اسی راستے پر چلیں جس پر رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ چلے، تو ہم پر لازم ہے کہ دین میں نئی چیزیں ایجاد نہ کریں، کیونکہ ایسا کرنے والا مردود ہوتا ہے، اب ہمارے زمانے میں اس کا کیا طریقہ ہو گا؟۔ یہ اس طرح ہو گا کہ:

1. ہم اپنے صاف ستھرے اسلامی عقیدے کی حفاظت کریں، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہونے پائے۔

2. ہم اسلام کے چشمہ صافی سے اپنی تشنگی بجھانے کا سامان کریں۔

3. ہم استدلال کے اس ثابت شدہ طریقے کی حفاظت کریں جس میں رائے اور نفسانی خواہشات حکم شرعی پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔

4. ہم اپنی زندگی میں اسلام ہی کو اہم ترین چیز سمجھیں: اسے اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے مفاد اور خواہش سے زیادہ اہم سمجھیں تاکہ ہمارے دلوں میں بھی اللہ کا کلمہ بلند ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے آگے نہ چلیں، ہم ایسے ہی بن جائیں جو سلف صالحین کے زمانے کا حال تھا۔

5. اپنے دل اور عقل سے کفر افکار اور کفر کی گندگی کو کھرچ کر صاف کریں۔ جیسا کہ صحابہؓ نے اسلام کی چوکھٹ پر جاہلیت کی گندگی کو اتار پھینکا تھا اور صاف ستھرے ہو کر اس میں داخل ہوئے تھے۔

اس کا تقاضا ہے کہ ہم بالکل شروع کی طرح بن جائیں کیونکہ اس امت کے آخر کی بھی اسی سے اصلاح ہوگی جس سے پہلے کی ہوئی۔ یہ ایسی لازمی چیز ہے کہ مسلمان اپنی زندگی کے مراحل میں کسی بھی مرحلے میں اس سے مستغنی نہیں ہو سکتے، اسی سے قربت یا دوری کے لحاظ سے مسلمان طاقتور یا کمزور ہو سکتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد ہم یہ سوال کرتے ہیں کہ تدرج کیا ہے؟ اس کی بات کرنے والوں کی نظر میں اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کے وجوہ جواز کیا ہیں؟ اس کے بارے میں شرع کا موقف کیا ہے؟

تدرج کا مطلب یکبارگی نفاذ کے بجائے کئی مراحل سے گزر کر بتدریج مطلوبہ شرعی حکم تک پہنچنا ہے، اس قسم کی رائے رکھنے والوں کے ہاں اس کو مرحلہ وار کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مسلمان پہلے ایسے حکم کو نافذ کرے، یا اس کی طرف دعوت دے جو کہ غیر شرعی ہے، لیکن اپنے سے پہلے حکم کے لحاظ سے شرع سے زیادہ قریب ہے، پھر آہستہ آہستہ ایک اور ایسے غیر شرعی حکم کو نافذ کرے گا یا اس کی طرف دعوت دے گا جو ان کی نظر میں پہلے کے لحاظ سے شرعی حکم کے زیادہ قریب ہے، پھر ایک اور ایسے غیر شرعی حکم کو نافذ کرے گا یا اس کی طرف دعوت دے گا جو ان کی نظر میں پہلے حکم کے مقابلے میں شرعی حکم کے زیادہ قریب ہو، یوں آہستہ آہستہ وہ شرعی حکومت تک پہنچ جائے گا۔

یعنی اس طرح احکام شرعیہ کو نافذ کیا جائے اور غیر شرعی احکامات کے بارے میں سکوت اختیار کیا جائے، یہاں تک کہ شرع کو مکمل طور پر نافذ کر دیا جائے۔

لیکن یہ تدرج کتنے مراحل پر مشتمل ہوگی اس کی کوئی تعداد مقرر نہیں۔ اس رائے والوں کے ہاں اس کے لیے کوئی قاعدہ بھی نہیں اس کے لیے ایک یا دو یا تین یا اس سے بھی زیادہ مراحل ہو سکتے ہیں۔ اس تدرج کے مراحل کے تعین میں حالات و ظروف کا بڑا اثر ہے حالات کے لحاظ سے یہ مراحل کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں اور اسی طرح اس کی مدت تھوڑی یا زیادہ ہو سکتی ہے۔

تدریجی فکر کا اطلاق عقیدے سے متعلق بعض افکار پر بھی ہوتا ہے جیسے کہ اس بات کو قبول کرنا کہ ”اشتراکیت اسلام ہی سے نکلا ہے۔“ یا ”جمہوریت اسلام ہی ہے۔“ اس طرح یہ بعض مراحل میں احکام شرعیہ پر مشتمل ہوتی ہے، جیسے مسلمان عورت ایسا لباس پہنے جس میں اس کا کپڑا گھٹنوں سے ذرا نیچے ہو، یہاں تک کہ اگلے مرحلے میں مطلوبہ حکم شرعی نافذ کیا جائے۔ کبھی اس کا تعلق نظام سے ہوتا ہے، جیسے حکومت میں شرکت کرنا، حالانکہ شرعاً یہ بالکل حرام ہے۔ اس کا اعتراف تو خود تدرج کی رائے رکھنے والے بھی کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس شرکت کو مقصود بالذات نہیں کہتے، بلکہ کہتے ہیں کہ یہ اگلے مرحلے میں اصل اسلامی حکومت تک پہنچنے کے لیے ہے جو کہ فرض ہے۔ یا یہ تدرج بعض اسلامی احکامات پر عمل اور بعض کے بارے میں سکوت اختیار کرنے پر مشتمل ہوتا ہے، اس امید پر کہ جب اسلامی احکامات اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ دیگر افکار پر یورش کر دیں تو ان کو بالادستی حاصل ہو کر سب پر عمل کیا جائے گا۔ اسی طرح بعض دفعہ دعوت کے متعلق بھی یہی کہتے ہیں۔ یعنی تدرج کو کافی سمجھنے

والا اسی اسلوب کو لازم پکڑے ہوئے ہوتا ہے اور اسی اسلوب کی طرف دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ اس قسم کی تدریجی دعوت کی وجہ بعض دفعہ تقویٰ ہوتا ہے کہ خود تو التزام کا خیال رکھتا ہے، لیکن دوسروں کے بارے میں حرص کر کے کہ کہیں اسلامی احکامات کی دعوت کو بالکل ٹھکرا ہی نہ دیں یہ سمجھتا ہے کہ بالکل کچھ نہ ہونے سے تھوڑا بہت ہونا ہی بہتر ہے۔

### تدریج اور مرحلہ وار کام کی بات کرنے والوں کے بہانے اور اس کا جواب:

اس رائے کے حامل افراد نے اپنی اس بات پر اعتماد کیا کہ مذکورہ وجوہات اس فکر اور اسلامی دعوت میں ان کے فہم کی تائید کرتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں نے اپنے ان بہانوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا اور راستے سے ہٹ گئے۔ یہ نص کی پیروی نہیں کرتے، بلکہ نص کو اپنی خواہش کے تابع کر دیتے ہیں، وہ مذکورہ بہانے یہ ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ نے سود کو ایک ہی مرتبہ حرام قرار نہیں دیا۔ بلکہ اس کی حرمت کئی مرتبہ اور مرحلہ وار نازل ہوئی۔ ارشاد ہے: ﴿وَمَا آتَيْنَا مِّن رَّبًّا لِّيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوَ عِنْدَ اللَّهِ وَمَا آتَيْنَا مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾ {الروم: 39} ”اور یہ جو تم سود دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں شامل ہو کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں ہے اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو تو جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ ہیں جو (اپنے مال کو) کئی گنا بڑھا دیتے ہیں۔“

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ (آل عمران: 130) ”تم سود کو دوچند کر کے مت کھایا کرو۔“

مزید فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ (بقرہ: 278) ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو۔“

مزید فرمایا: ﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ﴾ (النساء: 161) ”اور ان کا سود لینا حالانکہ ان کو منع کر دیا گیا ہے۔“

مزید فرمایا: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ {البقرة: 275} ”اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔“

ان اجمالی آیات کو دلیل بنا کر یہ کہتے ہیں کہ پہلی آیات کی وجہ سے سود مباح تھا۔ پھر دوسری آیت میں دوچند سود کھانے کی حرمت نازل ہوئی، جب کہ کم مقدار کو رہنے دیا گیا۔ پھر تیسری آیت میں یہ کہہ کر ﴿وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ {البقرة: 278} تھوڑی مقدار کو بھی حرام قرار دیا گیا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ سود کی حرمت صراحت سے نہیں بلکہ اشارۃً ہے جیسا کہ چوتھی آیت میں یہود کی حکایت بیان کی گئی ہے۔ پھر ان مراحل کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر سود کو حرام قرار دیا کہ: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ {البقرة: 275} ”اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا۔“



ان آیات کو صحیح شرعی نقطہ نظر سے دیکھنے سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ تدرج کے لیے ان کو دلیل بنانا سراسر غلط ہے۔

پہلی آیت کا اس ربا سے جو کہ حرام ہے دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ اس کا موضوع ہبہ اور ہدیہ ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ جو شخص ہبہ یا ہدیہ دے کر اس کے دو چند کا طلب گار ہوتا ہے یا لوگوں سے اس کو واپس مانگتا ہے، تو یہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا، یعنی اس پر ثواب نہیں ملے گا حالانکہ صدقہ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ((من تصدّق بعدل تمرة من کسب طیب، ولا یقبل الله إلا الطیب. وان الله یتقبلها بيمينه ثم یربّیها لصاحبها کما یربّی أحدکم فلوہ حتی تكون مثل الجبل)) (البخاری) ”رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر صدقہ کرے اور اللہ تعالیٰ صرف حلال کمائی کے صدقہ کو قبول کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر صدقہ کرنے والے کے فائدے کے لیے اس میں زیادتی کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اپنے جانور کے بچے کو کھلا پلا کر بڑھاتا ہے، تا آنکہ اس کا صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔“

اسی طرح ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آیت: ﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِّنْ رَّبًّا﴾ {الروم 39} کے معنی ہیں کہ جب کوئی شخص ہدیہ دیتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اس سے بہتر اس کو ملے گا، تو یہ اللہ کے نزدیک بڑھتا نہیں، اس کے مالک کو اجر نہیں ملتا، لیکن وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ آیت اس معنی میں نازل ہوئی ہے (امام قرطبیؒ نے اس کو نقل کیا ہے) ابن کثیرؒ نے فرمایا: جو شخص لوگوں کو یہ سوچ کر عطیہ دیتا ہے کہ یہ زیادہ ہو کر واپس ملے گا، تو اللہ کے

نزدیک اس کا کوئی ثواب نہیں، اس آیت کی یہ تفسیر ابن عباسؓ، مجاہدؓ، ضحاکؓ، قتادہؓ، عکرمہؓ، محمد بن کعب نے بھی کی ہے۔ اس طرح کرنا مباح ہے۔

ابن عباسؓ نے کہا کہ ”ربا کی دو قسمیں ہیں: ایک تجارت کی ربا جو کہ صحیح نہیں۔ دوسرا ربا جس میں کوئی برائی نہیں کہ ایک آدمی کا ہدیہ دینا جو کہ زیادہ یا دوچند کا طلب گار ہو۔“

دوسری آیت یعنی: ﴿لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً﴾ (آل عمران: 130) ”تم سود کو دوچند کر کے مت کھایا کرو۔“

مزید فرمایا: اس میں دوچند سود کھانے کو منع کیا گیا ہے، جو کہ جاہلیت میں کھایا جاتا تھا۔ اس میں ربا کی حرمت کو مقید کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔

مفسرین نے کہا ہے کہ سورہ بقرہ جس میں ربا کی حرمت بیان کی گئی ہے، پہلی سورہ ہے، جو مدینے میں نازل کی گئی۔ سورہ آل عمران جس میں دوچند سود سے منع کیا گیا ہے، اس کے بعد نازل ہوئی، اس لیے یہ بات بالکل غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑے سود کھانے کو مباح رکھا ہے۔ اس وجہ سے سورہ آل عمران میں جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا تدریج سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں ربا کے بارے میں کفار کی عادت کو بیان کیا گیا ہے۔ ربا کی حرمت کا حکم تو پہلے ہی نازل ہو چکا تھا۔

جہاں تک تیسری آیت کا تعلق ہے کہ : ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا﴾ (بقرہ: 278) ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور باقی ماندہ سود چھوڑ دو۔“

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے مسلمانوں کو تھوڑے سود کی اجازت دی گئی، پھر اس سے منع کیا گیا۔ بلکہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو ایمان لائے اور ان کے دوسرے لوگوں پر سود کے اموال تھے۔ انہوں نے سود کے کچھ حصے پر قبضہ کیا تھا اور کچھ باقی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سود کو معاف فرمایا، جس کو انہوں نے لیا تھا اور اس حصے کو حرام قرار دیا جو باقی تھا۔

اس کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی ہوتی ہے: ﴿وَإِنْ تَبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ {البقرة : 279} ”اگر تم توبہ کرو تو تمہارا اس المال (اصل مال) تمہیں ملے گا، تم ظلم نہ کرو اور تم پر بھی ظلم نہیں ہوگا۔“

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا یہ قول کہ : ((ألا إن ربا الجاهلية موضوع كله. وأول ربا أبتدء به ربا العباس بن عبد المطلب)) (سیرت ابن ہشام) ”سنوجاہلیت کا سارا سود ختم ہے اور پہلا سود جس سے میں شروع کرتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔“

چوتھی آیت کہ : ﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ {النساء : 161} ”اور سود لیا کرتے تھے حالانکہ انہیں اس سے منع کیا گیا تھا

اور لوگوں کے مال ناحق طریقے سے کھاتے تھے۔“ اس آیت میں ربا سے مقصود حرام مال ہے جیسے رشوت وغیرہ جو یہود کھاتے تھے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَكْلُوْنَ لِلْسُّحْتِ﴾ {المائدة: 42} ”جی بھر بھر کر حرام کھانے والے ہیں۔“ یہاں مراد وہ ربا نہیں جس کی شرعی تعریف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سود شروع ہی سے حرام ہے۔ اس کے مرحلہ وار حرام ہونے کی کوئی دلیل موجود نہیں۔ اس موضوع کے بارے میں وارد ہونے والی نصوص مختلف حقیقتوں کے لیے ہیں۔ اس میں کوئی ایسی دلیل نہیں جو تدرج پر دلالت کرے۔

2- ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شراب کو مرحلہ وار حرام قرار دیا: ارشاد ہے کہ: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾ {البقرة: 219} ”لوگ آپ سے سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ بھی ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ اور ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑھا ہوا ہے۔“

مزید ارشاد ہے کہ: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَى﴾ {النساء: 43} ”اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا، جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔“ مزید فرمایا: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رَجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ (١) ”إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ﴾ {المائدة: 90-91} ”اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوئے

کے تیر، یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض کے بیج ڈال دے، اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے۔ سوا ب بھی باز آجاؤ۔“

ان آیتوں کے اجمال کی وجہ سے تدرج کے قائل لوگوں نے یہ سمجھا کہ شراب ابتدا میں مباح تھی، جس کی دلیل پہلی آیت ہے، پھر اس اباحت کو محدود کرنے کے لیے اللہ کا یہ قول نازل ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ﴾ {النساء: 43} ”اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا، جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔“ اس تجدید کے بعد پھر شراب سے منع کیا گیا۔

ان آیات میں تشریعی طور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شراب کی حرمت میں کوئی تدریج نہیں، حرمت سے قبل شراب کے بارے میں کوئی حکم نہیں تھا۔ یعنی اس کو اباحت ہی پر چھوڑا گیا تھا، یعنی لوگوں کے شراب پینے کے باوجود شرع شراب کے بارے میں خاموش تھی۔ یہاں تک کہ تیسری آیت نازل ہوئی۔ سیدنا عمر بن الخطابؓ کے اس واقعہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جب آپ نے فرمایا: ”اے اللہ شراب کے بارے میں شافی اور کافی بیان نازل فرما کیونکہ اس سے مال اور عقل دونوں جاتے ہیں۔“ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ {البقرة: 219} ”لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔“ تب عمرؓ کو بلا کر یہ آیت ان کو سنائی گئی، تو آپ نے پھر فرمایا اے اللہ شراب کے بارے میں شافی اور کافی بیان نازل فرما، تو یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يَا

أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ ﴿النساء: 43﴾ ”اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو اس وقت تک نماز کے قریب بھی نہ جانا، جب تک تم جو کچھ کہہ رہے ہو اسے سمجھنے نہ لگو۔“ پھر عمرؓ کو بلا کر یہ آیت ان کو سنائی گئی تو فرمایا اے اللہ شراب کے بارے میں شافی اور کافی بیان نازل فرما۔ پھر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ-----﴾ **فهل انتم منتھون﴾ {المائدہ: 90-91}** ”اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے تھان اور جوئے کے تیر، یہ سب ناپاک شیطانی کام ہیں، لہذا ان سے بچو، تاکہ تمہیں فلاح حاصل ہو۔“ پھر عمرؓ کو بلا کر یہ آیت سنائی گئی۔ جب پڑھنے والا (فهل انتم منتھون) ”کیا تم ان سے رُکنے والے ہو“ پر پہنچ گیا تو فرمایا: ”ہم رُک گئے ہم رُک گئے۔“ (احمد، ترمذی، نسائی، ابوداؤد) سیدنا عمرؓ شراب کے بارے میں شافی بیان کے نزول کی دعا کرتے رہے، پہلی اور دوسری آیت کے نزول کے بعد بھی مباح تھی، ان دو آیتوں کے نزول کے باوجود آپ دعا کرتے رہے، یہاں تک کہ تیسری آیت نازل ہوئی جس میں شراب کی حرمت بیان کی گئی۔

دوسری آیت کا تعلق نماز سے ہے شراب سے نہیں۔ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔ اسی آیت کو باریک بینی سے دیکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو نماز کے وقت شراب پینے سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ ان کو معلوم ہو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد اگر کسی مسلمان نے اس حال میں نماز پڑھی ہو کہ شراب کی بو اس کے منہ سے آرہی ہو، یا اس کے

پاس شراب کی بوتل ہو یا اتنی شراب پی ہو جو عقل کو نقصان نہ پہنچاتی ہو، تو اس پر کوئی گناہ نہیں تھا۔

پہلی آیت میں اللہ سبحانہ تعالیٰ نے نقصان دہ ہونے کی وجہ سے شراب کی مذمت کی۔ دوسری آیت میں نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا۔ تیسری آیت میں شراب کو حرام قرار دیا گیا۔ اس کو تدرج نہیں کہا جاتا۔ کبھی کسی نے شراب کی حرمت کے بعد اس کو حلال نہیں سمجھا، یعنی ماندہ کی آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ کے عہد میں صحابہ کرامؓ کے عہد میں، تابعین اور نہ ہی تبع تابعین کے عہد میں کسی نے اس کو حلال سمجھا، نہ ہی امت کے بڑے بڑے مجتہدین کی فقہی کتابوں میں شراب کی حرمت کی تدرج کا کوئی ذکر ہے۔ بے شمار اسلامی فتوحات ہوئیں، کئی ممالک کو فتح کیا گیا، لوگ جوق درجوق اللہ کے دین میں داخل ہوتے رہے۔ مسلمان فاتحین نے اسلام میں نئے داخل ہونے والوں کے ساتھ یہ رعایت نہیں کی اور شراب کو ان کے لئے یہ انتظار نہیں کیا کہ وہ ایک دفعہ ان مراحل سے گزریں جن میں شراب کو حرام کیا جاتا رہا، پھر آخر میں ان پر حرمت شراب کا حکم نافذ کیا جائے۔ اگر یہ بات ٹھیک ہوتی تو ان کو اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ سابقہ فاضل علماء کرام نے تدرج پر کوئی بحث نہیں کی، بلکہ یہ ایک نئی بحث ہے جس کو حالات و واقعات نے چھیڑ دیا ہے، جیسا کہ کچھ نام نہاد علماء نے یہی کہا ہے جس کو یہ لوگ تفکیر کے لیے منہج بنانا چاہتے ہیں، یہ صرف بعض احکامات کے بارے میں نہیں کہتے بلکہ پورے دین کے بارے میں کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک صحیح حدیث ہے کہ: ((إِنَّهُ مِنْ يَعْشُ مِنْكُمْ فِسِيرِي اخْتِلَافًا كَثِيرًا. وَإِيَّاكُمْ وَمَحَدَّثَاتِ الْأُمُور فَإِنْ كُلَّ مُحَدَّثَةٍ بَدْعَةٍ، وَكُلَّ بَدْعَةٍ فِي النَّارِ. عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمُهْدِيِّينَ، عَصُوا عَلَيْهَا بِالْوَجَدِ)) ”تم

میں جو زندہ رہا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا، تم نئی باتوں سے بچتے رہو کیوں کہ ہر نئی بات بدعت ہوتی ہے اور ہر بدعت جہنم میں ہوتی ہے میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت مضبوطی سے تھام لو اس کو داڑھ سے پکڑ لو“ (ترمذی، ابوداؤد)

تدرُج کے علمبرداروں سے یہ سوال ہے کہ کیا احکام میں تدرج کی وجہ سے اس کے پہلے حکم پر عمل کرنا ہمارے لیے جائز ہے؟

قطعی جواب: نہیں۔ کیونکہ شراب کی حرمت کا حکم قطعی ہے، اس لیے پہلے حکم کی طرف رجوع بالکل جائز نہیں۔ خلف و سلف اسی پر قائم ہیں۔ آج شراب کا ایک ہی حکم ہے جو کسی بھی صورت حال میں تبدیل نہیں ہوتا۔ نہ ہی شراب خور سے گناہ ساقط ہوگا۔

3۔ ان کا یہ کہنا کہ شرع نے رق (غلامی) کے احکام کو تدرج سے حل کیا۔ یہ بھی باطل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غلامی کی موجودگی کو حرام قرار نہیں دیا، بلکہ اس کے لیے راستے نکالے۔ غلامی کا وجود دوبارہ ہوگا تو اس کے احکامات بھی ہوں گے۔ اور عنقریب ایک بار پھر غلام ہونگے۔

4۔ ان کا یہ کہنا کہ قرآن بھی الگ اور تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ یک مشئت نازل نہیں ہوا یہ بھی تدرج کی دلیل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حالات و واقعات کے مطابق آیتیں نازل فرماتے تھے تاکہ دل ان کو قبول کریں۔ اس لیے سب سے پہلے ایمان، جنت اور جہنم کے بارے آیتیں نازل ہوئیں، پھر حلال و حرام کے بارے آیتیں نازل ہوئیں۔ ایسا اسلام کے ایک جزو کو اختیار کر کے دوسرے جزو کو ترک کرنا نہیں۔ مسلمان اس حد تک ذمہ دار ہوتے تھے جتنے احکام نازل ہوئے تھے۔ ان کی ذمہ داری اس سے آگے نہیں ہوتی تھی۔ جس



وقت ایمان نازل ہوا تھا اور احکامات نازل نہیں ہوئے تھے۔ تب بھی مسلمان پورے اسلام کے بارے میں ذمہ دار تھے۔ مگر اسی تفصیل کے مطابق جس کی وضاحت نصوص شرعیہ نے کی۔ اس لیے انفرادی شرعی احکامات کے بارے میں مسلمان ہر حال میں ذمہ دار ہیں، خواہ اسلامی ریاست موجود ہو یا نہ ہو۔ ہاں وہ شرعی احکامات جن کی ادائیگی ریاست کے سپرد ہے ان کا تعلق ریاست سے ہے۔ یہی تقسیم مسلمانوں کے لیے لازم ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ پھر پیچھے کی طرف نہیں دیکھا جائے گا۔ تدرج کے معنی کی چھان بین اور تحقیق اور اس رائے کے حاملین کے نزدیک اس کے وجوہ جواز کو بیان کرنے کے بعد اب ہم صحیح شرعی رائے اور شرعی طریقہ فکر کو بیان کریں گے۔

میں نے صحیح رائے کہا صحیح کے قریب ترین رائے نہیں کہا، کیونکہ تدرج کی مذکورہ فکر شرع سے نہیں۔ اس کی شرع کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں۔ تدرج کے بارے میں مسئلہ یہ نہیں کہ: کیا یہ حکم شرعی ہے یا نہیں، بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایسا طریقہ فکر ہے جس کو شریعت کسی حالت میں بھی جائز قرار نہیں دیتی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی فطرت دوسروں سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی نظام طبعی طور پر صرف وحی کی پیروی پر قائم ہے۔ جبکہ موجودہ نظام انسان کے ایجاد اور تجربات پر قائم ہے، یہ جتنا بھی مضبوط ہو انسان کی تمام مشکلات کا صحیح حل نہیں دے سکتا۔

مسلمان جب شرع کی پابندی کرتا ہے تو اس پابندی کی اساس ایمان باللہ ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ پابندی مقبول نہیں، اس طرح جب دوسروں کو اسلام کی طرف دعوت دے

تو اس کی دعوت کی بنیاد ایمان باللہ ہونا چاہیے، ورنہ وہ دعوت قبول نہیں۔ اس مسئلے میں ایمان پہلی اور صحیح طریقے سے شرع کی پابندی دوسری چیز ہے۔

مسلمان کے لیے خود بدلنے اور نظاموں کو صحیح طرح تبدیل کرنے کے لیے روحانی اساس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پہلے اس کو پیدا کرے پھر اس کو اختیار کرے، پھر شرع کی پابندی آسان ہو جائے گی، قطع نظر اس کے کہ وہ لوگوں کی حقیقت یا ان کی طبیعت یا ان کی خواہشات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ شرع کی پابندی میں مسلمان کی طرف سے روحانی بنیاد پر عدم اعتماد اگر اس کو کفر تک نہ لے جائے تو اس کو کم از کم بڑے گناہوں میں مبتلا کر ہی دے گا۔ اسلام روحانی اساس پر قائم ہے یعنی ایمان باللہ پر قائم ہے اس لیے اس اساس سے قربت یا دوری کے بقدر ہی انسان اسلامی احکام کی پابندی کے قریب یا دور ہوتا ہے۔

اب ہم تدرج کے علمبرداروں سے سوال کرتے ہیں کہ تمہاری اس دعوت میں روحانی پہلو کہاں ہے؟۔ بلکہ اس کے بارے میں اللہ کا حکم کہاں ہے؟۔ سخت ترین مجبوری کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے مکہ یا مدینہ میں اس کو کیوں اختیار نہیں کیا؟

کیا طلب نصرہ کے وقت رسول اللہ ﷺ نے بنو عامر بن صعصعہ سے نہیں فرمایا تھا کہ: **((الأمر لله يضعه حيث يشاء))** ”یہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہ جس کو چاہے دے۔“ (سیرت ابن ہشام)

انہوں نے اس شرط پر نصرۃ دینے کا مطالبہ کیا تھا کہ آپ ﷺ کے بعد حکومت ہماری ہوگی، حالانکہ اس وقت نصرۃ کی کتنی ضرورت تھی۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ ان کو ہاں میں جواب دیا جاتا پھر وہ ایمان لاتے، تو ان کا مطالبہ بدل جاتا؟ یا یہ ایسی سچی دعوت اور ربانی

حکم ہے جس کی وجہ سے آپ ﷺ اپنی بات بغیر کسی مداہنت اور جھجک کے کرتے، تاکہ جو بھی زندہ رہے تو دلیل سے اور جو بھی ہلاک ہو تو دلیل سے۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب سے جب وہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور تھوڑی نرمی کرنے کا مطالبہ اور ایسے کام نہ کرنے پر زور دیا، جس کی طاقت نہ ہو کیا آپ ﷺ نے ان سے نہیں فرمایا: ((وَاللّٰهُ يٰۤاَعْمَاهُ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسُ فِي يَمِينِيْ وَ الْقَمَرُ فِيْ يَسَارِيْ عَلٰى اَنْ اَتْرَكَ هٰذَا الْاَمْرَ مَا تَرَكْتَهُ حَتّٰى يَظْهَرَهُ اللّٰهُ اَوْ اَهْلَكَ دُونَهُ)) ”اے چچا اللہ کی قسم! اگر یہ لوگ (مشرکین مکہ) سورج کو میرے داہنے ہاتھ میں رکھیں اور چاند کو بائیں میں پھر یہ کہیں کہ اس کام کو چھوڑ دو، تب بھی میں اس کو نہیں چھوڑوں گا یہاں تک کہ اللہ اس کام کو غلبہ عطا کر دے یا میں اس کام کو کرتے کرتے ہلاک ہو جاؤں گا۔“ (سیرت ابن ہشام)

رسول اللہ ﷺ کی جانب سے یہ صراحت معمولی سودے بازی کو بھی قبول نہ کرنے کی دلیل ہے۔ دعوت کے میدان میں یہ بہترین مثال ہے۔ نہ کوئی مداہنت، کوئی چشم پوشی یا زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، نہ ان لوگوں کی چاپلوسی کی جو اہل قوت تھے بلکہ آپ ﷺ کی دعوت صریح اور جرات مندانہ تھی، جو صحیح فکر پیدا کرتی تھی جس سے باطل کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔

کیا ایسی جگہ سے جہاں مسلمان فرائض ادا نہیں کر سکتے، اللہ نے ان کو ایسی جگہ ہجرت کرنے کا حکم نہیں دیا جہاں وہ فرائض کو ادا کر سکتے ہیں؟ اور اسی جگہ رہنے کو حرام قرار نہیں دیا؟ جیسا کہ ارشاد ہے کہ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفَّاهُمْ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْٓا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْٓا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ

وَأَسِئَةً فَتَهَا جُرُؤًا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ النساء

{97: " جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، اور اسی حالت میں فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئے تو بولے " تم کس حالت میں تھے؟ " وہ کہنے لگے کہ " ہم تو زمین میں بے بس بنادئے گئے تھے۔ " فرشتوں نے کہا " کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ " لہذا ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ نہایت برا انجام ہے۔ " (النساء: 97)

ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ جہاں مسلمان اسلام پر عمل نہیں کر سکتا وہیں اقامت اختیار کرنا اس کے لیے حرام ہے۔

کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز لالہ 'الا اللہ محمد رسول اللہ' سے نہیں کیا؟۔ اور یہ بھی اپنی ہی قوم سے شروع کیا۔ آخر تک بغیر کسی تبدیلی کے آپ ﷺ اسی پر قائم رہے۔ کیا شروع میں اس سے چھوٹا کوئی کام کیا جو تدریجاً یہاں تک پہنچا؟ یا اول سے آخر تک آپ ﷺ کی یہی دعوت تھی۔

کیا ابو بکرؓ نے زکوٰۃ کا انکار کرنے والوں سے قتال نہیں کیا؟، ان کو کوئی مہلت دی نہ ہی ان کی دل شکنی کا خیال رکھا، آپؐ نے اس موقع پر یہ مشہور جملہ کہا تھا: (واللہ لو منعونی عقال بعیر کانوا یؤدونہ لرسول اللہ لقاتلتہم علیہ) ”اللہ کی قسم اگر یہ لوگ اونٹ کی ایک رسی زکوٰۃ میں دینے سے بھی انکار کریں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں دیتے تھے تو میں اس وجہ سے ان سے قتال کروں گا“۔ حالانکہ اس زمانے میں لوگ مرتد ہو رہے تھے اور سرکشی عام ہو رہی تھی یعنی اس قسم کے فیصلے کے لئے حالات انتہائی ناسازگار تھے۔

کیا اولین مسلمانوں نے دعوت میں اس طریقے کو اختیار کیا؟۔ کیا علاقوں کو فتح کرتے ہوئے دارالکفر کو دارالاسلام میں تبدیل کر کے اور اسلام کو نافذ کرتے ہوئے تدریج سے کام لیا گیا؟ اولین مسلمانوں نے اس وقت کے نومسلموں کے ساتھ بھی تدریج کا معاملہ نہ کیا۔ یہ کہہ کر ان کو شراب پینے کی اجازت نہیں دی کہ پہلے ان کے دل موہ لیے جائیں، یا سود اور بے پردگی کی اجازت دی بلکہ وہ اسلام میں پورا داخل ہوتے تھے، اس لیے وہ سود، زنا، شراب اور تمام حرام کاموں سے اجتناب کرتے تھے۔ وہ اپنے سے متعلق احکام شرعیہ خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی یا عینی فرائض اور فرض کفایہ سب کو ادا کرتے تھے۔

کیا فقہ کی بنیادی کتابوں میں یہ موضوع موجود ہے؟، کیا ہمارے اولین قابل اعتماد مجتہد فقہانے تدریج کی طرف ادنیٰ اشارہ بھی کیا؟، حالانکہ انہوں نے شرعی کلیات اور جزئیات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

پوری شریعت دعوت کی سچائی کے ساتھ آرائشی اور طریقے کی درستگی پر دلالت کرتی ہے:

﴿الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَهُ عِوَجًا ۖ قَيِّمًا لِّيُنذِرَ بَأْسًا شَدِيدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ الَّذِينَ يَعْمَلُونَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْرًا حَسَنًا﴾ {الكهف: 2-1}

”تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کسی قسم کی کوئی خامی نہیں رکھی، ایک سیدھی سیدھی کتاب جو اُس نے اس لئے نازل کی ہے کہ لوگوں کو اپنی طرف سے ایک سخت عذاب سے آگاہ کرے اور جو مومن نیک عمل کرتے ہیں اُن کو خوشخبری دے کہ اُن کو بہترین اجر ملنے والا ہے۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہمیں خبر دی ہے کہ کفار مسلمانوں سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ان سے مداہنت کریں، ان کے ساتھ چلیں، حق سے دستبردار ہو جائیں اور ان کے جزوی اور وقتی

حل کو قبول کر کے کفر کی ابتداء کریں۔ ارشاد ہے: ﴿وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ...﴾ {البقرة: 109} ”(مسلمانو!) بہت سے اہل کتاب اپنے دلوں کے حسد کی بنا پر یہ چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لانے کے بعد تمہیں پلٹا کر پھر کافر بنادیں۔“

ایک جگہ ارشاد ہے: ﴿وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ﴾ {القلم: 9} ”یہ چاہتے ہیں کہ تم ذرا ڈھیلے ہو تو وہ بھی ڈھیلے پڑ جائیں گے“ ﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ﴾ {القلم: 8} ”لہذا تم ان کی باتوں میں نہ آنا جو تمہیں جھٹلا رہے ہیں۔“

ہمارے رب نے ہمیں ظالموں کی طرف جھکنے سے ڈرایا ہے: ﴿وَلَا تَزْكُنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ﴾ {ہود: 113} ”اور (مسلمانو!) ان ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کہیں دوزخ کی آگ تمہیں بھی آپکڑے، اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے دوست میسر نہ آئیں گے۔“

خالص ایمان کی طرف خالص دعوت کا تقاضا ہے کہ مسلمان اگرچہ نو مسلم ہو پورے اسلام پر عمل کرے۔ دعوت کے علمبردار ہونے کی حیثیت سے ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم لوگوں کے دلوں میں ایمان کا بیج بودیں، اس کا اہتمام کریں تاکہ التزام اور تقویٰ کے لحاظ سے سب سے زیادہ عمدہ اور شیریں پھل دے۔ اسلامی ریاست جب قائم ہوگی وہ چند فارغ یا مغربی ثقافت کے دلدادہ افراد کے ذریعے قائم نہیں ہوگی۔ نہ ہی ان لوگوں کے ذریعے قائم ہوگی جن پر دعوت نے کوئی اثر نہیں کیا اور انہوں نے دعوت کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ اسلامی ریاست جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ عام بیداری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی رائے عامہ کی بنیاد پر قائم ہوگی، جو اسلامی فکر اور اسلام کے ذریعے حکومت کرنے کی فکر کو اپناتا ہو۔ لوگوں کو اسلام کے قریب لانے کے

بہانے سے اسلام میں تدریج کی فکر داخل کرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسان کی کمزوری یا حالات کے ساتھ چلنے کے لیے عاجزی کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم لوگوں کو اور حالات کو اسلام کے مطابق تبدیل کریں۔

قرآن کی طرف رجوع کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ قطعی ہے اور تدریج کی فکر مغرب سے درآمد شدہ فکر ہے جس کو نام نہاد علماء نے جھوٹ اور بہتان سے اس کو اسلام میں داخل کیا۔

رسول اللہ ﷺ اور مسلمان جیسے ہی کوئی آیت نازل ہوتی، بغیر کسی مہلت اور تاخیر کے اس کو نافذ کرنے کی کوشش کرتے، جیسے ہی کوئی حکم نازل ہوتا تو نزول سے ہی اس کی تطبیق واجب ہو جاتی۔ اس آیت کے نزول کے بعد مسلمانوں کو پورے اسلام کی تطبیق کا حکم دیا گیا کہ: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ {مائدہ: 3} ”آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین (ہمیشہ کے لئے) پسند کیا۔“

ان سے پورے اسلام کو نافذ کرنے کا مطالبہ کیا گیا، خواہ ان احکامات کا تعلق عقائد سے ہو، یا عبادات سے، یا اخلاق سے، یا معاملات سے اور خواہ یہ احکامات حکومت، اقتصاد، اجتماع، خارجہ سیاست سے متعلق ہو اور خواہ حالت امن ہو یا حالت جنگ۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا یہ ارشاد کہ: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ ، وَمَا نَهَاكُم عَنْهُ فَأَنْتَهُوا. وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ {الحشر: 7} ”اور رسول تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں، اُس سے رک جاؤ۔“

یعنی وہ سب کچھ جو رسول ﷺ تمہیں دیدیں، لے لو اور اس پر عمل کرو اور وہ سب کچھ جس سے تمہیں منع کریں رک جاؤ اور پرہیز کرو۔ کیونکہ آیت میں (ما) عموم کے الفاظ میں سے ہے، لہذا اس میں تمام فرائض پر عمل اور تمام منہیات سے اجتناب کرنا شامل ہے۔ آیت میں سب کچھ لینے اور عمل کرنے اور اجتناب کرنے کی طلب سے وجوب ثابت ہوتا ہے، اس کا قرینہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں تقویٰ کا امر ہے اور جو لوگ اس آیت میں موجود حکم پر عمل نہ کریں ان کے لئے سخت عذاب کی دھمکی ہے۔ ﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ { مائدہ: 49 } ”اور ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ (احکامات) کے مطابق فیصلہ کیجئے ان کی خواہشات کی پیروی نہ کریں اور ان سے محتاط رہیے کہ کہیں یہ تمہیں اللہ کے نازل کردہ بعض احکامات کے بارے میں فتنے میں نہ ڈالیں۔“

اس آیت میں بھی رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو اللہ کے نازل کردہ تمام احکامات خواہ وہ اوامر ہوں یا نواہی کے مطابق فیصلے کرنے کا قطعی حکم دیا گیا ہے۔ اس آیت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو انسانوں کی اتباع کرنے اور ان کی خواہشات کے پیچھے چلنے سے منع کیا گیا ہے، رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ کہیں لوگ انہیں بعض احکامات کے بارے میں فتنے میں نہ ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ { مائدہ: 44 } ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ کافر ہیں۔“ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ { مائدہ: 45 } ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔“ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ



فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ ﴿47﴾ {مائدہ: 47} ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ فاسق ہیں۔“

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اللہ کے نازل کردہ تمام احکامات کے مطابق فیصلے نہ کرنے والوں کو کافر، ظالم یا فاسق قرار دیا۔ کیونکہ ان آیات میں جو (ما) ہے وہ عموم پر دلالت کرتا ہے اس لیے یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ تمام احکامات کو شامل کرتا ہے، چاہے وہ اوامر ہو یا نواہی۔ اس سے قطعی طور پر یہ واضح ہو گیا کہ مسلمانوں پر انفرادی، جماعت اور ریاست کے طور پر بغیر کسی تاخیر، انتظار اور تدرّج کے اسلام کے احکامات کا نفاذ واجب ہے اور یہ کہ کسی فرد، جماعت یا ریاست کے لئے ان احکامات کے عدم نفاذ میں کوئی عذر نہیں۔

تدریجی طریقے سے اسلام کا نفاذ اسلامی احکامات سے مکمل متصادم ہے۔ بعض احکامات کو نافذ کر کے بعض کو چھوڑنے والا اللہ کے ہاں گنہگار ہے، خواہ وہ فرد ہو، جماعت ہو یا ریاست۔ جو حکمران اسلام کے تمام یا بعض کو نافذ نہیں کرتا، تو اللہ کے نزدیک ایسے حکمران کافر ہیں، بشرطیکہ ان کا عقیدہ یہ ہو کہ اسلام ناقابل عمل ہے یا بعض احکامات کے بارے میں اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہوں۔ اگر وہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ اسلامی احکامات اس وقت بھی قابل عمل اور قابل نفاذ ہے، مگر سب کو یا بعض احکامات کو نافذ نہ کریں تو فاسق یا ظالم ہوں گے۔

جب حکمران واضح کفر کا اظہار کرے کہ اس کے کفر ہونے پر ہمارے پاس واضح دلیل ہو تو رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ قتال کرنے اور اس کے خلاف تلوار اٹھانے کو فرض قرار دیا ہے۔ یعنی جب حکمران کفریہ احکامات کے ذریعے فیصلے کرے جن کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہ ہو، خواہ تھوڑے ہوں یا زیادہ۔ کیونکہ عبادہ بن صامت کی حدیث میں آیا ہے: « وَأَنْ لَا نَنَازِعَ الْأَمْرَ

**أَهْلَهُ قَالَ: إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللَّهِ فِيهِ بُرْهَانٌ» [رواه مسلم**  
**[ ”اور یہ کہ ہم اہل اقتدار کے ساتھ تنازع کریں۔ مگر یہ کہ تم واضح کفر دیکھ لو جس کے بارے میں**  
**تمہارے پاس اللہ کی طرف سے کوئی دلیل ہو۔“**

بنابریں ہم نہ سستی کریں گے نہ ہی اسلام کے احکامات نافذ کرنے میں تدریج سے کام لیں گے۔ کیونکہ ایک واجب کا دوسرے واجب یا ایک حرام کا دوسرے حرام سے کوئی فرق نہیں، یعنی احکامات کا نفاذ کے اعتبار سے آپس میں کوئی فرق نہیں۔ پس اللہ کے احکامات سب برابر ہیں۔ یہ فرض ہے کہ ان احکامات کو بلا تاخیر، بغیر کسی سستی یا تدریج کے نافذ کیا جائے۔ ورنہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول منطبق ہو گا، ارشاد ہے: ﴿أَفْتَوْمُنُونِ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۖ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ﴾ (البقرة: 85) ”تو کیا تم کتاب (تورات) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟۔ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اُس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیادی زندگی میں بھی اُس کو رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دی جائے گا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔“

کسی مسلمان کا خواہ حکمران ہو یا ایک عام فرد کسی بھی حکم شرعی کو نافذ نہ کرنے کا کوئی عذر نہیں سوائے اس کے کہ کوئی ایسی شرعی رخصت ہو جو نصوص شرعیہ میں وارد ہوئی ہو۔ بے بسی جو کہ حقیقی اور محسوس ہو (یا غلبہ ظن سے ہو) یا حقیقتاً اضطراب کی صورت میں قدرت کا نہ ہونا بھی شرعی رخصت ہے، جیسے زبردستی مجبور کیا جائے، یا جیسی وہ حالت جب رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ غطفان کو مدینہ کے پھلوں کا تیسرا حصہ پیش کیا، یا خلیفہ

باغیوں کے ساتھ حکومت بنانے کو قبول کرے، یا ایسی حالت پیش ہو کہ جان بچانے کے لیے مُردار کو کھانا بھی جائز ہو جاتا ہے۔

اس موضوع پر غور و فکر سے معلوم ہوا کہ یہ فکر لوگوں کے اندر حالات کے دباؤ کی وجہ سے پیدا ہو گئی، اس دباؤ سے چھٹکارا پانے کے لئے وہ اپنی دعوت کے لیے دلائل ڈھونڈنے لگے، تاکہ انہی دلائل کے مطابق دعوت دینے کا جواز اور گنجائش پیدا ہو۔ انہوں نے پہلے ایک فکر کو اختیار کیا، پھر تاویل کے ذریعے اس کے لیے شرعی دلائل ڈھونڈ لائے۔ یہ طریقہ ہمیشہ انحراف کی ابتداء ہوتا ہے۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے تدرج کی فکر پر قائم مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ کمزوری کے لباس کو اتار پھینکیں۔ اور اپنے رب پر اعتماد رکھنے والے راسخ العقیدہ مؤمن کی طرح شرع کے ساتھ اپنا رابطہ قائم کریں، کیونکہ وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے وہی حالات کو بدلتا ہے، مستحق کی مدد کرتا ہے، تاکہ اس ایمان کے ذریعے ہی بے رحم حالات کا مقابلہ کر سکے۔ اپنے اسی ایمان کے ساتھ دعوت کے راستے پر گامزن ہو جائے۔ دعوت پر صحیح طرح کاربند رہنے والوں اور مضبوطی سے اس طریقے کا التزام کرنے والوں کے حالات بہت جلد بدل جائیں گے۔ اس کے لیے کسی قسم کی تدرج کی ضرورت نہیں ہوگی۔

تدرُج کی طرف دعوت دینا اسلام کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف دعوت ہے جو کہ حرام ہے۔ اس کی وجہ سے غیر مسلم یا تنگدست مسلمان اس چیز کو اختیار کرنے میں تردد کا شکار ہو جاتا ہے جس کی طرف اس کو دعوت دی جا رہی ہے، اس تردد کی ذمہ داری بھی تدرج کی دعوت دینے والوں پر عائد ہوگی، کیونکہ انہوں نے ہی اسلام کو صحیح طرح پیش نہیں کیا، یہ اس روحانی اساس سے بھی دور ہے جو کہ اللہ خالق اور مدبر کے وجود پر ایمان پر قائم ہے،

اسی بنا پر حکم شرعی کو اختیار یا ترک کیا جاتا ہے۔ اس سے خود اس کی طرف دعوت دینے والوں پر اللہ کی حجت قائم ہوگی نہ کہ جن کو دعوت دی جا رہی ہے۔

تدرُّج کی طرف دعوت دراصل شرع میں دخل اندازی اور من مانی ہے، یہ دعوت انسانوں کو اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ وہ احکام کی جزوی تطبیق کریں اس دلیل سے کہ ہم فوراً مکمل طور پر اسلام کو نافذ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ حالانکہ ہمیں حکم ہے کہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم میں کمی بیشی نہ کریں۔ انسان کے مشکلات کے حل کو اس کا علیم وخبیر رب ہی بہتر جانتا ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ پھر مسلمان کو کیوں تدرج کے نام پر شرعی احکامات میں دخل اندازی کی اجازت دی جائے۔ صحیح بات یہ ہے کہ داعی کا کام صرف تنفیذ اور شرعی حل کی تبلیغ ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

تدرُّج کی طرف دعوت داعی کو غلط طریقہ فکر دیتی ہے، جس کی بنیاد پر وہ دوسرے انسانوں کو بھی غلط دعوت دیتا ہے۔ یہ طریقہ جسے وہ دوسرے لوگوں کے پاس لے کر جائے گا، اگر مدعو اس سے متاثر ہو جائے تو اس کی وجہ اس کا طریقہ تفکیر بھی فاسد ہو جائے گا، حالانکہ اس فاسد طریقہ کی تبدیلی واجب ہے جیسا کہ غلط افکار کی تبدیلی واجب ہوتی ہے۔ کیونکہ تبدیلی کے عمل میں طریقہ تفکیر کو سب سے پہلے تبدیل کرنا ہے، اس کی اہمیت افکار کی تبدیلی پر بھی مقدم ہے۔ یاد رکھیں کہ ہم اس وقت تک امت میں قابل اعتماد تبدیلی نہیں لاسکتے جب تک ہم طریقہ تفکیر کو تبدیل نہ کریں۔ ورنہ یہ غلط طریقہ صحیح فکر کی جگہ لے کر رکاوٹ بن جائے گا۔

## مبداء (آئیڈیالوجی) کی بطور فکر اور طریقہ کے پابندی

جب کافر مغرب اپنے طرز زندگی کو لوگوں کے لیے طرز زندگی بنانے میں کامیاب ہوا، تب سے مسلمان فکری، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے قابل رشک زندگی سے محروم ہو گئے، انہوں نے ایسے افکار کو اپنایا جو ان کے عقیدے سے متصادم تھے۔ مسلمان اپنی یکسوئی کھو بیٹھے، انہوں نے اپنی شخصیت بھی اس وقت کھودی جب انہوں نے اپنے عقیدے سے نکلنے والے افکار اور درآمد شدہ فکر سے پیدا ہونے والے تصور زندگی کے درمیان مطابقت کی کوشش کی، جس کو امت قبول نہیں کر رہی تھی۔ یوں ان کی ناسمجھی اور اپنے امور کو ان کے اصولوں کی بنیاد پر اختیار نہ کرنے کی وجہ سے ان کی زندگی مزید گردآلود ہو گئی۔ انہوں نے اسلام اور اس کے متناقص چیزوں کے درمیان ناموافق طریقے سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نفس جس چیز کو مصلحت قرار دے اس کو شرع کا مقصود قرار دیا۔ انہوں نے ہر تاویل کو قبول کیا اور ہر تحریف کو جائز قرار دیا۔ اس وجہ سے لوگوں کی اجتماعی و اقتصادی زندگی تضادات سے بھر گئی۔ سیاسی حالات امت کی اصل فکر کی جگہ ان درآمد شدہ افکار کو اختیار کرنے کے لیے سازگار ہو گئے۔

ان بدترین حالات میں اسلامی جماعتیں اور احزاب وجود میں آئیں، تاکہ ان غلط افکار، غلط تصورات، انحراف پر مبنی جذبات، اور اغیار کے پیدا کردہ سیاسی حالات کے یلغار کا مقابلہ کیا جاسکے۔

یہ ضروری ہے کہ جماعت کے پاس وہ تریاق ہو جس میں مکمل شفا ہو۔ وہ لوگوں کی ہدایت کے لیے ایک خط مستقیم کھینچے جس پر وہ لوگوں کو چلائے، یہ اس ٹیڑھی خط کے مقابلے میں ہو جس پر چلنے سے لوگ جہنم میں جائیں گے، یہ جماعت لوگوں سے یوں کہے: ﴿وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ذَلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ {انعام: 153} ”اور (اے پیغمبر! ان سے) یہ بھی کہو:“ یہ میرا سیدھا سیدھا راستہ ہے، لہذا اس کے پیچھے چلو اور دوسرے راستوں کے پیچھے نہ پڑو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے الگ کر دیں گے، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکید سے حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو۔“

اس جماعت یا حزب کے اندر وہ صفات ہونی چاہئیں جو مقصد تک پہنچنے کا اہل بناتی ہیں، جیسے فکر کی وضاحت، مقصد تک پہنچنے کا ارادہ، بیدار افراد پر مشتمل گروہ کی تیاری، امت کو تیار کرنا اور طریقے سے متعلقہ احکام کی پابندی۔

جہاں تک فکر کا تعلق ہے، ضروری ہے کہ جماعت اس کو اولین مقام دے۔ کیونکہ فکر اس کی نظر میں حق ہوتی ہے جس کی طرف وہ سارے لوگوں کو بلائے گی۔ یہی وہ ہدایت ہے جو انسانیت کے لیے راستے کو واضح کر دیتی ہے، یہی اللہ کی طرف سے اپنے بندوں پر رحمت ہے۔ یہی وہ نور ہے جو بشریت کو نفس کے اندھیروں سے نکالتی ہے، یہی انسان کے لئے موزوں ہے۔ یہی اس کی فطرت کے موافق، اس کی عقل کے لیے تسلی بخش اور اس کے دل کو مطمئن کرنے والی ہے۔ یہی زندگی کی خوشی اور امید افزا ہے۔ اس میں گہرائی اور جامعیت ہے جو زندگی کے بارے میں اس کے تمام سوالات کا جواب دیتی ہے، یہی زندگی کے ماقبل اور مابعد کے ساتھ انسان کا صحیح ربط و تعلق قائم کرتی ہے، اس کو اپنے خالق سے ایسا

جوڑ دیتی ہے، جس سے وہ اپنے مقصد کو سمجھ لیتا ہے اور آخر دم تک اس کو فرحان و شادماں رکھتا ہے۔

جماعت یا حزب جس وقت اس فکر پر ایمان لاتی ہے تو اس کے بالمقابل اس بات پر بھی ایمان رکھتی ہے کہ جب تک اس کی فکر کی بالادستی نہیں ہوگی، باطل دندناتا پھرے گا، منکر پھیل جائے گا، خواہشات کا راج ہوگا، ظلم کا دور دورہ ہوگا، ظلمت عام ہوگی، تنگی اور مشقت کی زندگی لوگوں کی نیند اڑا دے گی، ان کے دل ہرگز مطمئن نہیں ہوں گے، نہ ان کی طبیعت راحت محسوس کرے گی اور نہ ہی ان کی عقلیں تدبر کا مظاہرہ کریں گی۔

پہلی بات جس پر حد درجہ توجہ دینا جماعت کے لیے لازمی ہے وہ یہ ہے کہ اپنی پوری کوشش اور مکمل توجہ اس فکر کی طرف کرے جو اس کے لیے روح اور اسکے وجود کا وجہ جواز ہے۔ اس کی نگرانی کرے اور اس کے شفاف پن کی حفاظت کرے، اس کو ہر اس چیز سے دور رکھے جو اس فکر میں سے نہیں، اور اجنبی افکار کی ملاوٹ سے اس کو بچائے، اور اس فکر کو بنیاد بناتے ہوئے دوسری دعوتوں اور پیش کئے جانے والے افکار کے بارے میں اپنے وقف کا تعین کرے۔ فکر کے شفاف پن کا تقاضا ہے کہ جماعت کی نگاہ صاف ستھری ہو۔ نظر اس وقت صاف ستھری ہوگی جب حکم شرعی کا ادراک صحیح طریقہ استدلال کی بنیاد پر ہوگا۔ پھر یہ حکم اسلامی عقیدے کے سہارے اخذ کیا گیا ہو۔

جب فکر میں شفاف پن، صفائی، خالصیت اور وضاحت نہ رہے، تو اس کی خصوصیت بھی ختم ہوگی پھر وہ نور، ہدایت اور رحمت نہیں رہے گی اور یہ بھی دوسری جماعتوں کی طرح حالات کے سامنے سرنگوں ہوگی اور اس کے وجود کا کوئی جواز باقی نہ رہے گا، یہ حالات پر اثر

انداز ہونے کی بجائے حالات سے متاثر ہوگی، ان حالات کو بدلنے کی بجائے یہ خود بدل جائے گی۔

جماعت کے ارکان کی فکر جس قدر روشن ہوگی، عملی صورت حال تک پہنچنے کے لیے اس کا طریقہ بھی اتنا ہی واضح ہوگا۔ فکر کے واضح ہونے سے مقصد بھی واضح ہو جاتا ہے۔ مقصد تک پہنچنے کا طریقہ بھی ثابت شدہ احکام شرعیہ ہیں، جو دوسرے احکامات کی طرح ہی ہیں۔

مبدائی حزب یا مبدائی جماعت وہ ہے جو اپنی تمام حرکات اور سکناات میں مبداء کا پابند ہو کر رہے، کیونکہ مبدائی فکر اس کے حاملین اور داعیوں کو مبداء کے علاوہ کہیں اور سے کچھ لینے سے روکتی ہے، ہاں اگر خود مبداء اس کی اجازت دیتا ہے تو ٹھیک ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایک اساسی فکر ہے، جو ہر چیز کی بنیاد سے بحث کرتی ہے، اس کائنات میں انسان کی موجودگی کا نمایاں جواب دیتی ہے۔ ہر فروعی فکر اس سے مانوخذ اور اس سے پیدا شدہ ہوتی ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کے تمام افکار، اشیاء کے بارے میں اس کے مفاہیم اور افعال کے بارے میں اس کا حکم سب اسی بنیادی فکر کی جنس سے ہوتی ہیں۔

اسلام کی عمارت بالکل مکمل ہے جس میں ایک اینٹ برابر بھی کمی نہیں۔ اس میں ہر چیز دوسری چیز کے ساتھ مل کر ایک ہی لڑی میں پروئی گئی ہے، کیونکہ یہ سب ایک ہی پائیدار فکری قاعدے سے نکلے ہیں، جو زندگی کے طریقوں اور خلقت کی فطرت کے مطابق ہے۔

پس جو بھی اسلام پر ایمان لائے گا، تو اس کے اعمال اور اشیاء کے بارے میں اس کا نقطہ نظر کا پیمانہ حلال و حرام بن جائے گا، نہ کہ منفعت۔ کیونکہ منفعت اس فکر سے نکلی ہے کہ انسان



ہی قانون ساز ہے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نہیں۔ اسلام پر ایمان لانے سے انسان کی خوشی اللہ کی رضا کا حصول بن جاتا ہے نہ کہ زیادہ سے زیادہ لذت کا حصول۔ اس کی زندگی بھی اللہ کی بندگی اور اس کے اوامر کے سامنے سرگرم ہونے کی زندگی ہوگی، آزادی کی فکر پر مبنی تمام قیودات سے آزاد زندگی نہیں ہوگی۔ پس جو کوئی اس اساس کو قبول کرتا ہے وہ اس اساس سے نکلنے والی ہر چیز کو بھی قبول کرے گا۔ جو تبدیلی چاہتا ہے تو اس کو اس اساس سے ابتدا کرنی چاہیے، اس طرح فروعی افکار اور اساس کے درمیان تعلق کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہ ہے وہ مبدائی فکر اور مبدائی دعوت جس کے اندر سے جماعت کو چل پڑنا چاہیے۔ اس لئے مسلمانوں، ان کی حکومتوں اور ان کی جماعتوں کی طرف سے یہ نامنظور ہے کہ وہ اسلام اور دوسری چیزوں میں ملاوٹ کریں۔ جس طرح موجودہ حکومتوں کی جانب سے اسلام کے ساتھ دوسری چیزوں جیسے عرف وغیرہ کو قانون سازی کا مصدر بنانا یا اسلام کو اساسی مصدر بنانا قابل قبول نہیں، بالکل اسی طرح اسلامی جماعتوں کی جانب سے بھی اس قسم کی ملاوٹ قابل قبول نہیں کہ وہ اسلام اور کچھ غیر اسلامی مغربی افکار کی بنیاد پر قائم ہوں۔ یہ شکست خوردگی ہے اس کو اللہ اور اس کے مؤمن بندے قبول نہیں کریں گے۔

اس لیے ہر وہ اسلامی جماعت جس کے عقیدے کی بنیاد 'لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ' ہوگا، یعنی اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود اور واجب الطاعت نہیں، اس کے لیے زندگی کے احکامات لینے کے لیے مشرق و مغرب کی طرف دیکھنا حلال نہیں، ہر فکر کے بارے میں اس بات کا لحاظ رکھنا فرض ہے کہ وہ عقیدے سے نکلی ہو اور اس کو قابل اعتماد شرعی مصادر سے تفصیلی دلائل کے ساتھ استنباط کیا گیا ہو۔

پس کلمہ لالہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور یہ بات کہ اشتراکیت، (جو اس فکر کی بنیاد پر قائم ہے کہ لالہ والحیاء مادۃ، ”کوئی معبود نہیں اور زندگی صرف مادہ ہے“) بھی اسلام سے ہے، کیسے یکجا ہو سکتے ہیں؟ یا اس بات کے ساتھ کلمہ کو کس طرح یکجا کیا جاسکتا ہے کہ جمہوریت، جو دین کی زندگی سے جدائی کی بنیاد پر قائم ہے، اسلام سے ہے؟۔ یا اس بات کے ساتھ کہ عصیت پر مبنی قومیت و وطنیت، جس کو اسلام نے رذیل قرار دیا ہے، اسلام سے ہے؟ یہ بالکل ہی یکجا نہیں ہو سکتے۔

اسی طرح ”لالہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ جس کا معنی یہ ہے کہ صرف اللہ ہی قانون ساز ہے کس طرح اس فکر کے ساتھ یکجا ہو کہ قانون سازی میں ہم آپس میں یا دوسرے ہمارے ساتھ شریک ہیں؟

اور کیونکر ”لالہ الا اللہ محمد رسول اللہ“ جس کی بنیاد ہی اللہ کے سامنے عاجزی اور رب العالمین کی عبادت ہے، مغربی نظاموں کی آزادی کی فکر کے ساتھ یکجا ہو جس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان خود مختار اور آزاد ہے۔ وہ کسی معبود کے سامنے بس اتنا عاجز ہے جتنا اس کی خواہش، رغبت اور مفاد کے مطابق ہے۔

جی ہاں اسلامی عقیدے کا تقاضا ہے کہ اس عقیدے سے نکلنے والی ہر چیز کو اختیار کیا جائے۔ ورنہ جماعت اسلام کی ان چیزوں کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کے چکر میں اپنا وجود ہی کھو بیٹھے گی، جن سے اللہ اور اس کے بندے راضی نہیں ہوتے۔

فکر کی شفافیت، وضاحت اور پاکیزگی کی حفاظت کے لئے ضروری ہے کہ اس کو حقیقت سے متاثر یا حالات کے آگے جھکنے نہ دے، اس کو تحریف، تبدیلی یا سودے بازی کرنے سے دور رکھے۔

اور جس طرح ایک داعی اپنے تصور کے مطابق معاشرے کو بدلنا چاہتا ہے، اسی طرح معاشرے میں موجود مفاہیم، غلط افکار، سیاسی حالات، اجتماعی حالات کا داعی اور جماعت پر تبدیلی کے سلسلے میں بہت دباؤ ہوتا ہے۔

### انحراف اور سودے بازی سے محتاط رہنا:

جماعت جب مبدائی فکر پر قائم ہو کر واقعاتی دنیا میں آتی ہے تو اس کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے تند و تیز آندھیاں چلیں گی، حکومتیں اس جماعت کے ساتھ دوسری تحریکوں سے مختلف سلوک کریں گی، کیونکہ دوسری جماعتیں ایسے جزوی افکار پیش کرتی ہیں جو حکومتوں کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتے، بلکہ بعض دفعہ یہ افکار حکمرانوں کی جانب سے کیے گئے سوراخوں کو پُر کرتے ہیں۔ لیکن مبدائی فکر پر قائم جماعت بنیادی دعوت میں تمام بنیادی باتوں کو زیر بحث لاتی ہے، یہ دعوت کسی قسم کی پیوند کاری اور زمانے کے ساتھ چلنے پر راضی نہیں ہوتی، آدھے حل کو قبول نہیں کرتی، نہ حکومتوں کی اصلاحات کو قبول کرتی ہے اور نہ ہی بنیادی چیز کو چھوڑ کر فروعات کو قبول کرتی ہے۔ تو یہ طبعی بات ہے کہ اس جماعت یا حزب کی مخالفت دوسروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ جماعت جس قدر بنیادی تبدیلی کا التزام کرے گی حکومتوں کی اس سے دشمنی بڑھتی جائے گی، مخالفت سخت ترین ہوتی جائے گی۔

کبھی یہ سختی خود حامل دعوت کے ساتھ ہوگی، جس کی وہ طاقت نہیں رکھے گا، یوں وہ اپنی جماعت پر دباؤ ڈالے گا کہ تھوڑی نرمی کا مظاہرہ کیا جائے، اس طرح جب وہ اپنے آپ کو تنہا تکلیف میں دیکھے گا تو تنگی محسوس کرے گا اور اس کے ارادے کمزور ہوں گے، کبھی

جب اس کی دعوت اور جمعیت کے ساتھ کام کرنے کا اس کے دنیاوی مفادات سے تصادم ہوگا تو اس کے دل میں وسوسے پیدا ہونگے اور وہ کام سے روگردانی کرنے لگے گا۔ جس کی وجہ سے اس کی جماعت پر دباؤ بڑھ جائے گا اور وہ تبدیلی کی دعوت کی بجائے اصلاح کا مطالبہ کرنے لگے گا۔ اگر جماعت ان اراکین کی تجاویز کو قبول کرنے لگی تو وہ جماعت کے ساتھ رہیں گے اور وہ بزعیم خویش دین اور دنیا دونوں کے حصول اور اللہ اور بادشاہ دونوں کو راضی کرنے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ اس دباؤ کو مسترد کرے اور اپنے انقلابی عمل پر اصرار کرے گی تو یہ اراکین اس کا ساتھ چھوڑیں گے۔ اس وقت جماعت کو دو طرح کی آگ کا سامنا ہوگا۔ ایک اندرونی آگ جو اس کے شباب کی طرف سے ہوگی، جن کی ہمت تکالیف کی وجہ سے جواب دے گئی ہو، جبکہ دوسری بیرونی آگ یعنی حکومتوں کی طرف سے جو اس قسم کی تجاویز والوں سے نرم رویہ اختیار نہیں کرتی۔

پھر جماعت اور حکومتوں کے درمیان سودے بازی کی جنگ شروع ہوتی ہے۔ ساتھ ساتھ ڈنڈوں اور مذبح خانوں کے اسلوب کو بھی آزمایا جاتا ہے۔ یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ سودے بازی لین دین میں ہوتی ہے۔ جس وقت جماعت سودے بازی میں داخل ہوتی ہے وہ تجارت کی طرف پلٹ جائے گی اور قوموں کو ذلیل کرے گی۔ ورنہ وہ حکومتوں کے انتقام کی آگ اور اس کے شعلوں کی نذر ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ صحیح مبدائی فکر کو ایک ایسی جماعت یا حزب کی ضرورت ہے جس کی قیادت اور اراکین میں شرع کو ہی سب سے اعلیٰ اور اولیٰ سمجھنے کی صفت ہو۔ اس طرح ان کے اندر اپنی فکر کی صفائی اور پاکیزگی کی حرص، صبر، جذبہ قربانی، ایثار، خواہشات سے

نفرت، نفسانیت سے آزادی ہونی چاہئے، تاکہ انحراف پیدا نہ ہو اور ہمتیں جواب نہ دیں۔ اور تاکہ جماعت مضبوط اور منظم انداز سے اپنے کام کی حفاظت کرتے ہوئے چلتی رہے وہ کسی طرح تبدیل نہ ہو سکے اور دھوکہ نہ کھائے، یہ واجب ہے کہ وہ ہر فکر اور ہر حکم شرعی کو اسلامی عقیدے سے مربوط کرے، تاکہ جب داعیوں کے عارضی یا ذاتی مفادات اور مقصد کے حصول کے لیے دعوت کے کام میں مقابلہ کی صورت پیدا ہو جائے تو وہ دعوت کے مفاد کو ترجیح دے سکیں، یہ ربط ہی شیطان کے وسوسوں اور بدی کا حکم دینے والی نفس کی باتوں کے سامنے رکاوٹ ہے۔ جماعت یا حزب کی کشتی کو بدترین حالات کے سیلاب میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے ایسے اصول اور ضوابط کی ضرورت ہے جو افکار اور طریقہ تفکر کی تجدید کریں، کیونکہ یہی چیز جماعت کو اپنے افکار سے مربوط رکھتی ہے، اور اس صورت میں کبھی بھی تاویل اور مصلحت کے بہانے سے اپنے اصول سے نکلنے کا اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ بہترین طریقے سے توجہ دینا، اچھے طریقے سے پیروی کرنا اور اچھے انداز سے سمجھنا ہی جماعت اور اس کے ساتھ کام کرنے والوں کو ہر قسم کی ملاوٹ سے بچاتا ہے اور دلوں کو صاف اور ایمان کو مضبوط کرتا ہے۔

اس راستے کی مشکلات پر صبر صرف اولوالعزم مؤمنین ہی کر سکتے ہیں۔ اس دعوت پر قائم رہنے والے لوگوں کو یہ آزمائشیں ایسے صاف کریں گی جیسے آگ سونے کو صاف کرتی ہے۔ اگر جماعت اپنے اصول و ضوابط کھو بیٹھے تو انجام کار وہ تبدیلی، رنگا رنگی کا شکار ہوگی، رائے بدلتی رہے گی اور پسپا ہوتی جائے گی۔ طریقے کی پیچیدگی اور ہدف کی عدم وضاحت سے مشکل حالات میں طریقہ اور ہدف کی تبدیلی کی طرف مائل ہوگی اور دلیل تلاش کرتے ہوئے تاویل اور عذر کی کوشش کرے گی۔

جماعت جب سودے بازی پر اتر آتی ہے اور حق کو جزوی طور پر قبول کرنا شروع کرے، بنیادی موضوع اور انقلابی عمل کو چھوڑ دے، تو اپنی واحد قوت بھی کھودے گی، پھر یہ منفرد نہیں رہے گی، پھر لوگ اس کو انفرادیت اور خصوصیت کی نظر سے نہیں دیکھیں گے۔ یوں یہ فکری جنگ کے میدان میں ڈھیر ہو جائے گی اور دشمن اس پر غلبہ پالے گا، اگرچہ یہ برائے نام اسلام اسلام پکارتی رہے۔ کیونکہ اس کی پیشکش بیکار ہوگئی اور یہ حکومت کی مصلحت کے تابع ہوگئی۔ اس طرح یہ تبدیلی لانے کی بجائے خود تبدیلی کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ اسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں محتاط رہنے کا حکم دیا ہے: **(واحدہم ان یفتنوک عن بعض ما نزل اللہ الیک)** ”اور ان سے محتاط رہیے کہ کہیں یہ تمہیں اللہ کے نازل کردہ بعض احکامات کے بارے میں فتنے میں نہ ڈالیں۔“ اور جس طرح سیدنا عمرؓ نے اپنے قاضی شریح سے فرمایا: ”اس بارے میں لوگ تمہیں فتنے میں نہ ڈالیں۔“

جماعت کا سب سے بڑا اسلحہ اس کی فکر ہے۔ اگر وہ اس کی حفاظت کر سکتی ہے اور اس کو سودے بازی کے دائرے سے نکال سکتی ہے، ہر قسم کے حالات پر صبر کرتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چل سکتی ہے، تو ایک عرصے کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی طرح مؤمنوں کے ایک گروہ اور امت کو اللہ کے نازل کردہ احکامات کو قبول کرنے کے لیے تیار کر سکے گی، پھر وہ دعوت کے لیے ماحول سازگار کرے گی اور ریاست قائم کرے گی۔

صحیح شکل میں اسلامی افکار کے ذریعے صاحب دعوت کے آراستہ ہونے کا تقاضا ہے کہ وہ بنیادی فکر سے ہم آہنگ اسلامی افکار کے ذریعے دباؤ کا مقابلہ کریں۔ جماعت ان افکار کے ہوتے ہوئے دباؤ کا سامنا اس ذہن (عقلیہ) کے ساتھ نہ کرے جیسے ”لو اور مطالبہ کرو۔“ یا ”حقیقت کے مطابق تجویز دو“ یا ”بعض مطالبات کو پیش کرو۔“ یا ”جزوی حل کو قبول کرو۔“ جماعت اس قسم کے افکار کو تبدیل کرنے کے لیے ہی تو بنی ہے، ان کے اندر رہتے ہوئے کام کرنے کے لیے نہیں۔ یہ تو مغرب کا طرز فکر ہے جس کو لے کر اس نے ہماری عقلوں پر حملہ کیا۔ یہ اسلام کی طبیعت سے بالکل مختلف ہے جو ان چیزوں کو جڑ سے اکھاڑتی ہے اور اسلام اور اس کے طریقہ تفکر کو پائیدار بنانے پر کام کرتی ہے۔ پس جو تبدیلی چاہتا ہے یا تبدیلی کے لیے کام کرتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے اپنے سے شروع کرے۔

جماعت کے لیے فکر کی صفائی، وضاحت اور اس کی حفاظت کے بیان کے بعد ہم ان دو افکار کو بیان کرنے جارہے ہیں جن کو مغرب نے اپنے دوسرے افکار کے ساتھ مسلمانوں کے اندر داخل کیا اور اس کی وفادار حکومتوں نے ان کو مسلمانوں پر ٹھونسنے کی نگرانی کی، نہایت افسوس کی بات ہے کہ اسلام کے لیے کام کرنے والی بعض جماعتوں نے ان کو قبول کیا، اسی طرح کچھ مسلمان لکھاریوں نے بھی ان کو اختیار کیا، وہ لکھاری جو ہمیشہ مغربی افکار کی نمائندگی اور پرچار کرتے رہتے ہیں۔ وہ دو افکار کون کون سے ہیں: پہلی فکر یہ کہ ”جمہوریت اسلام سے ہے اور یہ کہ یہ شوریٰ ہی ہے۔“ انہی مصنفین اور لکھاریوں میں سے ایک نے لفظی مطابقت اور فکری مغالطے کے طور پر اس کو ”شوروکریسی“ کا نام دیا۔ دوسری فکر ”کفر حکومت میں شرکت“ کچھ مسلمان اور بعض تحریکیں اس کے قائل ہیں۔ ہم اس بحث میں اسی اصول پر چلیں گے جو ہم نے شروع میں ذکر کیا کہ پہلے اس حقیقت کا مطالعہ کریں گے، جس میں

جمہوریت کو نافذ کیا جاتا ہے، ساتھ ساتھ جمہوریت کی حقیقت کا بھی مطالعہ کریں گے، پھر یہ دیکھیں گے کہ کیا شرع میں کوئی ایسی حقیقت ہے جو جمہوریت کی حقیقت سے مشابہ ہو تاکہ اس پر عمل کرنا صحیح ہو۔

## جمہوریت

مغرب دین کی زندگی سے جدائی کی فکر پر قائم ہے۔ اس بنیادی فکر کا اثر ہی ہے کہ دین لوگوں کی زندگیوں سے دور ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کے مفاہیم اس بنیاد کے تابع ہو گئے ہیں، اس اساسی فکر کے جنس سے ہی اہل مغرب کے افکار نکلے ہیں۔ اسی سے جمہوریت کی فکر نکلی ہے، جس نے اللہ کی بجائے خود انسان کو اپنے آپ کا حاکم بنایا۔ ان کے اعمال کا معیار منفعت، ان کے نزدیک خوشی کی تعریف ممکن حد تک خواہشات کا پورا ہونا ہے۔ اسی سے فرد کی تقدیس کی فکر نے جنم لیا جو ان کو آزادیوں کی تقدیس کی فکر کی طرف لے گئی۔ پھر انہی افکار پر اپنے معاشرے کی بنیاد رکھی، مغرب بیک وقت ہر اس فکر کا مخالف ہے جو اس کی ضد ہے۔ ان افکار کے نتیجے میں مغربی انسان خوش نصیب ہونے کی بجائے بد قسمت ہو گیا۔ یہ طبعی بات ہے کیونکہ عاجز انسان اپنے یا دوسروں کے لیے قانون نہیں بنا سکتا۔ جس معاشرے میں انسانیت (خود پرستی) کا غلبہ ہو اور وہاں آزادیوں کا راج ہو تو وہ ایک بہیمانہ معاشرہ ہو گا اور وہاں جنگل کا قانون ہو گا۔

مغرب نے عقل کو بھی بے لگام کر دیا۔ اس نے انکشافات اور ایجادات کر کے علمی نتائج اور اعلیٰ ٹیکنالوجی حاصل کی، یوں انہوں نے توانائی کے وسائل تک رسائی حاصل کی، جس



کی وجہ سے انہوں نے حق کے ذریعے نہیں، بلکہ طاقت کے بل بوتے پر دنیا کو مغلوب کیا۔ اس لیے مغرب نے دنیا کے سامنے پہلے اپنے آپ کو مادی طور پر پھر فکری طور پر پیش کیا۔ یعنی ملکوں کو مغلوب کرنے کے بعد ان حکمرانوں پر توجہ مرکوز کی جو اس کے مفادات کے خادم اور اس کے نظاموں کو نافذ کرتے ہیں۔ یہی حکمران ذرائع ابلاغ اور نظام تعلیم کو مغرب کی فکر اور زندگی کے بارے میں اس نقطہ نظر کی ترویج کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ پھر مغرب نے دنیا کو اپنے مفادات کے لحاظ سے دنیا کو صنعتی، پیداواری، مالدار، مضبوط، محکوم، نوآبادیاتی، ممالک میں تقسیم کیا، پھر ان میں سے بعض کو ترقی یافتہ بعض کو ترقی پذیر اس طرح بعض کو غریب کمزور اور اپنے سامنے مغلوب بنایا ہوا ہے ان کو پسماندہ ممالک کہتا ہے۔ اس تقسیم کو برقرار کہہ کر ملکوں کے حالات کو اس نہج کے برخلاف تبدیل ہونے نہیں دیتا ہے۔

پھر انہوں نے اپنے ممالک میں آزادیاں دے رکھی ہیں، اپنے ممالک کے لوگوں کو سیاسی استحکام سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہوا ہے۔ اپنے افراد کو بنیادی ضروریات کی فراہمی اور کچھ اعلیٰ درجے کی سہولتیں بھی مہیا کئے ہوئے ہے۔ جبکہ غریب ممالک سے مادی قوت فراہم کرنے والی سائنس چھپا کر ان کو ترقی سے محروم کیا ہوا ہے، ان کو بنیادی صنعتیں قائم کرنے سے روکا تاکہ وہ اسی کا دست نگر بنے رہیں، بعض ممالک کے لوگوں کو انتہائی غریب رکھا ہوا ہے اور ان ممالک کو اپنی مصنوعات کی مارکیٹ بنا رکھا ہے، ان ممالک کے لوگوں کو سیاسی استحکام اور امن سے محروم رکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے صنعتی ممالک غریب ممالک کو نوآبادیاتی بنانے کے لیے آپس میں دست و گریبان رہتے تھے۔ لیکن یہ ایسی جنگ نہیں تھی کہ اس میں ایک دوسرے پر براہ راست جنگ مسلط کی جائے، بلکہ اس مقصد کے لیے وہ اقوام کو آپس میں لڑاتے ہیں، یا ان ممالک میں جن پر یہ براہ راست قبضہ نہیں کر سکتے شورش اور

بغاوتیں پیدا کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہاں عدم استحکام، بد امنی اور لوگوں کے درمیان دشمنیاں جنم لیتی ہیں، یوں ان ممالک کے باشندوں کے درمیان قومیت، عصبیت اور نسل پرستی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

اس طرح مغربی ممالک نے اپنی اقوام کے لیے صحت، تعلیم، بے روزگاری اور بڑھاپے میں سوشل سیکورٹی انشورنس کا بندوبست کیا جبکہ دوسرے ممالک کے لوگوں کو ان چیزوں سے محروم رکھا۔

پھر اپنے متنوع استعماری اسالیب کے ذریعے بین الاقوامی ادارے قائم کئے، جیسے عالمی عدالت انصاف، بین الاقوامی سلامتی کونسل، عالمی بینک، عالمی ادارہ معافی وغیرہ۔ اس طرح ملکوں کے درمیان جنگ روکنے یا غریب ممالک کی مدد کے نام سے متعدد کثیر القومی فورسز تیار کیں۔ تنظیمیں اور ادارے بنائے تاکہ خفیہ طریقے سے اور غیر واضح شکل میں غریب ممالک کے معاملات میں دخل اندازی کی جاسکے، جیسے بچوں کی امداد، ڈاکٹروں کی عالمی تنظیم وغیرہ۔

یقیناً دین کی زندگی سے جدائی کی فکر اور اس سے پیدا ہونے والی نفع کی فکر نے مغرب کو استعماری فکر تک پہنچایا۔ لیکن یہ استعمار حسب سابق ابتدائی شکل پر ہی برقرار نہیں رہا، بلکہ اس کے افکار، وسائل اور اسالیب نے ترقی کی اور یہ ایک ایسا خفیہ استعمار بن گیا جو ظاہری طور پر تو رحمت نظر آتی ہے، لیکن باطنی طور پر یہ بڑا عذاب ہے۔ اس انداز سے مغرب لوگوں سے حقائق کو چھپاتا ہے۔ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ گویا وہی بہترین نمونہ ہے جس کی طرف اقوام کی نظریں ہونی چاہئیں تاکہ وہ اسی کی تقلید کریں، گویا کہ یہی قبلہ

ہے جس کی طرف مسلمانوں کو بھی رخ کرنا چاہیے۔ یہ کتنا بڑا دھوکہ اور منافقت ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے تو یہ جمہوریت اور آزادیِ فکر کی وجہ سے ہے۔ گویا یہی پناہ گاہ اور ہر اس شخص کا ٹھکانہ ہے جو اس جنت میں رہنا چاہے، اس نے استعمار کی اس حقیقت کو چھپایا کہ وہی اقوام کا خون چوستا ہے اور ان کو ان کے مصنوعات اور تجارت کی منڈی بنانے کا سبب یہی ہے کہ انہوں نے دنیا پر تسلط جمایا ہوا ہے۔ مغرب اور اس کے استعماریت کا قصہ بہت ہی طویل ہے لیکن ہم نے اپنے موضوع کی مناسبت سے اس میں سے تھوڑا سا ذکر کیا۔ جی ہاں، مغرب نے حقائق کو چھپایا اور لوگوں کو دھوکے میں رکھا اور دنیا کو اپنا ایسا چہرہ دکھایا جیسا وہ دکھانا چاہ رہا تھا۔ زندگی، جس پر اس کا کنٹرول ہے، میں باطل افکار کو مضبوط منطق کے ذریعے پیش کیا اور اس قاعدے پر انحصار کیا کہ: ”طاقتور کی دلیل مضبوط اور کمزور کی دلیل کمزور ہوتی ہے۔“

یہاں سے ایک مبدئی جماعت یا حزب کا کردار شروع ہوتا ہے کہ وہ حالات کو اپنے نہج پر لے آئے اور ان کی صحیح چھان بین کر کے درست نقطہ نظر کو بیان کرے اور تلبیس (دھوکہ بازی) کو روکے۔ ورنہ اگر جماعت بھی صورت حال سے متاثر ہو جائے تو صحیح تصور کھو بیٹھے گی، پھر وہ بھی وہی حل پیش کرے گی جو اس کا دشمن کرتا ہے، اور اگر صورت حال کی حقیقت سمجھ لے، اور اس کا علاج پہچاننے کے لئے جماعت کو شرع کی ضرورت پڑی تو لوگوں کو شفا دے سکے گی اور ان کو مغرب کی ظالمانہ فکر سے اسلام کے عدل کی طرف نکال لانے کے قابل ہوگی۔

اس مقدمے کی بنا پر مغرب کو ہم جو طاقتور کے طور پر دیکھتے ہیں، اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے سائنس و ٹیکنالوجی میں عقل کو مطلق العنان بنایا جبکہ دوسری اقوام کے لیے اس کے دروازے بند کر دیئے، جس کی وجہ سے صرف مغرب ہی مادی قوت کے اسباب پر قابض ہو گیا۔ مغرب میں دولت کی جو ریل پیل ہے اس کا سبب استعمار ہی ہے جس نے اقوام عالم کا خون چوسا اور ان کی دولت کو لوٹا اس کا سبب جمہوریت نہیں۔

# یہ بات کہ جمہوریت کیا ہے؟ زندگی میں اس کے نفاذ نے کیا نتیجہ نکالا؟ یہ ایک الگ داستاں ہے

یقیناً "دین کی زندگی سے جدائی" کی فکر مغرب میں پیدا ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں کلیسا کی جانب سے لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی کی وجہ سے لوگ اس کی آگ میں جل چکے تھے، کلیسا دین کے نام پر دخل اندازی کرتا تھا، حالانکہ ان کے دین میں یہ نہیں تھا، کیونکہ نصرانی دین میں زندگی کے معاملات کے بارے میں قوانین نہیں، پھر رجال دین نے دین کے نام سے ظالمانہ قوانین بنا لیے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو گروہ بن گئے ایک نے کہا کہ دین کا سرے سے اعتراف ہی نہیں کرنا چاہیے جبکہ دوسرے گروہ نے کہا کہ اس کا اعتراف تو کیا جائے لیکن اس کا زندگی سے جدا ہونا لازمی ہے۔ پہلی فکر کی بنیاد پر زندگی کے بارے میں وہ افکار وجود میں آئے جس پر ایسی حکومتیں اور نظام وجود میں آئے جس کو اشتراکی ممالک کی تنظیم کہا جاتا ہے جو زمانے کے گزرنے کے ساتھ لوگوں کی بد بختی پر منبج ہو کر ناکامی سے دوچار ہوا۔ دوسری فکر کی بنیاد پر بھی زندگی کے بارے میں افکار وجود میں آئے جن کو نظام کے طور پر اختیار کیا گیا۔ انہیں اختیار کرنے والے ممالک کو سرمایہ درانہ ممالک کہا جاتا ہے جو ناکامی کی طرف رواں دواں ہے جس پر موجودہ فکر اور امر واقع دلالت کرتے ہیں۔

دین کی زندگی سے جدائی کی فکر نے انسان کو قانون سازی کا حق دیا جبکہ دین کے اس حق کو ختم کر دیا۔ یہ لوگ اللہ کے وجود کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن اس کو ایسی انفرادی فکر کہتے ہیں جس کا کسی معاشرے کے ساتھ مخصوص تعلق ہے نہ ہی اس کے اوپر اس کا کوئی اثر

ہے۔ ان کے نزدیک اللہ، مسیح، گوتم یا کوئی شخص بھی معبود ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ ممنوع نہیں کہ ایمان تو ہو مگر دین کے بغیر ہو۔ لیکن بہر حال انسان خود ہی اپنے تمام معاملات کا مدبر ہے۔ ان کے ہاں اس فکر پر کوئی سودے بازی یا تاویل نہیں ہوگی۔ ان کے نزدیک صرف اور صرف انسان خود ہی اپنے امور کی تدابیر، اپنے معاملات میں تصرف اور اپنی جبلتوں کو پورا کرنے کی تنظیم کرے گا، یہاں سے جمہوریت کی فکر پیدا ہوتی ہے جس کا معنی ”عوام کے لیے، عوام کے ذریعے، عوام کی حکومت“۔

پس ”عوام کی حکومت“ کا معنی یہ ہے کہ عوام ہی خود مختار ہے، یعنی وہی قانون سازی کریں گے اور قوانین کو نافذ کریں گے۔

”عوام کے لیے“ کا یہ مطلب ہے کہ عوام پر اپنے بنائے ہوئے قوانین کے ذریعے حکومت کی جائے گی۔ انہوں نے عملی طور پر اس کا تین اختیارات کے نام سے ترجمہ کیا ہے:

1- قانون سازی کا اختیار (قانون ساز اتھارٹی): یہ اتھارٹی احکام اور قوانین بناتی ہے، ان میں رد و بدل یا ان کو ختم کرتی ہے یا ان کی تنفیذ کی نگرانی کرتی ہے۔

2- تنفیذی اتھارٹی (انتظامی اختیارات): یہی عام قوانین یا عام قومی معاملات یا ان قوانین اور احکام کو نافذ کرتی ہے جن کو قانون ساز اتھارٹی بنائے۔

3- عدالتی اتھارٹی: یہ قانون ساز اتھارٹی کے بنائے ہوئے احکامات اور قوانین کے مطابق ہر مسئلے کا فیصلہ کرتی ہے۔

یہ ہیں جمہوریت کے بنیادی اوصاف، یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ایسا کوئی بھی نظام جو انہی بنیادی اوصاف کی وجہ سے متصف ہو جمہوریت کہلائے گا۔ کوئی بھی نظام جس کے اندر مذکورہ بنیادی اوصاف میں سے کوئی صفت نہیں ہوگی وہ جمہوری نظام نہیں کہلائے گا۔ اور ان بنیادی خصوصیات میں نمایاں ترین خصوصیت "عوام یا لوگوں کی بالادستی" ہے۔ جمہوری فکر میں یہی بنیادی نقطہ جمہوری نظاموں میں ریڑھ کی ہڈی ہے۔

پس کیا اسلام میں جمہوریت ہے؟ کیا جمہوریت کی یہ حقیقت اسلام میں موجود ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ: اگر اسلام میں جمہوریت کی یہ حقیقت موجود ہو تو ہم بڑے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ: ”جمہوریت اسلام ہی سے نکلی ہے“ اور ”خلفاء راشدین ہی نے سب سے پہلے جمہوریت نافذ کی۔“ یا ”جمہوریت ہماری ہی تھی ہمیں واپس لوٹا دی گئی۔“ اگر اس حقیقت کے ساتھ جمہوریت اسلام میں نہیں تو پھر اسلام اور جمہوریت کا کوئی تعلق نہیں، پھر اس کے بارے میں اسلام کا کیا حکم ہے؟

ہم کہتے ہیں کہ جمہوریت کی فکر اپنی اساسی فکر یعنی ”دین اور زندگی کی جدائی“ کی فکر سے نکلی ہوئی ہے اس لیے اس کا بھی وہی حکم ہے جو اصل فکر کا ہے۔ یہ بھی اس مردود اصل کی شاخ ہے جس کے علمبردار کو کافر سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات تو معلوم ہے ہی کہ ”دین اور زندگی کی جدائی“ کی فکر مسلمانوں کی بنیادی فکر ”لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ“ سے متصادم اور متناقض ہے، اس طرح یہ مسلمانوں کے عقیدے سے نکلنے والے افکار سے بھی متصادم ہے یہ افکار جیسے: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ {يوسف: 40} ”حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو

حاصل نہیں، اسی نے یہ حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہی سیدھا سیدھا دین ہے لیکن زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔“

اللہ کا یہ ارشاد کہ: ﴿وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ {یوسف: 40} ”لیکن زیادہ تر لوگ نہیں جانتے۔“

اس کا مطلب ہے کہ اللہ رب العالمین نے جو یہ فیصلہ کیا ہے کہ قانون ساز صرف اللہ ہی ہے اس سلسلے میں اکثریت کی رائے کا کوئی اعتبار نہیں۔ اسلامی نظام میں اللہ کا کلمہ ہی بلند ہوگا۔ امر، نہی اور حلال و حرام کا تعین اس زبردست، بڑے، علیم اور خبیر ذات ہی کی طرف سے ہوگا، اللہ کے سوا کسی مخلوق کی طرف سے نہیں ہوگا۔ کوئی فرد یا کوئی جماعت قانون سازی میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے ساتھ ذرہ برابر بھی شریک نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تنہا ہی حکم دیتے ہیں: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ {یوسف: 40} ”حکم تو صرف اللہ کا ہے۔“

اور کوئی نہیں جو اللہ کے حکم کو بدل دے: ﴿لَا مُعَقَّبَ لِحُكْمِهِ﴾ {الرعد: 41} ”کوئی نہیں جو اس کے حکم کو توڑ سکے۔“

پھر کیونکر جمہوریت کی سیاہ رات اور اسلام کا روشن دن جمع ہو جائیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اس کی تصریح کی ہے کہ: ﴿وَإِنْ تَطِيعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ {الانعام: 116}

”اگر تم زمین میں اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے ہٹا دیں گے، محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔“



مزید فرمایا: ﴿وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ {البقرة: 216} ”اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو حالانکہ اس میں تمہاری بھلائی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بُری ہوگی اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔“

### طاغوت کیا ہے؟

اسلام نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے پاس فیصلہ لے جانا طاغوت سے فیصلہ کروانا ہے، ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ {النساء: 60} ”کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اس چیز پر ایمان لایا جو تم پر نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی گئی پھر یہی لوگ اپنے فیصلے طاغوت (غیر اللہ) کے پاس لے جاتے ہیں حالانکہ ان کو اس کے انکار کا حکم دیا گیا ہے، اور شیطان ان کو گمراہی میں بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔“

طاغوت کا فیصلہ جاہلیت کا فیصلہ ہے، یہ ہر وہ فیصلہ ہے جو اللہ اور رسول ﷺ کے فیصلے کے خلاف ہے۔ ابن قیم اپنی کتاب ”اعلام الموقعین“ میں رقمطراز ہوتے ہیں کہ: ”طاغوت یہ ہے کہ بندہ اپنی بندگی کی حد سے نکلے یعنی اپنے معبود، متبوع یا مطاع سے تجاوز کرے۔ پس ہر قوم کی طاغوت یہ ہے کہ قوم اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی اور کے پاس

اپنے فیصلے لے جائے، یا اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کرے یا اللہ کی دی ہوئی بصیرت کے بغیر کسی کی پیروی کرے یا ایسی چیز میں اس کی اطاعت کرے جس کے بارے میں یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ کی اطاعت ہے۔“

قرآن نے کہہ دیا کہ جو شخص اپنے فیصلے طاغوت کے پاس لے جاتا ہے تو اس کا ایمان، دعویٰ اور گھمنڈ کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن نے طاغوت اور ایمان کو مد مقابل قرار دیا ہے ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنِ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ {البقرة: 256} ”جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لے آیا تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا۔“

امت مسلمہ جو قیامت کے دن اپنے رسول اللہ ﷺ کے بعد لوگوں پر گواہ ہوگی، لوگوں سے یہی کہے گی جو قرآن نے کہا ہے کہ: ﴿أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ {النحل: 36} ”اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔“

اس وجہ سے ”دین کی زندگی سے جدائی کی فکر“ اور اس سے نکلنے والے جمہوریت کے افکار طاغوتی افکار ہیں، اسلام نے ہم سے ان کو پھینکنے اور ان کا انکار کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔

یہ ہے جمہوریت اور یہ ہے اس کے بارے میں اسلام کا حکم۔ پھر کیا حقیقت ہے جس نے دنیا میں اس کو نافذ کیا: کیا یہ صورت حال شریفانہ اور خوبصورت ہے جس میں ہم رہنا پسند کرتے ہیں، یا یہ صورت حال وہ ذلت ہے جس میں رہنے والے اس کی آگ میں جل رہے ہیں اور اس کی تنفیذ کی وجہ سے بے کار اور ضائع ہو رہے ہیں؟

## مغرب کے نزدیک آزادیاں:

مغرب نے ”دین کی زندگی سے جدائی“ کی فکر کا سہارا لے کر اپنے آپ کو قانون سازی کا حق دار قرار دے دیا، مغرب نے یہ کہا کہ انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پسند کی زندگی گزارے کسی اور کی پسند کے مطابق نہیں۔ اپنی خواہش کے مطابق، کسی اور کے ارادے کے مطابق نہیں۔ انہوں نے یہ سمجھا کہ اس حق کا حصول صرف اس وقت ممکن ہے جب اپنی آزادی سے خوب فائدہ اٹھایا جائے۔ وہ اس حد کو پہنچ چکے ہیں جس کا اندازہ ان کے اعتقاد کی آزادی، ملکیت کی آزادی، رائے کی آزادی اور شخصی آزادی سے ہوتا ہے۔ آزادیوں کی یہ فکر ان کے نزدیک ایسی مقدس ہے جس کی کوئی بھی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ ان آزادیوں کے مقرر کردہ اصطلاحی معانی ہیں۔

عقیدے کی آزادی ہر فرد کو اس کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اس دین کو اختیار کرے جو وہ مناسب سمجھے گا۔ یا عقائد کو بدلتا رہے چاہے وہ ہر دن ایک نیا عقیدہ بناتا رہے، ان کے لیے تمام ادیان کو چھوڑ کر ملحد ہونا بھی مباح ہے۔

ملکیت کی آزادی انسان کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ جس چیز کا چاہے مالک بن جائے، جس کیفیت سے چاہے، اپنے مال میں اپنی پسند کے مطابق تصرف کرے، اگر وہ چاہے اپنا مال اپنے کتے کو ہبہ کرے اور اپنے وارثوں کو اس سے محروم کرے۔ کوئی اس کو اس سے نہیں روکے گا۔

رائے کی آزادی کی وجہ سے وہ جو چاہے کہہ سکتا ہے، چاہے وہ حق ہو یا باطل، کوئی اس سے باز پرس نہیں کر سکتا، وہ ہر اس رائے کی مخالفت یا اس پر تنقید کر سکتا ہے جو اس کی عقل اور خواہش کے خلاف ہو۔ اس سے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔

شخصی آزادی نے افراد کے اپنے ذاتی معاملات میں ہر قسم کے تصرف کو مباح قرار دیا وہ اس معاملے میں کسی قیمت یا اخلاقی و روحانی اقدار کے پابند نہیں۔

آزادی کی اس فکر نے جو کہ جمہوریت کے لوازم میں سے ہے ان لوگوں کو جو اس کو اپنائے ہوئے ہیں پستی میں اس قدر آگے لے گئی ہے کہ وہ جانوروں کے گلے سے بھی پست سطح تک پہنچ گئے۔

اعتقاد کی آزادی نے سرمایہ داری معاشرے میں دین کو غیر اہم کر کے رکھ دیا۔ دین کے معاملے میں فرد کے ساتھ اتنی نرمی کی کہ فرد کے لیے اس کو مباح کر دیا کہ وہ اپنے دین کو ایسے تبدیل کر سکتا ہے جیسے اپنا لباس بدلتا رہتا ہے۔ مادی فکر کے پھیلنے اور دینی فکر کے ختم ہونے سے اخلاقی، انسانی اور روحانی قیمتیں ختم ہو گئیں۔ لوگوں کے اندر سے رحم ختم ہو گیا اور وہ بھیڑیوں کی طرح زندگی گزارنے لگے، جہاں طاقتور اپنے سے کمزور کو ستاتا ہے۔

رائے کی آزادی نے لوگوں کو یہ اجازت دی کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں دعویٰ کریں۔ اس لئے ان کے معاشروں میں ہر قسم کی عجیب و غریب اور باطل رائے پیدا ہو گئیں جو حق اور حق کے پیمانے سے بالکل خالی تھیں۔ یوں کوئی بھی بکواس کر سکتا ہے جیسے سلمان رشدی، اس نے عقیدے کی آزادی کے آڑ میں اور رائے کی آزادی کے نام سے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی، اور کوئی قانون نہیں جو اس کو روکے۔

ملکیت کی آزادی اور منفعت کے معیار ہی کی وجہ سے سرمایہ داریت وجود میں آئی جس نے اقوام عالم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے، اقوام کی دولت پر قبضہ کرنے، ان کے وسائل کو لوٹنے، اور ان کا خون چوسنے کے لئے استعمار کا طریقہ اپنایا، یہی وجہ ہے جو لوگوں کو حرام کمائی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے پر اکساتا ہے، اقوام کے خون کا سودا کرتا ہے، اپنی پیداوار اور جنگی مصنوعات کی فروخت کے لیے اقوام عالم میں فتنوں اور جنگوں کی آگ بھڑکاتا ہے، جس پر بیش بہا دولت ضائع ہو جاتی ہے۔ یہ سرمایہ دار ممالک ہر قسم کی روحانی، اخلاقی اور انسانی قیمت سے عاری ہو چکے ہیں۔ بلکہ یہ دین کو اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ان کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو، یہ اخلاق اور انسانیت کی باتیں کر کے اپنے منحوس چہرے اور اپنے تعفن کو چھپاتے ہیں۔

شخصی آزادی نے جمہوری ممالک کے معاشروں کو پست اور چوپایوں والا معاشرہ بنادیا ہے، وہ گھٹیا پن میں جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ گئے ہیں، ان کے قوانین نے ہم جنس پرستی کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ جنسی بے راہ روی میں جانوروں سے بھی آگے نکل چکے ہیں، اجتماعی طور پر جنسی آگ بجھاتے ہیں۔ اس معاملے میں اپنے محارم کا بھی لحاظ نہیں رکھتے جیسے ماں، بیٹی، بہن بلکہ وہ حیوانات سے بھی بد فعلی کرتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسے امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔ ان کے معاشروں میں خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے، ایک ہی خاندان کے افراد کے درمیان رحم کا فقدان ہے، شخصی آزادی، ہر قسم کی قیمت، خاندانی نظام اور ہر قسم کی پابندی سے آزادی ہے۔ اسی شخصی آزادی کی وجہ سے تمام تباہ کاریاں اور تمام محرمات مباح سمجھے جانے لگے۔

چنانچہ وہ زنا، لواطت، جانوروں سے بد فعلی، ننگا ہونے، شراب پینے اور برے سے برے کام کرنے میں آزاد ہیں وہ آزادی کی انتہا تک جاتے ہیں ان پر کوئی دباؤ نہیں۔ یہ ہیں جمہوریت کے آثار۔ کیونکہ جمہوریت انسانی خواہش کا نتیجہ ہے اللہ کی طرف سے نہیں۔ یہ آسانی وحی پر اعتماد نہیں کرتی۔ اس کا کسی دین سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر ہم پیچھے کی طرف لوٹیں اور دیکھیں کہ جمہوریت اس کے علمبردار مفکرین کی عقلوں میں کس طرح، کیوں اور کن حالات میں پیدا ہوئی تو ہمیں واضح طور پر معلوم ہو جائے گا یہ کفریہ اساس پر وجود میں آئی۔ یہ پندرہویں لوئیس کے اس قول کے رد میں کہ: ”ہمیں یہ تاج اللہ ہی کی طرف سے پہنایا گیا ہے۔“ اور چودھویں لوئیس کے اس قول کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی کہ: ”بادشاہوں کا اختیار خالق کی جانب سے تفویض کردہ ہے۔ اس لیے اس کا منبع اللہ ہے عوام نہیں۔ بادشاہ اس کی تفہیم کے بارے میں اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے جوابدہ نہیں۔“ مفکرین نے جیک روسو کی اجتماعیت کے نظریے کو فرانس کے سیکولر انقلاب کی بنیاد کہا ہے۔

اس سب کچھ سے واضح ہو گیا کہ کس طرح اسلام اور جمہوریت میں مکمل طور پر تضاد اور تناقض ہے، چاہے یہ اس مصدر کے لحاظ سے ہو جہاں سے جمہوریت آئی ہے، یا اس عقیدے کے لحاظ سے ہو جس سے جمہوریت پھوٹی ہے، یا اس اساس کے لحاظ سے ہو جس پر جمہوریت قائم ہے، یا ان افکار اور نظاموں کے لحاظ سے جنہیں جمہوریت اپنے ساتھ لائی ہے۔

وہ مصدر جہاں سے جمہوریت آئی ہے وہ انسان ہے۔ جمہوریت میں افعال اور اشیاء پر حُسن اور قبح کا حکم لگانے کے لیے جس چیز کی طرف رجوع کی جاتی ہے وہ خواہش اور وقتی مفاد ہے۔ جمہوریت کو سب سے پہلے یورپی مفکرین نے متعارف کروایا۔ اسلام تو بالکل اسکے

برخلاف ہے۔ اسلام اللہ کی طرف سے ہے، جس کو اللہ نے اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ کی طرف وحی کیا۔ اسلام میں حکم لگانے کے لیے جس چیز کی طرف رجوع کیا جاتا ہے وہ عقل نہیں بلکہ صرف شرع ہے، عقل شرعی نصوص کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

وہ عقیدہ جس سے جمہوریت پھوٹی ہے وہ ”دین کی زندگی سے جدائی“ کا عقیدہ ہے یہ حل وسط (درمیانی حل) پر مبنی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ اگرچہ دین کا مکمل انکار نہیں کرتا، تاہم زندگی اور ریاست میں دین کی مداخلت کو ختم کرتا ہے۔ یوں انسان خود اپنا نظام بنائے گا۔ اس کے عقیدے کی اساس پر ہی اس کی تہذیب اور اس کی فکر اور نقطہ نظر قائم ہوگا۔

جبکہ اسلام اس سے بالکل متضاد ہے۔ اسلام اس اسلامی عقیدے پر مبنی ہے جس کی رو سے انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات اور ریاست کے حوالے سے اللہ کے اوامر ونواہی کا پابند ہے۔ یعنی اسلامی عقیدے سے نکلنے والے شرعی احکامات کا پابند ہے۔ اسی عقیدے کی اساس پر اس کی تہذیب قائم ہے اور اسی پر اس کے فکری نقطہ نظر کا تعین ہوتا ہے۔

جس بنیاد پر جمہوریت قائم ہے وہ یہ ہے کہ حاکمیت اعلیٰ عوام کے پاس ہے، عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں، اس بنیاد پر جمہوی نظام میں تین اتھارٹیز (اختیارات) ہیں: قانون ساز اتھارٹی، انتظامی اتھارٹی (ایگزیکٹو) اور عدالتی اتھارٹی، تاکہ یہ عملی طور پر عوام کی حاکمیت اور اختیار کی ترجمانی کریں جبکہ اسلام میں حاکمیت اعلیٰ شرع کے پاس ہے، امت کو قانون سازی کا حق نہیں، لیکن اسلام نے اللہ کے اوامر ونواہی کی تنفیذ کی ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی ہے، پھر شرعی نصوص کے مطابق خلافت کے قیام کو اس کا مظہر قرار دیا ہے۔

جمہوریت اپنے ساتھ جو نظام اور افکار لائی ہے وہ مفاد اور خواہش پر مبنی ہیں، جبکہ اسلام کے قوانین شرعی نصوص اور ان سے شرعی احکامات کے استنباط پر قائم ہیں، یعنی یہ پابندی اور ہدایت کی پیروی پر مبنی ہیں۔ یہ کہنا کہ جمہوریت میں بعض اچھی چیزیں بھی ہیں جن سے اسلام استفادہ کر سکتا ہے یہ بھی مردود اور مسترد ہے اس کی کوئی دلیل نہیں۔ ہم نے جمہوریت کو اچھی طرح دیکھ لیا اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بدترین صورتحال کا بھی مشاہدہ کیا، اس لئے اس میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی ایسی نہیں، جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی بہترین امت کے لیے ضروری ہو، کیا اسلام میں کوئی کمی ہے جس کو ان چیزوں سے پورا کیا جائے۔

### سائنس اور ٹیکنالوجی مغربی تہذیب کا ثمر ہرگز نہیں:

ایک سوچ یہ بھی پائی جاتی ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مغرب کی ترقی دراصل جمہوریت کا ثمر ہے۔ جو لوگ اس خیال کی وکالت کرتے ہیں دراصل حقیقت کے متعلق علم نہیں رکھتے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنسی تجربات کی بنیاد پر اخذ کئے گئے ایجادات دراصل وہ اشیاء ہیں جن کی خاطر اللہ نے انسانی ذہن کو لیاقت بخشی تاکہ وہ انسانی ضرورتوں کے لئے انہیں حاصل کر سکیں اور نظریہ زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس قابلیت کا مشاہدہ ہم سرمایہ داروں، کمیونسٹوں اور مسلمانوں غرض ہر کسی کے پاس پاتے ہیں جو بھی اپنے ذہن کو آزادانہ طریقے پر استعمال کرتا ہے۔ کوئی دین یا نظریہ زندگی اس ترقی پر اثر انداز نہیں ہو پاتا سوائے اس صورت میں کہ اس نظریہ زندگی میں سائنس اور ذہن کے آزادانہ استعمال کی اجازت



موجود نہ ہو یا پھر وہ سائنس کی راہ میں رکاوٹ ڈالتی ہے جس طرح کلیسا نے اس سے قبل مغرب میں کیا۔ اور یہ حقیقت ہر کسی پر ظاہر ہے کہ اسلامی نظریہ زندگی اشیاء کے مشاہدات اور ان کے ادراک و فہم کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ ان کو اہم فریضہ قرار دیتا ہے تاکہ وہ اسلامی نظریہ زندگی کی خود مختاری و غلبہ کے مقصد کے لئے طاقت کی تیاری میں استعمال ہو سکیں۔

مغرب نے ہمیں اس کی فاسد شیطانی چیزیں پیش کی ہیں: مثلاً جمہوریت جسے اختیار کرنا شرع نے ہم پر حرام کیا ہے جبکہ وہیں اس کی دوسری چیزوں سے ہمیں روک دیا ہے مثلاً مختلف قسم کے سائنس اور ایجادات جنہیں اختیار کرنے سے ہمیں شرع نے نہیں روکا ہے۔ اور اپنے ایجادات اور سائنس سے ہمیں روکا کیونکہ یہ امور طاقت اختیار کرنے کے وہ وسائل ہیں جن کی ہمیں ضرورت ہے اور شرع اس کے لینے کو ممنوع بھی نہیں قرار دیتی۔ مغرب نے اپنے اس عمل سے بتایا کہ وہ جو کرتا ہے پوری طرح اسے پتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض مسلمان جماعتیں ان حقائق سے روشناس ہونے کے باوجود ان سے نظر پھیر کر مطمئن کیونکر ہو سکتی ہیں؟

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو یہ کہتا ہو کہ جمہوریت اسلام ہی کی دین ہے دراصل وہ ایسا شخص ہے جو نہ ہی اسلام کی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور نہ ہی جمہوریت کی سمجھ رکھتا ہے۔

## جمہوریت شوریٰ قطعاً نہیں:

ان لوگوں سے جو علم کے دعویدار ہیں، اکثر یہ جملہ سن کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ 'اسلام کی ابتدا جمہوریت کے ساتھ ہوتی ہے اور اختتام آمریت کے ساتھ۔ دلیل کیا ہے؟ کہتے ہیں اس کی دلیل اللہ عز و جل کا یہ قول ہے: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ {آل عمران: 159} ”اور (اہم) امور میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پھر جب تم رائے پختہ کر کے کسی بات کا عزم کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔“

ایک اور بھی فکر ہمارے اس موضوع سے متعلق ہے وہ یہ کہ اسلام جمہوریت کو تسلیم کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اور قولی و فعلی سنت شوریٰ کی بات کرتی ہے۔ بالفاظ دیگر جمہوریت شوریٰ کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ تو جیسا کہ جمہوریت لوگوں کی رائے لینے پر قائم ہوتی ہے اور اس کو قبول کرتی ہے اسی طرح اسلام نے لوگوں سے رائے لینے کا حکم دیا ہے، اپنے اس موقف کی تائید میں مندرجہ ذیل دلیل پیش کرتے ہیں: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ {آل عمران: 159} ”ان کے معاملات میں ان سے مشورہ طلب کرو“

یہ ارشاد بھی ہے: (وَأْمُرْهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ) (الشوریٰ: 38) ”ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں“

اور نبی کریم ﷺ عملی، سیاسی اور حربی زندگی میں اپنے اصحاب سے مسلسل مشورہ طلب کیا کرتے تھے اور ان کی رائے کو قبول بھی فرماتے تھے۔ چونکہ یہ قرآن کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہے لہذا مسلمانوں کو اس کی اطاعت کرنا چاہیے۔ مزید وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ شورایت اور جمہوریت کے درمیان صرف

الفاظ کا فرق ہے اور جب تک ان کے معنی میں فرق موجود نہ ہو تو الفاظ کا مختلف ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ جمہوریت کی دعوت دینے والے مختلف لوگ اور گروہ ہیں، ان میں فریب دینے والے شیطان بھی ہیں اور ایسے مخلص افراد بھی ہیں جو جمہوریت کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔ وہ جماعتیں جو سنجیدہ اور مخلص ہیں ان پر اتنا لازم ہے کہ وہ خود کو اس قسم کے افکار سے دور رکھیں، ورنہ وہ اُن لوگوں کی مثل ہو جائیں گے جو شعور اور علم کے بغیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور ایسا فعل انہیں گناہ میں مبتلا کر دے گا۔ مخلص اور سنجیدہ شخص کی فطرت یوں ہوتی ہے کہ وہ توبہ کرنے والا ہوتا ہے، پرہیز گاری اختیار کرتا ہے اور عبرت حاصل کرتا ہے۔

ان سے قبل بھی اِس قسم کے افراد سامنے آئے تھے، جنہوں نے کہا تھا کہ اشتراکیت بھی دراصل اسلام سے ہے اور حضور اقدس ﷺ ان کے امام ہیں، لہذا اب جبکہ اشتراکیت کا سڑانڈ واضح ہو چکا ہے تو وہ کیا جواب دیں گے؟

بالکل یہی حالت جمہوریت کی ہے یہ نزع کی کیفیت سے دوچار ہے اور اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے، اس امر کو حالات حاضرہ میں موجودہ انسانی مسائل و بحران کو حل کرنے میں جمہوریت کی ہر طرح سے ناکامی کے ذریعے محسوس کیا جاسکتا ہے، خود جمہوریت کے علمبردار مغرب میں جمہوریت اس وقت اپنی آخری سانسیں گن رہی ہے۔ لہذا اِس دعوت والوں نے جمہوریت سے آخر ایسی کونسی اُمیدیں وابستہ کی ہیں؟ اس قسم کے نظریات اسلام کے لئے کسی بھی صورت میں سود مند نہیں ہیں، البتہ جمہوریت کے لئے فائدہ مند ضرور ہیں اور اُس کو

مزید استحکام بخشنے ہیں۔ ایسے افراد بجائے اس کے کہ جمہوریت کے باطل پن کا پردہ فاش کریں وہ اس کو اعلیٰ ترین فکر تسلیم کر کے اختیار کرنے لگتے ہیں۔ بعد ازاں وہ اس کو لوگوں تک منتقل کرتے ہیں، بجائے اس کے کہ وہ اُسے پیروں تلے روند ڈالیں اس طرح وہ درحقیقت جمہوریت کا پرچم بلند کرنے میں مدد کرتے ہیں۔

اللہ کے حکم کا نفاذ اور اُس کی تعمیل صرف اللہ کا کلمہ کو بالادست بنانے اور اس کو بلند کرنے سے ہوتی ہے، دین کو اللہ کے لئے خالص کرنے سے ہوتی ہے اور یہ عمل ایسی جماعت کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے جو فہم اور ادراک میں ہدایت یافتہ ہو اور اس کی تاسیس بصیرت کی ساتھ ہوئی ہو، عقیدہ کے متعلق اس کی فکر روشن ہو، اُس میں شرعی احکام کی گہری فہم و ادراک موجود ہو اور اجنبی تصورات اور غیر اسلامی اصطلاحات کی نفی کرتی ہو۔ جو حالات کے تحت جھکاؤ کو قبول نہ کرتی ہو اور نامناسب حالات اس پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں۔

## کفر نظام میں شامل ہونا اور حصہ دار بننا

دین کی تکمیل کی جاچکی ہے اور اللہ کا احسان مکمل ہو چکا ہے، پس اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ {الانعام: 115} "اور تمہارے رب کا کلام سچائی اور انصاف میں کامل ہے۔ اُس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ وہ ہر بات سننے والا، ہر بات جاننے والا ہے۔"

بے شک یہ اللہ کا اپنے بندوں پر احسان ہے کہ اس نے ان کے لئے دین کو مکمل کیا اور اپنی نعمت کو ان پر کامل کر دیا۔ اللہ رب العزت نے قرآن کی حفاظت فرمائی اور کسی بھی قسم کی تحریفوں اور تبدیلیوں سے محفوظ کر دیا ہے، چنانچہ اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ {15:9} "یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

اللہ نے اس قرآن کی حفاظت فرمائی تاکہ یہ یوم آخرت تک انسانوں کے لئے ایک ثبوت یا ان پر حجت کی حیثیت سے باقی رہے۔

چونکہ رسول ﷺ کی سماعت خیر والی تھی جس نے اس زمین پر آسمانوں سے آئے ہوئے اس آخری نازل کردہ پیغام کو سنا، لہذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ نبوت کی وراثت کو بخوبی انجام دیں۔ یعنی قرآن کو پکڑ کر رکھیں اور سنت کو اپنے دانتوں تلے دبا کر رکھیں، یہی ان

کو حکم دیا گیا ہے، وہ عین اس طریقہ پر رہیں گے جس پر نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب قائم تھے۔ متعدد نصوص ہیں جن سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔

جب دعوت پہنچانے کے عمل میں دوسری اقوام عالم کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق ہوتا تھا اور ان پر اپنا خالص دین پیش کرتے، عقل کے مطابق دین اور دین فطرت پیش کرتے، تو مقابلے میں دوسری قومیں مسلمانوں کے سامنے بھی اپنا دین پیش کرتی تھیں، مقصد مدافعت یا ان کے دین کا دفاع ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ بسا اوقات مسلمان لاشعوری طور پر ان کے نظریات سے متاثر بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس سے ان کی دعوت اور فہم پر منفی اثرات پڑتے تھے، مگر کچھ عرصہ بعد ہی مسلم علماء کو اس بارے میں احساس ہوا، یہ ایسے علماء تھے جنہیں اللہ نے اسلام کے مینار اور سنگ میل بنایا اور جن کی جدوجہد نے حق (اسلام) کو مزید واضح کیا۔ اس طرح انہوں نے دین کو کفریہ افکار سے خالص کیا جو دین میں شامل ہو گئے تھے اور جو آغاز سے اصل دین کا حصہ نہیں تھے۔ انہوں نے تحریف کو روکا اور دین کے اندر ملاوٹ کا ابطال کیا، یوں دین کو اس کی چمک واپس دلادی۔ چنانچہ مسلمان ہمیشہ ہی اچھے اور برے دور سے گذرتے رہے۔ حتیٰ کہ اس زمانہ کا فتنہ سامنے آیا۔ اب ہم کس طرح اس فتنہ سے اپنے آپ کو بچائیں؟

ہماری یہ حالت ہم سے تقاضا کرتی ہے کہ ہم ان اسباب کی طرف پلٹیں جو اس دین کے آغاز سے ہی اس کی خیر کا باعث بنی تھیں تاکہ اسلام کو دوبارہ اس کی اوّل حالت میں لے جایا جاسکے۔

اسلام کو ہر شبہ سے پاک رکھنے، ہر تحریف اور کھوٹ کو باطل کرنے، ہر فریب کا پردہ فاش کر کے اسے مسترد کرنے کے لئے ہمیں خود کو مغرب کی فاسد ذہنیت (عقلیہ) سے اپنے آپ

کو بچانا ہو گا جو مغربی استعمار کے نتیجہ میں مغرب سے ہمیں ورثہ میں حاصل ہوئی ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جو ہماری دعوتی ذمہ داریوں کے متعلق ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم انہیں منفعت اور حرص و آرزو کی بنیاد پر پرکھیں، پھر تو ایسا ہو گا کہ جو بھی عمل ہماری اس ذہنیت کے موافق ہو یعنی خواہشات اور گمان کو تسلی بخشتا ہو اُسے انجام دیں گے اور جو بھی افعال اس ذہنیت کی مخالفت میں ہوں یعنی بے چینی کا باعث بنتے ہوں اُن سے کنارہ کشی اختیار کر لیں گے۔ اس ذہنیت کے زیر اثر پھر ہم شرعی احکامات کی ایسی تاویلات اور تشریحات کرنے لگیں گے، جو ہمارے نظریات کی تائید کر سکیں۔ اور نصوص کو اپنی رائے کی صحت پر دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔ صحیح اسلامی ذہنیت (عقلیہ) کی بنیاد اس امر پر ہوتی ہے کہ حکم صرف اللہ ہی کے لئے ہے۔ اللہ کے حکم کو سمجھنے کے دوران قطعی اجازت نہیں کہ ہم اپنی خواہشات اور رجحانات کو ملحوظ رکھیں اور نہ ہی ہماری خواہشات کو اُس پر غالب ہونے دیں۔ یا ہم اپنے دشمنوں کا خوف، لوگوں سے علیحدہ ہو جانے کا ڈر، حکمرانوں کی دین میں عدم دلچسپی، حالات یا مصلحت کا ظاہر نہ ہونا وغیرہ کو دعوت کے حاملین کے لئے اس بات کا جواز بنائیں کہ وہ دعوت کا بوجھ ہلکا کریں، یا مسلمانوں کے لئے آسانی پیدا کریں۔ کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ العلیم و الخبیر ہے، اللہ انسانوں کی فطرت کو جانتا ہے، وہ اُن کی ضروریات سے واقف ہے اُن کی استطاعت سے واقف ہے، اُن حالات کی حقیقت کا علم رکھتا ہے جن میں وہ زندگی بسر کرتے ہیں، یہ بھی جانتا ہے کہ کون اُن کے دشمن ہیں اور ان سے کس طرح نمٹا جائے ان تمام کے علاوہ بھی اللہ تمام چیزوں سے باخبر ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اجتہاد کے واحد صحیح طریقہ کی بنیاد یہ ہے کہ جس کسی مسئلہ کا حل تلاش کرنا ہو سب سے اوّل اس کی حقیقت کے متعلق کلی طور پر فہم

وادراک حاصل کر لیا جائے، اس کے بعد شرعی نصوص میں مسئلہ سے متعلق موجود اشارات و دلالت کے ذریعے مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح یہ عمل خالصتاً اُس مسئلہ کے متعلق اللہ کے اصل حکم کی معرفت کرواتا ہے، بہ الفاظ دیگر اگر ہم اس طریقہ سے آگے بڑھیں تو یہ ایسا کہنے کا مصداق ہو گا کہ جس حقیقت میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، مع اس کے تمام حالات اور مختلف پہلوؤں اور تمام مصائب و پریشانیوں کے جس مصلحت کا حصول ہم چاہتے ہیں: اس واقع کے لئے اللہ کا حکم یہ ہے۔ ایسی حقیقت کے متعلق اللہ ربّ العزّت کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقَدَّمُوا يَدَيِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ {الحجرات: 1} "اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے نہ بڑھا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ یقیناً سب کچھ سنتا، سب کچھ جانتا ہے۔" (وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُمْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا) {الاحزاب: 36} "اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کر دیں تو نہ کسی مؤمن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے نہ کسی مؤمن عورت کے لئے کہ اُن کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جس کسی نے اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔"

ان دونوں ذہنیاتوں کے درمیانی فرق کے باعث اُن احکام کے فہم کے متعلق زبردست تضاد پیدا ہوا ہے کہ جن کے ذریعے مسلمان اپنی اس حالت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جن کے ذریعے ان حالات میں اُن کے حل چاہتے ہیں۔

علاوہ ازیں امر واقع یہ ہے کہ یہ ذہنیت جو مغربی افکار سے متاثر و مرعوب ہے، بعض قطعی شرعی عبارتوں کی معطلی کی ذمہ دار بھی ہے اور اُن شرعی نصوص سے کسی شرعی دلیل کے



بغیر دوسرے افکار کی طرف منتقل ہونے کی ذمہ دار ہے، ان تمام کو مصائب، پریشانی میں گھرنے کی صورتوں اور متعلقہ حالات، منفعت اور نقصان سے احتراز کے نام پر جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سود سے متعلق قطعی طور پر حرمت کا حکم موجود ہے، جس کی عبارت بالکل واضح ہے جو کسی بھی تشریح کی محتاج نہیں ہے اور تاویلات کی گنجائش بھی ہرگز موجود نہیں ہے۔ اس زمانہ کی حقیقت اور اس کے حالات، جلبِ منفعت اور دفعِ نقصان سے احتراز کے نظریہ نے انہیں دوبارہ سوچنے کے لئے مجبور کر دیا اور ان کی سوچ کو اس بری طرح متاثر کیا کہ وہ ان نظریات کے زیر اثر سود (رباء) کے متعلق جواز کا حکم نکال لائے۔

اسی طرح کچھ جماعتیں جو اس ذہنیت کے زیر اثر تشکیل پائیں اور وہ بھی ایسے احکامات نکال لائے، جن کا شرع سے کوئی ثبوت نہیں ملتا بلکہ ان کے وہ احکام صراحتاً شرع کے مخالف ہیں۔ یہ بات ان کے اس نعرے سے ظاہر ہے کہ جمہوریت اسلام سے ہے جبکہ درحقیقت جمہوریت اسلام سے متضاد ہے جیسا کہ پچھلے صفحات میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کر ڈالا کہ ان جاہل نظاموں میں شرکت شرع کی رو سے جائز ہے اور آج بھی اللہ کے قانون کے نفاذ کے لئے سرگرم عمل اسلامی تحریکات کے سامنے موجود واحد راستہ ہے۔ حالانکہ ایسا دعویٰ کلی طور پر قرآن کی آیات اور رسول ﷺ کی سنتوں کی صریح خلاف ورزی ہے۔

جب ہم نے تدّرج کے نظریہ کی اسلام کے نفاذ کے لئے استعمال کرنے اور اس کی طرف دعوت دینے میں اس کے فساد کو واضح کیا، ساتھ ہی ہم نے اس نظریہ سے جڑے ہوئے فکری فساد کی بھی وضاحت کی ہے، مثلاً کفریہ نظاموں میں شرکت کی سوچ۔ مگر اس سوچ سے

متعلق شکوک و شبہات رفع کرنے کی خاطر اس موضوع پر کچھ مزید غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ اس سوچ کے حامی افراد کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہ سکے۔

ہم یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک ان گروہوں کی شرع کے فہم کے متعلق ذہنیت کی تصحیح نہیں ہو جاتی، تب تک انہیں کی جانے والی ہر نصیحت بے سود ثابت ہوگی، ایسا اس لئے ہوگا کہ اگر انہیں اقتدار میں شرکت کی وجہ سے پیدا ہونے والی خرابیوں کے متعلق مطمئن بھی کر دیا جائے، لیکن اگر ان کی ذہنیت تبدیل نہ ہوئی ہو تو ہم بہت جلد ان حضرات کو اسی ذہنیت کے زیر اثر اسی قسم کا دوسرا متبادل تلاش کرتے پائیں گے۔ لہذا ہمیں اس قسم کی ذہنیت کے متعلق حد درجہ محتاط رہنا ہوگا جو شرع کے موافق نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی ذہنیت ہی ایسے گمراہ افکار کو جنم دیتی ہے۔

تو اقتدار کی شرکت سے کیا مراد ہے اور اس کے قائل اس فعل کے لئے کیا کیا جواز پیش کرتے ہیں؟

شرکت سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ایسی حکومت میں شرکت کریں گے جس کی حکمرانی کی بنیاد اسلام کے علاوہ ہو اور حکومت کریں تو اللہ کے احکام کے علاوہ سے کریں اور یہ فعل جمہوریت کا کھیل کھیلنے کے بعد پارلیمنٹ میں داخلہ حاصل کر کے کیا جاتا ہے، تاکہ اس داخلہ کے ذریعے انہیں اور ان کے افکار کو اقتدار کے ایوانوں میں پہنچایا جاسکے اور ان کے مطابق کچھ مدت کے بعد وہ تنہا اقتدار کو اپنے قبضہ میں لے لیں گے اور یہ قبضہ انہیں تدریج کے ذریعے حاصل ہوگا، جو کہ ان کی ذہنیت کے تحت اسلام سے منظور شدہ ہے۔ ان

کی نظر میں شرکت کے جائز ہونے کے وہ کچھ عقلی اور کچھ شرعی دلائل ہیں۔ عقلی جواز کا خلاصہ یوں ہے:

☆ اسلام کے اقتدار تک پہنچنے کی جو تاریخی شکل تھی، آج کے حالات میں ممکن ہوتی نظر نہیں آتی ہے، یہ اس لئے ہے کہ مسلم دنیا کے مختلف گوشوں پر دراصل اقتدار کے طاقتور مرکزی اداروں کا تسلط ہے اور جنہیں ان مختلف بین الاقوامی طاقتوں کی حمایت اور مدد حاصل ہے جو اس وقت کی زبردست مادی اور معنوی طاقتوں کی مالک ہیں۔ اور یہ ان مسلمانوں کی ہر ایک نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہیں جو اسلام کے لئے متحرک ہیں اور ان کی مسلسل کوشش ہے کہ ان مسلمانوں کو قابو میں رکھا جائے اور انہیں کبھی کامیاب ہونے کا موقع نہ دیا جائے۔

چونکہ اس ذہنیت کے حامل افراد کے نزدیک اسلام کے لئے اقتدار کے حصول کی خاطر اسلام کے ماضی سے قیاس کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یعنی آج کل کے حالات کا ماضی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا، لہذا اس کے لئے ان کو وہاں سے آج کوئی راہنمائی نظر نہیں آتی ہے۔

☆ ماضی میں تمام مسلمان اسلامی دعوت کے نظم میں شریک ہوا کرتے تھے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی جماعت موجود تھی اور پورا معاشرہ اس اسلامی دعوت کی ذمہ داری ادا کیا کرتا تھا، جبکہ آج جو جماعت ہوگی وہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت ہوگی۔ یہ حقیقت آج کی جماعت کو ایک مشکل حالت میں مبتلا کر دیتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اُمت کی قیادت کے تحت نہیں ہے۔ جسکی وجہ سے جاہلانہ نظام مسلمانوں کی اس صورت حال سے اپنے مختلف

مغاد پورا کرتے ہیں، اسی لئے اقتدار کے حصول کی خاطر جدید اسلامی تنظیمیں بھی معاصر جدید سیاسی پارٹیوں کی طرح خود کو پارٹی کے راستے پر ڈال دیتی ہیں۔

دور حاضر کی سیاسی پارٹیوں کا طریقہ کار چند ایسے اسالیب پر قائم ہوتا ہے، جس کے ذریعے وہ اقتدار تک پہنچ سکتے ہوں، ان کی یہ تدابیر اور اسالیب جمہوری کھیل، فوجی بغاوت یا مسلح عوامی بغاوت کے ذرائع سے ہوتی ہیں۔

کیونکہ معاصر اسلامی تحریکوں کے لئے دروازے بند ہو چکے ہیں، ان کے لئے مسلم ممالک کی افواج کے اندر کسی ایسی عسکری طاقت کا حصول ناممکن ہے جو انہیں فوجی انقلاب لانے کی قابل بنائے، اسی طرح موجودہ ظالم حکومتوں کے مسلسل ظلم و جبر کی وجہ سے وہ دروازہ بھی بند ہو چلا ہے جس کے ذریعے مسلح عوامی بغاوت انجام پاسکے، ایسی صورت حال میں معاصر اسلامی تحریکوں کے لئے جو واحد اور تیسرا راستہ باقی بچ جاتا ہے وہ سیاسی پارٹی کی حیثیت میں سرگرمیوں کا راستہ ہے اور یہ وہ راستہ ہے جو بالآخر غیر اسلامی احکام و قوانین میں شرکت تک لے جاتا ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے مرحلہ میں جس مقصد کی خاطر ان تحریکات کا قیام عمل میں آیا ہے اس میں جائز نہیں کہ فروغی پہلو جو اصل مقصد سے متناقص ہوتے ہوں، اصل مقصد کے خلاف بحث میں ان کا استعمال کیا جائے، کیونکہ اگر کسی معاملہ میں جزوی اور کُلّی کے متعلق اختلاف ہو جائے تب کُلّی کا وزن زیادہ ہوتا ہے اور ترجیح اس کی ہوتی ہے، اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شریعت اسلامی کی لچک اور اس کی واقعیت جزوی طور پر متعارض امور کی وجہ سے بڑے اہداف کو حاصل کرنے کے راستے میں رکاوٹ بنے۔ اسی طرح

درست نہ ہوگا کہ آپ مسلمانوں کو حصول اقتدار کے ایک ہی طریقہ کار پر مجبور کر کے ان کو مشقت میں ڈالیں حالانکہ وہ طریقہ کار مختلف حالات کے اعتبار سے غیر ممکن العمل معلوم ہوتا ہو۔ اور پھر جب اس طریقہ کار پر عمل مشکل ہو جائے تب اسے چھوڑ کر دوسرے، تیسرے یا چوتھے راستے کو اپنانا ممکن ہوگا بلکہ کبھی کبھی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان چاروں طریقہ کار کو متوازی خطوط میں استعمال کیا جائے اور بالآخر ان میں سے کسی ایک طریقہ کو ترجیح دیا جائے۔

### مندرجہ بالا عقلی بہانوں پر بحث اور ان کا جواب:

ان کے عقلی دلائل و اعذار کا انداز، جس کے ذریعے وہ شرع سے برخلاف جانے کو جائز ٹھہرا رہے ہیں یہ جتلاتا ہے کہ ان افراد کی تربیت (کلچر) کی بنیاد اصل اسلامی کلچر نہیں ہے، بجز اس کے کہ وہ کچھ اصولی و شرعی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن وہ باضابطہ اسلامی طریقہ تفکر نہیں رکھتے، بالخصوص اس امر میں کہ 'شرعی حکم کی تدوین میں معاملہ یا حقیقت کا فہم اور ادراک کس طرح حاصل کیا جائے؟' یا 'شرعی حکم کے فہم و ادراک کے متعلق'۔ انہوں نے اپنے اس عمل کے متعلق طریقہ کار اور اسلوب کے امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا۔ امکان ہے کہ شرع کے لچکدار ہونے کے نظریہ کے غالب ہونے کی وجہ سے ان کے ہاں احکام شرعیہ میں تساہل پیدا ہوا اور زمانے کی موافقت کے پیش نظر ان کے بدلے غیر شرعی احکام لے کر مطمئن ہو چلے ہیں۔

یہ کہنا کہ زمانہ کی تبدیلی اور اس کے ساتھ امور کے متغیر ہو جانے کی صورت میں ہمارے لئے رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار اور شرع کے احکام کو اختیار نہ کرنا جائز ہے۔ یہ کہنا

درست نہیں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ جس حقیقت کو وہ تبدیل کرنے کے خواہاں ہے اس کا بغور مطالعہ نہیں ہوا ہے۔ ایسا اس لئے کہ حقیقت کے متعلق اس کی دیگر متغیر صورتوں کے بالمقابل سب سے زیادہ اہم اس کی بنیادی خصوصیات ہوتی ہیں، مثال کے طور پر معاشرہ، اس کے بنیادی اجزائے ترکیبی (افراد، افکار، احساسات اور نظام) غیر متغیر ہیں جو کبھی بھی تبدیل نہیں ہوتے ہیں، خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو۔ مثلاً وہ قبائلی معاشرہ ہو یا عام ریاست ہو یا مخلوط ریاستی نظام ہو یا وہ جمہوری معاشرہ ہو یا آمریت ہو۔ یہ تمام اجزائے ترکیبی معاشرہ میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ چنانچہ معاشرہ کی تبدیلی کے لئے قابلِ غور اس کی بنیادی خصوصیات ہوں گی نہ کہ اس کی دیگر متغیر صورتیں، یعنی معاشرہ کی متعدد شکلیں معاشرہ میں تبدیلی لانے کے طریقہ کار پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر غلط افکار، غلط تصورات، معاشرہ میں موجود برے رسوم و رواج کے خلاف معاشرہ میں تبدیلی لانے کی نیت کے ساتھ نمٹنا اور مقابلہ آرائی کرنا وہ شرعی حکم ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے خود انجام دیا لہذا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ تبدیلی صرف اس حد تک ہوگی کہ معاشرہ کے افکار کبھی کھوکھلی حب الوطنی ہوتی ہے یا کبھی تنگ نظر قوم پرستی (نیشنلزم) یا نظریاتی سرمایہ داری یا پھر اشتراکیت کے افکار ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کسی بھی فکر سے زیادہ مضبوط نظریاتی بنیاد پر قائم فکر ہوتی ہے، لہذا اس کو اکھاڑ کر پھینکنا بھی اتنا ہی زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ افکار کے درمیان اختلاف کا فرق تبدیلی کے اس عمل کو مشکل یا آسان تو بنا سکتا ہے لیکن طریقہ کار کی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتا۔ اسی طرح نظام چاہے قبائلی ہو جیسا کہ نبی ﷺ کے زمانہ میں تھا یا پھر عام سی ریاست ہو یا پھر مخلوط ریاستی نظام ہو جیسا کہ اس زمانہ میں موجود ہے وہ تبدیلی کے طریقہ کار کے احکام کی تبدیلی کا باعث نہیں بن سکتا، حالانکہ وہ تبدیلی کے عمل میں رکاوٹ پیدا

کر سکتا ہے یا اس عمل میں مزید آسانی پیدا کر سکتا ہے۔ نظام جسے تبدیل کرنا ہو وہ خود کی حفاظت اور خود کو مجتمع رکھنے کی خاطر مسلح قبائل یا چاہے افواج پر انحصار کرتا ہو نظام کو ہمیشہ ایک قوت اس مقصد کے لئے درکار ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی سرگرمیاں بھی اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ایسی ہی کسی قوت (سلطہ) سے نصرت (مدد) طلب کرنے پر مرکوز تھیں جب رسول اللہ ﷺ نے نئے معاشرہ کی تعمیر کے لئے اقدامات شروع کئے تب انہوں نے معاشرہ کے ان اجزائے ترکیبی کو ملحوظ رکھا اور ان کی تبدیلی پر زور دیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسے افراد تیار کئے جو مضبوط ایمان کے حامل تھے اور جو دعوت کے بوجھ کو اٹھانے اور ریاست اسلامی کے قیام کے لئے تیار ہو چکے تھے اور یہی افراد مہاجرین بنے۔ اور اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے عوامی رابطہ کے ذریعے اسلام کے حق میں رائے عامہ ہموار کر کے عوام کو اس پر مجتمع کیا کہ وہ اسلامی دعوت کو قبول کرے اور اس دعوت کے حاملین کو قبول کرے اور ان کے درمیان ایک اسلامی ریاست کے قیام کو قبول کرے اور یہی لوگ انصار بنے۔ لہذا طلب نصرہ اقتدار تک رسائی کا ایک طریقہ قائم ہوا اور آخر تک رسول اللہ ﷺ ان مختلف رکاوٹوں، تکالیف اور مصائب کے باوجود جو انہیں طلب نصرہ کے دوران پیش آئیں، اس طریقہ کار پر ثابت قدم رہے اور بضربہ اللہ کامیاب ہوئے۔ جو بھی شخص کئی زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی سرگرمیوں کا مطالعہ کرتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ وہاں رسول اللہ ﷺ تبدیلی کے لئے ان بنیادی عناصر (اجزائے ترکیبی) کو مخاطب کر رہے تھے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کار میں وقت اور جگہ کے تبدیل ہونے کی وجہ سے کوئی تغیر نہیں آیا۔ کیونکہ مختلف معاشرہ اور مختلف خطوں کی خصوصیات کا آپسی فرق کا تعلق معاشرہ کے بنیادی

عناصر (اجزائے ترکیبی) سے نہیں بلکہ اس کی دیگر متغیر صورتوں سے ہیں اور ان خصوصیات کی نوعیت دراصل تبدیلی کے اس عمل کو مشکل یا آسان بناتی ہے۔

یہ رائے کہ شرع لچکدار ہے مسلمانوں کی عقلوں اور ان کی خواہشات کو اجازت نہیں دے دیتی کہ وہ لچک کے اس عذر کے ذریعے شرع کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ اللہ نے شرع کی تکمیل اس طرح کر رکھی ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسائل کا حل دے سکتی ہے چاہے وہ نئے مسائل ہوں یا پرانے ہوں یا قیامت تک پیش آنے والے مسائل ہوں۔ مگر یہ تمام حل باضابطہ اسلامی فقہی اصولوں کے دائرہ کے تحت ہوں، جس کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ حکم صرف اور صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی کے لئے ہے۔

"شرع بہت وسیع ہے" اس رائے کے استعمال کے ذریعے شرعی عبارتوں کو معطل کرنے کی اجازت ہرگز نہیں اور نہ ہی اس شے کو شرع میں داخلہ دینے کی اجازت ہے جو اس کے دائرہ سے باہر ہے۔ کچھ مسلمان علماؤں نے شرعی حدود کو اس رائے کے عذر کے تحت معطل کر دیا ہے انہوں نے رائے دی کہ حدود کے متعلق شرع کے مقاصد دفع و زجر (رکاوٹ) کے ہیں، لہذا جو کچھ بھی جرم کو دفع کر سکتا ہو وہ عین شرع کے مطابق ہے۔ اب چونکہ عام رائے کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ شرع کی تجویز کردہ سزائیں روح زمانہ سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اس کے علاوہ لوگوں کے قلوب و اذہان انہیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں اور اس سے انکاری ہیں، لہذا ہم کسی دوسری چیز کو بھی استعمال کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس مقصد کو پورا کرتی ہو۔ شرع اگر لچکدار نہ ہوتی اور ارتقاء پذیر نہ ہوتی تو ہم اسے انجام نہیں دے سکتے تھے۔



انہوں نے یہ بھی کہا کہ جہاد فی سبیل اللہ کا مقصد اسلام کی تبلیغ یا دین کا پھیلانا ہے اب چونکہ اسلام کی تبلیغ جہاد کے علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی ممکن ہے، یعنی جدید ثقافتی وسائل کے ذریعے مثلاً ریڈیو، ٹی وی اور دوسرے مختلف قسم کے ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی تبلیغ کا عمل ممکن ہے۔ لہذا ان ذرائع ابلاغ کو جہاد کے متبادل کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شرع اگر لچکدار نہ ہوتی اور ارتقاء پذیر نہ ہوتی تو ہم اسے انجام نہیں دے سکتے تھے۔

مزید انہوں نے اسلامی حکم کو منضبط کرنے کے متعلق کہا کہ جس کسی بھی طریقہ سے حکم اخذ ہوتا ہو اس کے مطابق بغیر کسی بندش کے اس پر چلا جاسکتا ہے۔ لازم نہیں کہ کسی مخصوص طریقے پر ہی حکم کو اخذ کیا جائے اور اس سے آگے نہ بڑھیں۔ یہ جمود اور سخت گیری ہوگی جو اسلام کی نرم خوئی، لچک اور جدت طبع سے میل نہیں کھاتا جس میں اللہ نے کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔

اس طرح یہ جملہ کہ ’اسلامی شرع لچکدار ہے‘ ان معنوں میں حرام ہے کیونکہ یہ دین کے قوانین کو معطل کر کے رکھ دیتی ہے اس کے علاوہ یہ اسلام کی فطرت کے عین مخالف ہے، یہ دراصل مغرب کے افکار سے متاثر ہے اور مغربی افکار کے خطوط کی اتباع کا مظہر ہے۔

اس رائے کے متعلق کہ ’جب جزوی حکم کلی حکم سے متناقص ہو تب کلی حکم اہم ہوتا ہے‘ یہ وہ جملہ ہے جس کی تشریح کی جانی ضروری ہے کیونکہ اس کا استعمال اس انداز سے کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جملوں اور علمائے اصول فقہ کے جملوں میں جو یکسانیت پائی جاتی ہے، ان جملوں کو بالکل انہی معانی و مطالب پر محمول نہیں کیا جاتا جو اصولی علماء مراد لیتے

ہیں، اس کے علاوہ مفاہیم اور معیارات میں بھی ناچٹنگی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں؛ مثلاً شرع اگر کسی مخصوص معاملہ میں نرمی دکھلائے یا کسی مخصوص امر کے متعلق موافق طرز عمل اختیار کرے تو یہ مخصوص حقیقت ان کے لئے کافی ہوتی ہے کہ وہ اسے عام اصول بنا کر ہر معاملہ اور ہر ایک حقیقت کے متعلق اس اصول کی بنا پر فیصلہ دے دیں۔

اسی امر کے متعلق جو ایک پہلو باقی رہتا ہے وہ یہ ہے کہ عقلی دلائل شرعی احکام کے اخذ کرنے میں کسی بھی انداز میں متاثر کن نہیں ہو سکتے۔ اصولی علماء نے واضح کیا ہے کہ حقیقت اور امرواقع دراصل حکم کی مناط کو تشکیل دیتے ہیں لیکن امرواقع نہ تو کوئی حکم لازم کرتا ہے نہ یہ کسی چیز کے لئے مانع بنتا ہے، بلکہ امر یا معاملہ کو جوں کا توں ہی سمجھا جاتا ہے، اس مرحلہ کے بعد ان شرعی نصوص کی طرف جن سے حکم اخذ ہوتا ہے، رجوع کیا جاتا ہے چنانچہ اصولی طور پر عقلی دلائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ لہذا احکام اخذ کرنے کی اس ترتیب میں عقلی جواز کو اختیار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

جہاں تک شرعی جواز کا تعلق ہے تو ان کے نزدیک اس امر کی بنا پر ہے کہ بنیادی طور پر اس بات کی ہرگز اجازت نہیں ہے کہ ایسے اقتدار میں شرکت اختیار کی جائے جو اللہ کی اتاری ہوئی شرع کے علاوہ کسی اور شرع کے مطابق حکومت کرے۔ یہ امر مختلف عناصر کے سبب ہے۔

● ایسے لوگوں کو جو اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق فیصلہ نہ کریں نصوص قرآنی عموماً انہیں کافر، ظالم، فاسق کے ساتھ تعبیر کرتی ہے، اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں کہ:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ {مائدہ: 44} ”اور جو

اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ کافر ہیں۔“ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ {مائدہ: 45} ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔“ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ {مائدہ: 47} ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ فاسق ہیں۔“

● حاکمیت صرف اللہ ہی کا حق ہے اس لئے حاکمیت اللہ ہی کے لئے خاص ہونا لازم آتا ہے: ﴿إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ {یوسف: 40} ”حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اُسی نے یہ حکم کیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔“

● مزید اللہ نے مومنوں پر حرام کیا کہ وہ اللہ کی شرع کے علاوہ کسی دوسرے قانون سے رجوع کریں اور ایسے عمل کو ایمان کی نفی سے تعبیر کیا، اللہ نے ارشاد فرمایا کہ: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ {النساء: 65} ”نہیں، (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصلہ ساز نہ بنالیں، پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس کے آگے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں۔“

● مزید اللہ نے منافقوں کی اللہ کے نازل کردہ احکام کے علاوہ سے رجوع کرنے کے متعلق کڑی سرزنش کی کہ: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أَنزَلَ إِلَيْكَ وَمَا أَنزَلَ مِنْ قَبْلِكَ يَرِيدُونَ أَنِ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ {النساء: 60} ”(اے پیغمبر!) کیا

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اُس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اُس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں۔ اور شیطان یہ چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر پر لے درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔“

● اس بات کی قطعی اجازت نہیں کہ کسی دوسرے قانون کی خاطر اللہ کے احکام کو چھوڑ دیا جائے، جو کوئی بھی ایسا عمل کرے وہ درحقیقت جاہلیت کے قوانین کو اللہ کے قانون پر فوقیت دیتا ہے: ﴿أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُوقِنُونَ﴾ {مائدہ: 50} "بھلا کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو لوگ یقین رکھتے ہوں ان کے لئے اللہ سے اچھا فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟"

تو اصل حکم یہ ہے، لیکن ان کے نظریہ کے مطابق اسمبلی یا پارلیمنٹ میں شرکت جائز ہے اور یہ اس بنیادی اصول سے مستثنیٰ ہے جسے مندرجہ ذیل دلائل کے تحت اخذ کیا گیا ہے:

سیدنا یوسف (علیہ السلام) کا حکومت میں شرکت اختیار کرنا۔

(شاہِ حبشہ) نجاشی کی حیثیت۔

مصلحت

ان دلائل کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

## سیدنا یوسف علیہ السلام اور کفریہ نظام کے ذریعے حکومت

سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق یہ افراد کہتے ہیں کہ جس معاشرہ میں وہ تھے وہ ایک جاہلیت کا معاشرہ تھا اور اس معاشرہ کا غالب عقیدہ شرک ہوتا تھا اس معاشرہ میں بری طرح کا اخلاقی بگاڑ پھیلا ہوا تھا اور سیدنا یوسف علیہ السلام اس معاشرہ میں ظلم اور جبر کا شکار ہوئے، اس حد تک کہ لوگوں نے ان کی بے گناہی کی نشانیاں دیکھنے کے باوجود انہیں قید کرنے کا فیصلہ کیا۔ عزیز مصر نے یوسف علیہ السلام کے خوابوں کی تعبیر بتانے کی خوبی سے متاثر ہو کر ان کو قید خانہ سے آزاد کیا اور مزید ان کی ایمانداری سے متاثر ہوا، لہذا بادشاہ نے ان کا انتخاب کیا اور خود سے قریب کیا، چنانچہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے درخواست کی کہ انہیں غلہ خانہ پر امیر مقرر کر دیا جائے اور بادشاہ نے ان کی یہ درخواست قبول کر لی۔ چنانچہ بعد ازاں یوسف علیہ السلام نے ایک جاہلیت کے نظام میں جاہلیت حکومت کے ماتحت وزارت کا ایک قلمدان سنبھال لیا جو واضح طور پر بنی اسرائیل کی شرع کے برخلاف تھا۔ نفاذ کے معاملات میں یوسف علیہ السلام بادشاہ کے دین (طریقہ) پر تھے یعنی اس کا اقتدار اور اس کا حکم حتیٰ کہ انہیں اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھنے کے لئے ایک ترکیب استعمال کرنی پڑی جس کے ذریعہ وہ یعقوب علیہ السلام کی شرع کے قانون کا استعمال کر سکیں اور اپنے بھائی کو اپنے قریب رکھ سکیں۔ یہ واقعہ تب پیش آیا جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کی خاطر ایک ترکیب ترتیب دی اور اس کے مطابق بھائی پر چوری کا الزام عائد کیا، کیونکہ یعقوب علیہ السلام کی شرع میں چوری کی سزا غلامی ہوا کرتی تھی۔

مزید اس کے آگے وہ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کہا جاسکتا کہ یہ عمل سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے ہی مخصوص ہے کیونکہ تخصیص کے لئے دلیل ضروری ہے یہ اس لئے کیونکہ نصوص میں انبیاء اور ان کی ہدایات کے متعلق جو کچھ بھی وارد ہوا ہے اس کے بیان کا مقصد اس کی اتباع اور پابندی ہے۔ مزید وہ کہتے ہیں کہ کوئی یہ دعویٰ نہ کرے کہ یہ حکم ہم سے قبل انبیاء کی شرع کا حصہ ہے، کیونکہ یہاں حکم کا موضوع شرع کے فروع میں سے نہیں جہاں شرائع میں اختلاف کی گنجائش موجود ہو سکتی ہے، بلکہ یہ شرع کی اصل یعنی شرع کے متفقہ علیہ اصولوں میں سے ہے۔ اور اس سے بڑھ کر یہ بھی ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے اقرار کیا کہ: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ {یوسف: 40} "حکم کسی کے لئے نہیں سوائے اللہ کے" مگر اس کے باوجود حکومت میں شمولیت اختیار کی۔

جو کوئی بھی سورہ یوسف سے ان آیات کا مطالعہ کرتا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہے وہ دیکھ سکتا ہے کہ اس رائے (کفریہ حکومتی نظام میں شرکت کا جواز) کا سبب مندرجہ ذیل کی دو آیات ہیں:

﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ﴾ {یوسف: 76}

"یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیتے۔"

﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ {یوسف: 55}

"آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔ یقین رکھئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے (اور) میں (اس کام کا) پورا علم رکھتا ہوں۔"

انہوں نے ان آیات کی تشریح اس انداز سے کی جو ان کے مؤقف کی تائید کرتی ہے۔ انہوں نے وہ سارے اصول بھلا دیئے جن کی بنیادوں پر اسلام قائم ہے اور جو ان کے مؤقف کے برخلاف ہیں اور اس کے علاوہ انہوں نے ان دوسری آیات کو یکسر نظر انداز کر دیا جو ان کے اس فہم کی تردید کرتی ہیں، مزید انہوں نے اس معاملہ میں عصمتِ انبیاء کو بھی دیوار پر دے مارا۔ چنانچہ اگر ان آیات کے متعلق ان کا فہم اور تشریح غلط ثابت ہو جائے تو سیدنا یوسف علیہ السلام کے موضوع کے متعلق ان کے قائم کردہ تمام مفروضات مسمار ہو جائیں گے۔

اللہ کی مخلوق میں اللہ کے نزدیک سب سے پاک انبیاء کرام ہیں اور اللہ کے برگزیدہ و محبوب ہیں۔ اللہ انہیں اپنے دین کی تبلیغ کی خاطر چُن لیتا ہے وہ اپنی قوم کے لئے نمونہ اور مثال ہوتے ہیں، وہ اطاعت و فرمانبرداری کی حقیقی مثال ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے ہر فرمان کو اُس کا حق بہترین طور پر ادا کرتے ہیں۔ اللہ انہیں معصیت اور فتنہ سے محفوظ رکھتا ہے اور حق پر ان کے قدم جماتا اور انہیں ثابت قدم رکھتا ہے اور اس میں اللہ کی مدد ان کے شامل حال ہوتی ہے۔ سیدنا یوسف علیہ السلام بھی اس کے محبوبوں کے اس برگزیدہ گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، اللہ نے ان کی تعریف کی اور متعدد آیات میں ان کو زبردست ستائش سے نوازا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿وَكَذَلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ﴾ {یوسف: 6} "اور اسی طرح تمہارا پروردگار تمہیں (نبوت کے لئے) منتخب کرے گا، اور تمہیں تمام باتوں کا صحیح مطلب نکالنا سکھائے گا (جس میں خوابوں کی تعبیر کا علم بھی داخل ہے) اور تم پر اور یعقوب کی اولاد پر اپنی نعمت پوری کرے گا۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿وَلَمَّا بَلَغَ أَشُدَّهُ آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وَكَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ {یوسف: 22} "اور جب یوسف اپنی بھرپور جوانی کو پہنچے تو ہم نے انہیں حکمت اور علم عطا کیا، اور جو لوگ نیک کام کرتے ہیں اُن کو ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿كَذَلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوءَ وَالْفَحْشَاءَ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ﴾ {یوسف: 24} "ہم نے ایسا اس لئے کیا کہ تاکہ اُن سے برائی اور بے حیائی کا رُخ پھیر دیں۔ بے شک وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھے۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَكَذَلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَّبِعُوا مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ {یوسف: 56} "اور اس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں ایسا اقتدار عطا کیا کہ وہ اُس میں جہاں چاہیں، اپنا ٹھکانا بنائیں۔ ہم اپنی رحمت جس کو چاہتے ہیں، پہنچاتے ہیں اور نیک لوگوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔"

وہ اللہ کے داعیوں میں سے بہترین داعی تھے۔ قرآن بتلاتا ہے کہ جب ان کے زنداں کے ساتھیوں نے ان سے اپنے خواب کی تعبیر کے متعلق سوال پوچھا تو انہوں نے یہ فرمایا: ﴿الْأَزْيَابُ مُتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللَّهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ﴾ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءُ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَ آبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ {یوسف: 40} "اے میرے قید خانے کے ساتھیو! کیا بہت سے متفرق رب بہتر ہیں، یا وہ ایک اللہ جس کا اقتدار سب پر چھایا ہوا ہے؟ اس کے سوا جس جس کی تم عبادت کرتے ہو، ان کی حقیقت چند ناموں کے سوا کچھ نہیں ہے جو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے رکھ لئے ہیں۔"



وہ نہایت پاکباز، اللہ سے بندھے ہوئے اللہ کی پناہ چاہنے والے تھے، چنانچہ اللہ نے انہیں عورتوں کی چالبازیوں سے محفوظ کر رکھا تھا اسی طرح انہیں عزیز مصر کی بیوی کے دام فریب سے محفوظ کیا جس کے الفاظ کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے: ﴿وَلَقَدْ رَاودْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ وَلَئِن لَّمْ يَفْعَلْ مَا آمَرُهُ لَيُسْجَنَ وَلَيَكُونَا مِنَ الصَّاعِرِينَ﴾ ﴿قَالَ رَبِّ السَّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونِي إِلَيْهِ وَالْأَ تَصْرِفُ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾ {یوسف: 32-34} "یہ بات واقعی سچ ہے کہ میں نے اپنا مطلب نکالنے کے لئے اس پر ڈورے ڈالے، مگر بچ نکلا۔ اور اگر یہ میرے کہنے پر عمل نہیں کرے گا تو اسے قید ضرور کیا جائے گا اور یہ ذلیل ہو کر رہے گا۔ یوسف نے دعا کی کہ: یارب! مجھے جس کام کی دعوت دے رہی ہیں، اس کے مقابلے میں قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ اور اگر تو نے مجھے ان کی چالوں سے محفوظ نہ کیا تو میرا دل بھی ان کی طرف کھینچنے لگے گا، اور جو لوگ جہالت کے کام کرتے ہیں ان میں میں بھی شامل ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالوں سے انہیں محفوظ رکھا، بیشک وہی ہے جو ہر بات سننے والا، ہر چیز جاننے والا ہے۔"

لوگوں نے ان کی پاکدامنی، سچائی اور ایمانداری کی گواہی دی، قید خانہ کے ان کے دو ساتھیوں نے ان سے کہا: ﴿نَبْنَنَّا بِنَاوِيلِهِ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ {یوسف: 36} "ذرا ہمیں اس (خواب) کی تعبیر بتاؤ، ہمیں تم نیک آدمی نظر آتے ہو۔" ان دو میں سے ایک ساتھی نے جسے بادشاہ نے خواب کی تعبیر جاننے کے بعد آزاد کر دیا تھا اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا: ﴿يُوسُفُ أَيُّهَا الصِّدِّيقُ أَفْتِنَا ...﴾ {یوسف: 46} "اے سچے یوسف ہمیں بتاؤ" اس کے بعد جب انہوں نے قید خانہ سے اس وقت تک باہر آنے سے انکار کیا جب تک ان کی معصومیت ظاہر نہ ہو جائے، تب اس عورت نے کہا: ﴿حَاشَ لِلَّهِ

مَا عَلِمْنَا عَلَيْهِ مِنْ سُوءٍ قَالَتِ امْرَأَةُ الْعَزِيزِ الْآنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ أَنَا رَاودَتُهُ عَنْ نَفْسِهِ وَإِنَّهُ لَمِنَ الصَّادِقِينَ ﴿يوسف: 51﴾ "اللہ کی پناہ ہم نے اس سے کبھی کوئی برائی نہیں دیکھی عزیز کی بیوی نے کہا اب حق آشکار ہو گیا میں نے اس کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی تھی وہ تو یقیناً سچے لوگوں میں سے ہے"

چنانچہ بادشاہ ان سے بہت متاثر اور مرعوب ہوا اور اس نے کہا ﴿إِنِّي أَنَا أَنَا تَخْلِيصُهُ لِنَفْسِي﴾ {يوسف: 54} "ان کو میرے پاس لاؤ میں ان کو اپنے لیے خاص کرنا چاہتا ہوں" ان کے بھائیوں نے جب دیکھا کہ یوسف علیہ السلام ان کے ایک بھائی کو اپنے پاس لے رہے ہیں تو ان سے کہا: ﴿فَخُذْ أَحَدَنَا مَكَانَهُ إِنَّا نَرَاكَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ﴾ {يوسف: 78} "اس لئے اس کی جگہ ہم میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیجئے۔ ہم آپ کو ان لوگوں میں سے سمجھتے ہیں جو احسان کرتے ہیں۔" سیدنا یوسف علیہ السلام نے یہ جتلیا کہ اللہ نے انہیں جن اکرامات سے نوازا ہے وہ دراصل ان کے اللہ کے تقویٰ اور استقامت اور اطاعت اور معصیت (گناہ) سے دور رہنے کی وجہ سے ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَذَا أَخِي قَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا إِنَّهُ مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ {يوسف: 90} "یوسف نے کہا: "میں یوسف ہوں، اور یہ میرا بھائی ہے۔ اللہ نے ہم پر بڑا احسان فرمایا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص تقویٰ اور صبر سے کام لیتا ہے، تو اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

یہ کس طرح ممکن ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ افراد ایک ایسی جلیل القدر شخصیت پر الزام دھریں جن کے متعلق خود اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہوں اور جن کے متعلق ایسے کسی ایک شخص نے بھی الزام نہ دیا ہو جس نے بھی اُن سے ملاقات کی ہے؟ یہ سب کچھ باوجود

اس کے کہ قرآن شریف میں کوئی واحد اشارہ بھی موجود نہیں ہے جو یہ ظاہر کرے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے قانون کے مطابق حکومت کی۔ قرآن میں ایسے کسی بھی قوانین کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہیں جس کے ذریعے سیدنا یوسف علیہ السلام نے حکومت کی ہو سوائے اس ایک قانون کے: ﴿قَالُوا جَزَاؤُهُ مَنْ وُجِدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ﴾ {یوسف: 75} "انہوں نے کہا: "اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوے میں سے وہ (پیالہ) مل جائے، وہ خود سزا میں دھر لیا جائے۔"

یہ قانون بھی دراصل شرع یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق تھا۔ کسی بھی معلومات یا روایات میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے ایسے کسی بھی قانون کے مطابق حکومت کی ہو جو اللہ کا نازل کردہ نہیں ہے۔ ان کا شبہ اس آیت سے پیدا ہوا ہے: ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ ...﴾ {یوسف: 76} "اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو یوسف کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیتے۔"

مذکورہ آیت کی جب صحیح تفسیر کی جائے گی، تو یہ شبہ بھی چھٹ جائے گا اور ان کا دعویٰ ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔ مذکورہ آیت کی سمجھ چونکہ اس غلط طریقہ کار کے حامیوں کے لئے مشکل ہوئی تھی لہذا انہوں نے اس کو اس انداز میں بیان کیا جس سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، چنانچہ انہوں نے اس کی مندرجہ ذیل تشریح بیان کی:

جب قحط سالی آئی تو ہر سمت سے لوگ یوسف (علیہ السلام) کے پاس آنے لگے تاکہ وہ ان لوگوں کو اس غلہ میں سے کچھ دیں جو انہوں نے اپنے نظم و نسق کے ذریعے اس

دوران غلہ خانہ میں جمع کیا تھا اور جس کی تقسیم کی ذمہ داری پر بادشاہ نے انہیں مقرر کیا تھا۔ ان کے بھائی بھی آئے تو انہوں نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا جبکہ ان کے بھائیوں نے انہیں نہیں پہچانا۔ انہوں نے اپنے سگے چھوٹے بھائی کو یہ حقیقت بتلا دی کہ وہ دراصل ان کا بھائی ہے، تاکہ وہ پریشان نہ ہو جائے۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کے متعلق ایک ترکیب بنائی اور ایک شاہی (پانی پینے کا برتن) پیالہ کسی کے علم میں آئے بغیر ان کے بھائی کے اونٹ کی زین میں چھپا دیا۔ پھر انہوں نے منادی کروائی کہ ان کا شاہی پیالہ کھو گیا ہے، چنانچہ کسی نے پکار لگائی کہ یہ پیالہ اونٹ کے کاروان والوں نے چرایا ہے، چنانچہ انہوں نے اس کا پتہ بتلانے والے کے لئے غلہ سے لدے ایک اونٹ کا انعام مقرر کیا، یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اس الزام کی زوردار تردید کرنے کی کوشش کی۔ لہذا یوسف علیہ السلام کے ماتحت غلہ خانہ میں تقسیم پر مامور نگران نے کہا کہ: **(قَالُوا فَمَا جَزَاؤُهُ إِنْ كُنْتُمْ كَاذِبِينَ) (یوسف: 74)** "انہوں نے کہا: کہ اگر تم لوگ جھوٹے ثابت ہوئے تو اس کی کیا سزا ہوگی؟" لہذا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا: **(﴿جَزَاؤُهُ مَنْ وَجَدَ فِي رَحْلِهِ فَهُوَ جَزَاؤُهُ﴾)** **{یوسف: 75}** "انہوں نے کہا: اس کی سزا یہ ہے کہ جس کے کجاوے میں سے وہ (پیالہ) مل جائے وہ خوش سزا میں دھر لیا جائے۔" سزا یہ ہوگی کہ چور کو غلام بنالیا جائے یہ عین یعقوب کی شرع کے مطابق تھا۔ چنانچہ یوسف علیہ السلام اپنے بھائی کے سامان سے پہلے ان کے سامان کی تلاشی لینے لگے، پھر انہوں نے اسے اپنے بھائی کے سامان میں سے ڈھونڈ نکالا چنانچہ اس کا جرمانہ یہ تھا کہ ان کے بھائی کو غلام بنا لیا جائے اس کے بعد آیت سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق آگاہ کرتی ہے: **(﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ**

... ﴿یوسف: 76﴾ "اللہ کی مشیت نہ ہوتی تو یوسف کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیتے۔"

ان میں سے کچھ افراد نے اس آیت میں الفاظ 'بادشاہ کے دین' کی تشریح بادشاہ کی شریعت (قوانین) اور بادشاہ کا نظام (حکومتی نظام) کے معنوں میں کی۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مصر کے بادشاہ کے پاس خود کوئی شرع (قوانین) اور نظام تھا اور سیدنا یوسف علیہ السلام نے اس بادشاہ کی شرع (قوانین) اور اس کے نظام کے تحت گورنر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالا تھا۔ لہذا ایسی پیچیدہ صورت میں انہوں نے ایک ایسی ترکیب استعمال کی کہ وہ اپنے بھائی کو خود کے قریب رکھ سکیں، چنانچہ انہوں نے قدرے مروّت والا منصوبہ بنایا تاکہ ان کے بھائی خود ہی وہ سزا تجویز کریں جس کے ذریعے ان کا محاسبہ کیا جاسکے۔ انہوں نے ان بھائیوں کو یہ نہیں بتلایا کہ بادشاہ کے قانون کے مطابق چوری کے لئے فلاں سزا ہے، بلکہ انہوں نے بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ شرع یعقوب علیہ السلام کے مطابق سزا تجویز کریں جس سے ان کا اپنے بھائی کو خود سے قریب کرنے کا منصوبہ پایہ تکمیل کو پہنچے۔

آیت کی اس تشریح نے ان کو یہ فکر و فہم اُجاگر کرنے پر ابھارا۔

اگر ہم لفظ دین کو عربی زبان میں دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی زبان میں مشترک الفاظ میں سے ہے جس کے کئی معنی ہوتے ہیں، لغت کی معتبر کتاب 'لسان العرب' میں ہے کہ: دین کے معنی غلبہ و فرمانبرداری کے ہیں۔ مثلاً کوئی یہ کہے کہ (دِنْتُهُمْ فَدَانُوا) تو اس کے معنی ہوئے 'میں نے انہیں مغلوب کر دیا تو وہ مطیع بنے'۔ دین کے معنی بدلہ دینے کے بھی ہیں، جیسے آپ یہ کہیں کہ: دِنْتُهُ بَفَعْلِهِ یعنی میں نے اسے اس کے کام کا بدلہ دیا۔ اس کے علاوہ

یوم الدین کے معنی ہوتے ہیں جزا کا دن، دین کا معنی حساب کتاب سے بھی کیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ﴾ {الفاتحة: 4} "روز جزا کا مالک" (حساب کے دن کا مالک)

دین کے معنی شریعت اور سلطان کے بھی ہیں جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ﴾ {الانفال: 39} "اور (مسلمانو!) ان کافروں سے لڑتے رہو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے۔"

دین ذلت اور غلامی کے معنی میں بھی آتا ہے اور مدین غلام کو بھی کہا جاتا ہے اور مدینہ غلام قوم کو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (أَنَا لَمَدِينُونَ) "ہم مملوک ہیں" اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: (فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ) ﴿تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ﴾ {الواقعه: 86-87} "پھر اگر تم کسی کے زیر فرمان نہیں تو اس روح کو بدن کی طرف کیوں نہیں لوٹاتے اگر تم سچے ہو"

دین کے اور بھی مختلف معانی ہوتے ہیں۔ آیت میں اللہ رب العزت کے نزدیک دین کا کونسا معنی مراد ہے؟ اور یہ کہ مذکورہ معانی میں سے کوئی دوسرا معنی یہاں مراد نہیں، اس کے لئے ایک ایسے قرینے کی ضرورت ہے جو اسی معنی کو لینے پر مجبور کرے۔ یہاں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایسا شخص جو اس لفظ کا وہ معنی اختیار کرتا ہے جو اسے اپنے حق میں موزوں لگتا ہے اور جو اس کے اپنے نظریہ فکر کی حمایت کرتا ہے، وہ درحقیقت اپنی خواہشات کو شرع کے اوپر فیصلہ بناتا ہے۔ جبکہ وہ فرد جو ایسے معنی اختیار کرتا ہے جو باضابطہ ہوں اور شرعی قرائن کی بندش کے

تحت ہوں، وہ درحقیقت شرع کو فیصلہ کرنے والا ٹھہراتا ہے اور اس طرح اپنے رب کے حکم کا پابند ہوتا ہے، تو اب یہاں کونسا معنی مراد ہے؟

اگر ہم کہیں کہ لفظ دین سے مراد یہاں شریعت ہے تو ہمیں ایسے شرعی قرائن ملتے ہیں جو اس معنی کو اختیار کرنے سے روکتے ہیں، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے کفر نظام میں شرکت اختیار کر لیا تھا (نعوذ باللہ)۔ یہ حرام عمل ہے جو مؤمنوں اور انبیاء پر حرام ہے اور ساتھ ہی رسالت و نبوت کی سرشت سے بھی متضاد ہے جس کا بنیادی نظریہ، عبادت اور بندگی کو خالص اللہ کے لئے قائم کرنا اور اللہ ہی کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے قانون سازی کا حق اسی کے لئے خالص کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ {الانبیاء: 25}

اور تم سے پہلے ہم نے کوئی ایسا رسول نہیں بھیجا جس پر ہم نے یہ وحی نازل نہ کی ہو کہ: "میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہذا میری عبادت کرو۔"

یوسف علیہ السلام جو لوگوں کو کہتے تھے جیسا کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآن شریف میں بیان کرتے ہیں:

﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ {یوسف: 40}

"حاکمیت اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اُسی نے یہ حکم کیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔"

ایسے میں یہ ممکن نہیں کہ وہ انبیاء اور رسولوں سے مخالف طریقہ کار اختیار کرتے اور مختلف خداؤں کے قانون کو اختیار کرتے۔ اسی قسم کی صورت حال میں سیدنا شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو یہ فرماتے ہیں، جسے اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآن کریم میں بیان کرتے ہیں:

﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْتَٰهَكُمْ عَنْهُ إِنِّي أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتِطَعْتُ وَمَا

تَوَفِّيقِي إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴿٨٨﴾ " اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ میں جس بات سے تمہیں منع کر رہا ہوں تمہارے پیچھے جا کر وہی کام خود کرنے لگوں۔ میرا مقصد اپنی استطاعت کی حد تک اصلاح کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور مجھے جو کچھ توفیق ہوتی ہے، صرف اللہ کی مدد سے ہوتی ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کر رکھا ہے اور اُسی کی طرف میں (ہر معاملے میں) رجوع کرتا ہوں۔"

قرطبی نے اس آیت کی تفسیریوں کی ہے: "میں تمہیں کسی ایسی چیز سے نہیں روکتا جسے میں خود انجام دیتا ہوں جس طرح ایسا کوئی معاملہ میں خود ترک نہیں کرتا جس کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔"

اگر ہم کہیں کہ لفظ "دین" سے مقصود یہاں 'غلامی' ہے اور اس کا بھائی (مدین) یعنی مملوک غلام بن گیا تھا، تو یہ معنی اس سے قبل بیان شدہ آیت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کے بیان سے مکمل مطابقت رکھتا ہے جس میں وہ شرع یعقوب علیہ السلام میں موجود چوری کی سزا کے قانون کے متعلق کہتے ہیں کہ چور کو غلام بنالیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کے معنی اس طرح ہوئے کہ اللہ کی مشیت کے مطابق ہی یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائی کو بادشاہ کی غلامی اور مملوکی میں لیا یہ معنی حقیقت اور حق سے زیادہ قریب ہے اور ایسا کوئی شرعی قرینہ بھی موجود نہیں ہے جو اس معنی کی نفی کرے۔ بلکہ یہ مطلب اس آیت سے قبل مضمون کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی سیدنا یوسف علیہ السلام کی مدح و تعریف کے ساتھ بھی اس کی مطابقت ہو جاتی ہے کہ حضرت یوسف محسنین (صالحین) اور مخلصین میں سے تھے اور



یوسف علیہ السلام کی ان خوبیوں کے متعلق لوگوں کی شہادت کے ساتھ بھی اس کی مطابقت ہو جاتی ہے۔

چنانچہ ایسی تفسیر یکسر مسترد ہے جو انبیاء اور رسولوں کی معصومیت سے متصادم ہو، یا جو جتلاتی ہو کہ وہ ایسی بات بھی کہتے ہیں جسے وہ خود انجام نہیں دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے بادشاہ کے ساتھ اس مکالمہ کا معاملہ جب وہ بادشاہ سے کہتے ہیں: ﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ {یوسف: 55} "آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔ یقین رکھئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے (اور) میں (اس کام کا) پورا علم رکھتا ہوں۔"

اور اس سے یہ مراد لینا کہ وہ وزارت خزانہ طلب کر رہے تھے یا مالیات کی وزارت کی درخواست کی اور دوران وزارت انہوں نے یعقوب علیہ السلام کی شرع کو نافذ نہیں کیا بلکہ بادشاہ کے نظام کو نافذ کرتے رہے جو کہ انصاف پر مبنی نہیں تھا یہ بہت بڑی گمراہی ہے اور سچائی سے کھلا انحراف ہے۔ اس معاملہ پر روشنی ڈالنے سے قبل ضروری ہوگا کہ ہم کچھ امور کے متعلق واقفیت حاصل کر لیں۔

● حکومت کی شکل اس زمانہ میں بادشاہت ہوا کرتی تھی تاریخ میں بادشاہت نے دو صورتیں اختیار کی ہیں:

1) استبدادی بادشاہت کا نظام: ایسا نظام جس میں بادشاہ اپنے حکم اور اپنی رائے کے ذریعے حکومت کرتا تھا جو بھی وہ موزوں خیال کرتا، رعایا کو اس کا پابند ہونا پڑتا تھا

اور کوئی اس کے فیصلہ کو تبدیل کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا تھا۔ قانون سازی، انتظامیہ، عدالتی محکمہ جات تمام اس کے اختیار میں ہوتے تھے وہ اپنے معاونین کا انتخاب اور تقرر خود کرتا اور جب چاہتا انہیں برطرف کر دیتا وہ ان کی وفاداری یا قربت یا پھر ان کی معاملہ فہمی یا بہتر انتظامی صلاحیت کی بنا پر ان کا انتخاب کرتا تھا، ان معاونین کے لئے کافی ہوتا تھا کہ وہ وفادار رہیں، یا اطاعت گذار بنے رہیں تاکہ انہیں آزادانہ عملداری مل سکے اور اس کے بعد وہ اپنی مرضی کے مطابق حکومت کریں اور اپنی رائے کے تحت مطلق العنان ہو جائیں اس طرح ان میں ہر ایک کچھ کم پیمانہ پر بادشاہ ہی ہوتا تھا۔

(2) محدود اختیارات کے ساتھ بادشاہت: اس نظام میں بادشاہ صرف ایک تصویر بن کر رہ جاتا ہے یہاں اس کے مطلق اختیارات اس سے چھین لئے جاتے ہیں، اس نظام میں مطلق العنان یا خود مختار صرف دستور یا قوانین اور ضوابط ہوتے ہیں اور بادشاہ مطلق العنان نہیں ہوتا۔ قانون سازی کا عمل قانون ساز اداروں یا شعبوں کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے نہ کہ بادشاہ کے ذریعے، اس کے علاوہ انتظامیہ کے بھی محکمہ جات ہوتے ہیں جو بجائے بادشاہ کے اس دستور یا قوانین اور ضوابط کو نافذ کرتے ہیں اور ان کے ساتھ عدالتی محکمہ جات بھی ہوتے ہیں۔ بجائے بادشاہ کے یہ محکمہ افراد کے درمیان تنازعات کا تصفیہ کرتا ہے۔ جمہوریت کے آجانے کے بعد بادشاہت اس قسم میں تبدیل ہو گئی یہ محدود (پابند) بادشاہت ہوتی ہے، ان دونوں میں سے کس قسم کی بادشاہت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ہوا کرتی تھی؟

ایسا تصور ناممکن ہے کہ بادشاہ مصر یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں کسی دستور یا قوانین کے تحت محدود اور اس پر پابند تھا، (دین الملک) سے مراد وہ نہیں جو معنی یہ افراد اخذ کرتے ہیں یعنی 'بادشاہ کا دستور یا قانون'۔ یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں موجود ملوکیت کے نظام کو آج کے اس نظام پر قیاس کرنا، جس میں نظام حکمرانوں کی سرگرمیوں کو اپنے ماتحت رکھتا ہے، درست نہیں۔

● سیدنا یوسف علیہ السلام کی بادشاہ سے غلہ کے گوداموں کو ان کے ماتحت کر دینے کی درخواست کرنے اور بادشاہ کا اس پیشکش کو قبول کر لینے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی اس درخواست کا حکومتی نظام سے کوئی بھی تعلق تھا۔ قرآن نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف خوابوں کے موضوع تک محدود ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ خواب کا تعلق فصل کی تیاری، کاشت کے سال اور قحط کے سال اور ان کے متعلق حکمت عملی سے ہے۔ پس سیدنا یوسف علیہ السلام نے بادشاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ گندم کے آٹے کی ذخیرہ اندوزی کے انتظام اور کاشت کے سالوں میں اس کی تقسیم کی ذمہ داری اس کے سپرد کرے، تاکہ قحط کے سالوں کے لئے غلہ کا انتظام ہو سکے اور اس کام کو بغیر کمی بیشی کے مستعدی اور دیانت داری سے انجام دیں۔ یہ ایک مشکل ذمہ داری ہے جو ایک قابل اور لائق، بھروسہ مند، چاق و چوبند اور با علم شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ لہذا یوسف علیہ السلام اس ذمہ داری کے لئے موزوں ترین شخص تھے، یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان جو معاملہ پیش آیا اس کا دائرہ کار سیدنا یوسف علیہ السلام کی اس ذمہ داری تک ہی محدود ہے اور ہمیں اجازت نہیں کہ ہم اس سیاق و سباق سے ہٹیں یا ہم سیدنا یوسف علیہ السلام کی ذمہ داری کا دائرہ بڑھائیں۔ ہمیں ہرگز یہ کہنے کا اختیار نہیں کہ یوسف علیہ السلام کی ذمہ داری لوگوں کے مال کی ضابطگی اور بادشاہ کے

کارندوں، خاندان، فوج اور شہریوں پر اس مال کے خرچ سے متعلق تھی۔ جس کا بادشاہ کے قانون کے مطابق ہونا ضروری تھا نہ کہ یعقوب علیہ السلام کی شریعت کے مطابق۔ عبارت کو اس قدر وسعت دینے کے لئے دلیل کی موجودگی ضروری ہے۔

● معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ مصر سیدنا یوسف علیہ السلام کی معاملہ فہمی، اس کی ذہانت و پاکدامنی سے بے حد متاثر ہو چکا تھا اور یہی وجہ رہی کہ بادشاہ نے انہیں اپنے مقررین میں شامل کر لیا اور بادشاہ نے اُس عظیم کام کی ذمہ داری ان کے سپرد کردی جس کے متعلق خواب دیکھنے کے بعد اس نے بادشاہ کے ذہن پر گرفت کر رکھی تھی۔ لہذا اس کام کے لئے ضروری تھا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو اس عظیم کام کے لئے ایسا موقع دیا جائے کہ ان کے اس کام میں کسی بھی طرف سے مداخلت نہ ہو اور اس لئے بھی کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کی معاملہ فہمی اور لیاقت اب شبہ سے بالاتر ہو چکی تھی، لہذا ان کے اس کام میں کسی سے مشورہ طلب کرنے یا کسی کی مداخلت کی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ لہذا ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ انہیں ان کے اس عمل کے دائرہ کے تحت خود مختاری حاصل ہو چلی تھی۔

● کوئی بھی دیکھ سکتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے نہ صرف بادشاہ کے خواب کی تعبیر بیان کی بلکہ خواب میں مذکور مسئلہ کا حل اور اس کے انتظام کے لئے بھی احسن تجویز بادشاہ کے سامنے رکھ دی، جس کی وجہ سے بادشاہ کو یوسف علیہ السلام کی ذخیرہ اندوزی کی انتظامی صلاحیت کے متعلق اعتماد حاصل ہوا۔ اس اعتماد کے تحت اس نے یوسف علیہ السلام کو اس عمل میں آزادانہ اختیار دے دیا۔ بادشاہ نے یوسف علیہ السلام سے یہ نہیں کہا کہ میری کوئی شریعت یا قوانین یا نظام ہے جس کی تمہیں پابندی کرنی پڑے گی بلکہ بادشاہ

مصر نے اپنے خواب کی تعبیر اور اس کا یوسف علیہ السلام کی جانب سے دیا ہوا حل قبول کیا۔ نتیجتاً بادشاہ نے یوسف علیہ السلام کو غلہ کی ذخیرہ اندوزی اور فصل کی تقسیم کے عمل کی ذمہ داری ان کے سپرد کی جس کو وہ جیسا مناسب سمجھیں انجام دے سکیں۔

● یہ ناگزیر تھا کہ قحط سالی کے واقعہ کے بعد سیدنا یوسف علیہ السلام ایسی شخصیت بن کر ابھریں، جن کی طرف لوگ رجوع کریں، تاکہ وہ انہیں بھوک سے بچائیں۔ ساتھ ہی ان کے انصاف اور انصاف پسندانہ تقسیم کے نظم کی وجہ سے یہ بھی ناگزیر ہوا تھا کہ دور دراز غرض ہر جگہ ان کی شہرت پھیل جائے۔ اس سب نے بادشاہ سے سیدنا یوسف علیہ السلام کو مزید قریب کر دیا اور بادشاہ کے نزدیک ان کی شخصیت کو نگران کی حیثیت میں مزید مستحکم کر دیا۔ شاید یہی وجہ ہوئی کہ وہ عزیز مصر کے عہدہ سے آگے بڑھ کر اب بادشاہ بن چکے تھے، جیسا کہ ان کے بھائیوں نے پہلے انہیں اس طرح مخاطب کیا تھا۔ ﴿يَا أَيُّهَا الْعَزِيزُ...﴾ {یوسف: 78} "اے عزیز!"

اور جب ان کے والدین صحرا سے تشریف لاتے ہیں تو وہ رب کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے آقا سے اس طرح دعا فرماتے ہیں: ﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ﴾ {یوسف: 101} "اے میرے پروردگار! تو نے مجھے حکومت سے بھی حصہ عطا فرمایا۔" جس کے بعد اللہ سبحانہ و تعالیٰ قرآن شریف میں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ﴾ {یوسف: 100} "اور انہوں نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا۔"

● جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو مصر کی حکومت بالآخر دی جا چکی تھی۔

جو ایک واحد فیصلہ قرآن نے بیان کیا ہے وہ سیدنا یوسف علیہ السلام کا شرعاً یعقوب علیہ السلام کے مطابق اپنے بھائی کو بحیثیت (مدین) غلام رکھنا تھا، سوال یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے چوری کی سزا کے لئے بادشاہ کے قوانین یا نظام کو کیوں نہیں اپنایا، اگر بالفرض مان لیا جائے کہ بادشاہ کے یہاں کوئی مخصوص نظام یا مرتب دستور بھی تھا؟

● سیدنا یوسف علیہ السلام کے متعلق تصور نہیں کیا جاسکتا کہ آپ کبھی شریعت کی خلاف ورزی میں کوئی عمل کریں گے، کیونکہ وہ معصوم ہیں اور ان کے رب ذوالجلال نے ان کو نیکو کاروں (محسن) میں سے بتایا ہے، انہیں صالح اور بردبار بتلایا ہے، یہ وہ متقی شخصیت ہیں جنہوں نے زندان کی سلاخوں میں قید ہونا تو گوارا کیا لیکن زنا کی دعوت کو قبول نہیں کیا، یہ وہ باصبر شخصیت تھیں جو قید میں بھی اللہ کی طرف دعوت دیا کرتے تھے، یہ ان کا کردار عزیمت تھا کہ انہوں نے اپنی معصومیت ثابت ہوئے بغیر قید سے رہائی کو قبول نہیں کیا، یہ وہ اعلیٰ صفات نبی تھے جنہوں نے اپنی دیانت داری اور پاکدامنی کے سبب اپنے اس معاشرہ کے کفار کے دل جیت لئے، جس میں عزیز مصر کی بیگم، اس شہر کی معزز عورتیں، قید خانہ کے دوسا تھی، بادشاہ مصر، حتیٰ کہ انہیں پہچاننے سے قبل ان کے سوتیلے بھائیوں نے بھی ان کی تعریف کی، جسے قرآن شریف نے بیان کیا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے حالات اور بادشاہ کی حکومت کے متعلق جتنی بھی تفاسیر ہیں تمام ظنی ہیں چاہے یہ تفاسیر کسی بھی پہلو کو اجاگر کرتی ہوں، لہذا بادشاہ نے ایمان لایا ہو یا کافر ہی رہا؟، اقتدار یوسف علیہ السلام کے اختیار میں بادشاہ کی موت کے بعد آیا یا بادشاہ نے خود مستعفی ہو کر تخت یوسف علیہ السلام کے سپرد کر دیا؟ یا کہ کیا پچھلے عزیز کے معزول ہونے یا اس کی وفات کے بعد وہ اب عزیز بن چکے تھے؟ اور اس آیت کے متعلق تفسیر جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ

ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ﴾ {يوسف: 76} "یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے قانون کے مطابق اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ لیتے۔"

یا پھر اس آیت کی تفسیر جس میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ یوسف علیہ السلام کی بادشاہ کے ساتھ گفتگو کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿اجْعَلْنِي عَلَى خَزَائِنِ الْأَرْضِ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ﴾ {يوسف: 55} "آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دیجئے۔ یقین رکھئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے (اور) میں (اس کام کا) پورا علم رکھتا ہوں۔"

ان تمام شبہات اور سوالوں کے جتنے حل پیش کئے جاسکتے ہیں تمام ہی ظنی تفسیر ہیں، یعنی ان تمام حل کے مبنی بر حقیقت ہونے کا قطعی یقین نہیں حاصل کیا جاسکتا ہے، کیونکہ قرآن شریف ہمیں اس بارے میں مطلوبہ تفصیلات نہیں دیتا کہ ان سوالوں کے جوابات قطعی طور پر حاصل ہو سکیں۔ مزید برآں ہمارے لئے ان سوالوں کے جوابات حاصل کرنا حکم شرع کی مانند ضروری بھی نہیں ہے۔ ہم نے جو تشریح یہاں بیان کی ہے یہ بھی ظنی سے زیادہ نہیں۔ البتہ یہ تشریح دیگر آراء سے اس معنوں میں مختلف ہے کہ یہ تفسیر انبیاء کے تقویٰ اور ایمان کے شایانِ شان اور ان کے مقام و مرتبہ سے مطابقت رکھتی ہے اور انبیاء کے معصوم عن الخطاء ہونے سے متعارض نہیں، جو کہ اصول دین میں سے ہے، اس کے علاوہ دوسری رائے حق سے کتنی دور ہے؟ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ رائے خود نبی یوسف علیہ السلام کی زبان سے ادا ہونے والے اُن قطعی الفاظ سے متناقض ہے جو انہوں نے دوسروں کے شرکیہ عقائد پر انکار کیا اور فیصلہ صرف اللہ پر چھوڑ دینے کا حکم دیا، جیسا کہ ہم نے اس سے قبل ذکر کیا۔ اسی طرز پر آگے بڑھتے ہوئے جب ہم یوسف علیہ السلام کی صورت حال کو مزید واضح کرتے ہیں تو ہم نہیں چاہتے کہ کفریہ نظام میں شرکت کے انکار کے متعلق کسی دوسری رائے کا سہارا لیں،

کیونکہ ہماری رائے ایک شرعی حکم ہے، ظنی رائے ہر گز نہیں اور یہ رائے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالة میں سے ہے۔

کوئی اگر یہ کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام اللہ کی اجازت سے بادشاہ کے دستور یا قانون کے مطابق حکومت کر رہے تھے اور اس لئے انہوں نے اپنے رب کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یا تو یہ اجازت سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے مخصوص تھی یا یہ اجازت عام تھی یعنی کفریہ قوانین کے مطابق حکومت ان کے زمانہ میں جائز تھی۔

اب اگر یہ اجازت سیدنا یوسف علیہ السلام کے لئے خاص تھی تو یہ کسی دوسرے انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس اجازت کا استعمال کرے اور اس کے بموجب اسی طرح کا عمل کرے، چنانچہ یہ ہمارے لئے حکم نہیں ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کریں یا اس عمل کے لئے اس وقوعہ کو بطور دلیل پیش کریں۔

اب دوسری صورت میں بالفرض یہ اجازت اس زمانہ کے لئے عام تھی تو یہ ہم سے قبل زمانہ کے لوگوں کی شرع (قانون) کہلائے گا۔ چنانچہ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کی شرع جو ہم سے قبل زمانہ میں آئے ہیں ہمارے لئے شرع کی حیثیت رکھتی ہے؟

فقہ اور اصول کے علماء میں سے ایک فریق نے مندرجہ ذیل قاعدہ ترتیب دیا: (شرع من قبلنا لیس شرعاً لنا) 'ہم سے قبل زمانہ کی شرع ہمارے لئے شرع نہیں ہے'

اس قاعدے کو انہوں نے نصوص سے اخذ کیا ہے، جن نصوص سے انہوں نے استدلال کیا ہے، وہ ظاہر کرتے ہیں کہ محمد ﷺ اپنے ساتھ جو کچھ بھی لائے ہیں وہ دراصل قبل زمانہ کے قوانین کو



مکمل طور پر منسوخ کرتا ہے، اور ان کے کچھ اجزاء کو تفصیلاً منسوخ کیا تاکہ مزید تاکید ہو۔ اگر ہم علمائے اصول کے اس قاعدہ کو اپنائیں تو ہمیں اس بات کی اجازت حاصل نہیں ہوتی کہ ہم یوسف علیہ السلام یا ان کے علاوہ دیگر انبیاء کی شرع کو اپنائیں یا اس کو دلیل بنائیں، علماء اصول کا ایک دوسرا گروہ ہے جس نے مندرجہ ذیل قاعدہ مرتب کیا ہے: **(شرع من قبلنا شرع لنا ما لم ینسخ)** 'ہم سے قبل زمانہ کی شرع منسوخ نہ ہونے کی صورت میں ہی ہمارے لئے شرع ہے'

ان علماء نے بھی اپنے اس قاعدے کو فقہی دلائل سے مدلل کیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر سابقہ امتوں کے قوانین میں ہمارے لئے کوئی بھی فائدہ نہ ہو تا تو قرآن شریف ان کو بیان نہ کرتا۔ لہذا ان علماء کا کہنا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جو شرع لائے ہیں اس نے اس سے قبل نازل شدہ شرع کو یکسر منسوخ نہیں کر دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن و سنت میں جو پچھلے انبیاء کے قوانین بیان ہوئے ہیں وہ ہمارے لئے بھی شرع ہیں سوائے ان احکام کے جنہیں قرآن شریف نے منسوخ کر دیا اور ہمیں ان سے بہتر ان کے متبادل نئے قوانین دیئے گئے ہوں۔

چنانچہ اب اگر ہم اس مذکورہ اصول کو اس موضوع پر اپناتے ہیں تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟ کیا قرآن و سنت کی نصوص میں کہیں کوئی شرعی نص موجود ہے جو اللہ کے نازل کردہ قوانین کے علاوہ سے حکومت کو حرام قرار دیتی ہے؟ کیا شرع محمدی ﷺ اور قرآن کی شرع میں کوئی ایسا حکم وارد ہوا ہے جو ہمیں بال برابر بھی سیدنا محمد ﷺ کی شرع سے انحراف اختیار نہ کرنے کی تنبیہ کرے؟

بلاشبہ ہمارے رسول ﷺ کی شرع نے ہم پر حرام قرار دیا ہے کہ ہم اپنے فیصلوں کے لئے اس شرع کو چھوڑ کر کسی دوسرے قانون کو رجوع کریں، اس نے ہم پر قطعی طور پر حرام کیا ہے کہ ہم کفر اور جاہلیت کے کسی بھی قانون کو اختیار کریں، اگر یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہ سیدنا یوسف علیہ السلام کے

زمانہ کے لئے عام طور پر جائز تھا تو ان لوگوں سے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں ہمارا کہنا ہے کہ اگر بالفرض مان بھی لیں کہ یہ یوسف علیہ السلام کے زمانہ کے لئے جائز تھا تو آج قرآن کی شرع میں یہ قطعی طور پر حرام یعنی منسوخ ہے۔

● اب یہ رائے کہ 'اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق حکومت کرنا اصول سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ فروع سے تو یہ غلط رائے ہے۔ یہ اس لئے کہ عقائد کا مسکن دل ہے اور شرع کا مخاطب و مسکن اعضاء و جوارح ہیں۔ عقیدہ شرعی قوانین کی بنیاد کا مظہر ہے جبکہ شرعی قوانین عقیدہ سے ماخوذ اس کے ثمرات ہیں۔

بندہ کے اعمال کے متعلق شرعی قوانین دو پہلو رکھتے ہیں:

(1) نظری اور اعتقادی پہلو جس کا اقرار لازمی ہے:

اس پہلو سے شرعی قانون عقیدہ سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی اس کی حقیقت کو دیکھا جاتا ہے اگر وہ قطعی حکم ہو تو اس کا انکار کرنا کفر تک لے جاتا ہے اور اگر ظنی ہو تو گناہ تک لے جاتا ہے۔

(2) دوسرا عملی جو اس کے نفاذ سے تعلق رکھتا ہے:

چنانچہ نماز فرض ہے اور اس کو فرض کی حیثیت میں تسلیم کرنا بھی فرض ہے اور اس کو فریضہ نہ ماننا کفر تک لے جاتا ہے۔

نماز فرض ہے اور اس کی بحیثیت فرض ادائیگی بھی ضروری ہے، اس کو فرض کی حیثیت میں (فرض کی ادائیگی کے احساس کے ساتھ) ادا نہ کرنا گناہ تک لے جاتا ہے۔

خمر (شراب) حرام ہے اور اس کی حرمت کو قبول کرنا فرض ہے، اس کو مباح یا جائز ماننا کفر تک لے جاتا ہے۔

خمر (شراب) حرام ہے اور اس کا نوش کرنا بھی حرام ہے، شراب نوشی گناہ تک لے جاتی ہے۔

اسی طرز پر 'ان قوانین کے ساتھ حکومت کرنا' جنہیں اللہ نے نازل فرمایا ہے یہ بھی فرض ہے، اس کو فرض تسلیم کرنا ایمان (عقیدہ) سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ اس کی فرضیت اس سے متعلق قطعی نصوص سے ثابت ہے۔ اس کی تنفیذ اطاعت و فرمانبرداری ہے اور اس کی عدم تنفیذ معصیت (گناہ) ہے۔ چنانچہ وہ جو اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت نہیں کرتا وہ کافر ہو جاتا ہے، اگر وہ اللہ کی نازل کردہ شریعت اور قوانین کو تسلیم ہی نہیں کرتا یا پھر ان کا انکار کرتا ہو، اگر وہ انہیں تسلیم کرتا ہو، لیکن ان کا نفاذ نہ کرتا ہو تو وہ گناہ گار ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت کرنا متفق علیہ اصول میں ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ یہ شرعی قوانین کے پہلے پہلو یعنی شعوری اور عقیدہ کے پہلو سے تعلق رکھتا ہے یہ بات بالکل صحیح ہے۔ جہاں تک اس کا دوسرا پہلو ہے، اس کی نسبت شریعت اور اس کے نفاذ سے ہے بہ الفاظ دیگر اس کی نسبت فروع (شاخوں) سے ہے اصول (بنیادوں) سے نہیں ہے، چنانچہ اس مناسبت سے یہ اس موضوع کے تحت داخل ہے کہ یہ ہم سے پہلے والوں کی شرع کا حصہ تھا یا نہیں۔

اس پہلو سے ہم نے واضح اور ثابت کیا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام نے حکومت میں شرکت اختیار نہیں کی اور یہ کہ ہرگز جائز نہیں کہ یوسف علیہ السلام کے حالات کی ایسے طرز پر تشریح کی جائے، مگر ان جیسے لوگ جو علم کے دعویدار ہیں ان کی بات تو ان کی اپنی منطق کی بنا پر مسترد ہے۔ کیونکہ (شرع

من قبلنا) کے بارے میں علماء کی دو رائے ہیں: ایک رائے کے مطابق ہم سے قبل کی شرع ہمارے لئے شرع کا درجہ نہیں رکھتی۔ اس کی رو سے جاہلیت کے نظام میں شرکت کی اجازت رد ہو جاتی ہے، دوسری رائے کہتی ہے کہ ہم سے قبل کی شرع ہمارے لئے منسوخ نہ ہونے کی صورت میں شرع کا درجہ رکھتی ہے۔ متعدد آیات، عقیدہ اور رسول اللہ ﷺ کے افعال ہمیں بتلاتے ہیں کہ کس طریقہ پر اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت کو قائم کیا جائے اور اسلام میں حکومت کے تمام شرعی اصول واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ کفر نظام حکومت میں شرکت کی ہرگز اجازت نہیں ہے اس کے برعکس اسلام کلی طور پر ایسی فکر کو مسترد کرتا ہے، دوسرے الفاظ میں بالفرض ہم سے قبل شرع میں جاہلیت کے نظام حکومت میں شرکت اگر جائز تھی تو ہماری شرع نے اس اجازت کو منسوخ کر دیا، اس کے متعدد دلائل ہیں جو اسے حرام قرار دیتے ہیں۔

یہ رائے کہ جو کچھ بھی انبیاء کی سیرتوں اور ان کی لائی ہوئی ہدایات کے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے اس کا مقصد ان کی اتباع اور پابندی ہے، ایسی رائے مزید وضاحت کی محتاج ہے۔

تمام انبیاء کرام مشترک عقیدہ رکھتے تھے، تمام انبیاء کرام نے لوگوں کو ایک اللہ واحد و خالق و مدبر پر ایمان کی طرف دعوت دی تھی، تمام انبیاء کرام نے لوگوں کو ملائکہ، گزشتہ آسمانی کتابوں، اگلے اور پچھلے تمام نبیوں اور آخرت پر ایمان لانے کی دعوت دی تھی، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ {الانبیاء: 25}

"اور تم سے پہلے ہم نے کوئی رسول بھیجا جس پر ہم نے یہ وحی نازل نہ کی ہو کہ: "میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، لہذا میری عبادت کرو۔"

تمام ہی انبیاء کرام دعوت کی خاطر مصائب میں، نقصانات میں، تکالیف میں، اللہ کی خاطر صبر و تحمل میں، اللہ کی راہ میں قربانی میں مشترک تھے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَلَقَدْ كَذَّبْتَ رَسُولٌ مِّن قَبْلِكَ فَصَبْرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأَوْدُوا حَتَّىٰ أَنَا هُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِن نَّبِيٍّ الْمُرْسَلِينَ﴾ {الانعام: 34} "اور حقیقت یہ ہے کہ تم سے پہلے بہت سے رسولوں کو جھٹلایا گیا ہے۔ پھر جس طرح انہیں جھٹلایا گیا اور تکلیفیں دی گئیں، اس سب پر انہوں نے صبر کیا، یہاں تک کہ ہماری مدد ان کو پہنچ گئی۔ اور کوئی نہیں ہے جو اللہ کی باتوں کو بدل سکے۔ اور (پچھلے) رسولوں کے کچھ واقعات آپ تک پہنچ ہی چکے ہیں۔" ﴿مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ﴾ {حم السجده: 43} "تم سے جو باتیں کہی جا رہی ہیں، وہ وہی ہیں جو تم سے پہلے پیغمبروں سے کہی گئی تھیں۔"

وہ اس معنوں میں بھی مشترک تھے کہ انہوں نے اپنی قوموں کو اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دی مثلاً اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ﴾ {النساء: 64} "اور ہم نے کوئی رسول اس کے سوا کسی اور مقصد کے لئے نہیں بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔"

وہ تمام انبیاء ان معنوں میں بھی مشترک تھے کہ ان تمام کو جھٹلایا گیا اور ان کی دعوت کا مذاق اڑایا گیا چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ {يس: 30} "افسوس ہے ایسے بندوں کے حال پر! ان پاس کوئی بھی رسول ایسا نہیں آیا جس کا وہ مذاق نہ اڑاتے رہے ہوں۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَىٰ إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَ﴾

وَلَنُصِيبَنَّكُمْ الْأَرْضَ مِنْ بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِ ﴿13﴾ ابراہیم : 13-14} "اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا تھا، اُنہوں نے اپنے پیغمبروں سے کہا کہ: "ہم تمہیں اپنی سر زمین سے نکال کر رہیں گے، ورنہ تمہیں ہمارے دین میں واپس آنا پڑے گا۔" چنانچہ اُن کے پروردگار نے ان پر وحی بھیجی کہ: "یقین رکھو، ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے، اور اُن کے بعد یقیناً تمہیں زمین میں بسائیں گے۔ یہ ہر اس شخص کا صلہ ہے جو میرے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔"

اور وہ تمام انبیاء کرام اس حقیقت میں بھی مشترک ہیں کہ بالآخر اللہ نے انہیں اپنی نصرت سے نوازا اور انہیں سرخرو اور سر بلند کیا، چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَنْ نَشَاءُ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ﴾ {یوسف: 110} "یہاں تک کہ جب پیغمبر لوگوں سے مایوس ہو گئے اور کافر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اُنہیں جھوٹی دھمکیاں دی گئی تھیں تو ان پیغمبروں کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی (یعنی کافروں پر عذاب آیا) اور جن کو ہم چاہتے تھے، انہیں بچا لیا گیا اور جو لوگ مجرم ہوتے ہیں، ان سے ہمارے عذاب کو ٹالا نہیں جاسکتا۔"

اس طرح مختلف پیغامات جو اللہ کی جانب سے موصول ہوئے ہیں وہ تمام متعدد باتوں میں مشترک ہیں جن میں سے کچھ کا ہم نے ذکر کیا۔ اس سے قبل داعیوں نے جو رخ اور جو رویہ اپنایا ان کے حالات بھی یاد گار ہیں۔ اللہ نے یہ اس لئے بیان کیا ہے تاکہ ہم اس سے سیکھیں، عبرت پکڑیں، نصیحت حاصل کریں اور ان کے حالات کو یاد رکھیں کیونکہ ان کی سوانح ایمان کو مضبوط کرتی ہیں اور عزم کو چٹنگی بخشی اور صبر و تحمل کو بڑھا دیتی ہیں اور ساتھ ہی ہمیں زمانہ قدیم میں دعوت کے تذکرے یہ یقین دلاتے ہیں کہ دعوت کا یہ قدیم سلسلہ عقائد میں، اللہ العلیم کے منہج (طریقہ کار) کے ساتھ چمٹنے

اور اس پر جنے کی دعوت میں اور اس کے نتائج میں مسلسل یکساں و مشترک ہی رہا ہے، کئی قرآنی آیات ہیں جو مسلمانوں کے لئے دعوت کے طریقہ کار پر روشنی ڈالتی ہیں اور عوام الناس کی مخالفت اور اسکی حقیقت کے بارے میں بات کرتی ہیں، اور تاکہ دعوتی عمل کے رد عمل میں کفر اور ایمان کے درمیان زمانہ اول سے چلی آرہی اس خاصیت کی شدت میں مزید تیزی، اور نہ ختم ہونے والی اس کشمکش کی نوعیت کو جان لیں، ساتھ ہی یہ ہمیں اللہ سے وفاداری (ولاء) اور (براءة) شرک سے بری رہنے کے متعلق یاد دہانی کراتی ہیں، اسی طرح ایمان اور دیگر معاملات میں آزمائش کے بعد اللہ کی طرف سے روحانی مداخلت یعنی (اللہ کی نصرت) کے متعلق یاد دہانی کراتی ہیں۔

بہر حال انبیاء کی زندگیوں کی اتباع صرف مختلف حالات میں ان کے اختیار کردہ صورت سے کی جاتی ہے، مثال کے طور پر موسیٰ علیہ السلام کا پانی بھرنے والی لڑکی کے آگے چلنے کا فعل یا رفیق حیات کی ضرورت محسوس ہونے پر اللہ سے اس کے لئے ان کا دعا کرنے کا فعل، لیکن ان انبیاء کی شریعت کی اتباع نہیں کی جاتی۔ یعنی قوانین میں ان کی اتباع نہیں کی جاتی کیونکہ اللہ نے ہر نبی کو ایک مخصوص نظام کے ساتھ بھیجا۔ چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا﴾ {مائده: 48} "تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے ہم نے ایک (الگ) شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے۔"

اور اس لئے بھی کہ ہر نبی صرف اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا، لیکن آقائے دو جہاں محمد رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں کی طرف بھیجے گئے، ان کا پیغام رب کا آخری پیغام تھا، اللہ نے پچھلے نبیوں کے ماننے والے مختلف مذاہب کے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اب اس نئے پیغام کی پیروی کریں اور جو کچھ پچھلی پیروی وہ کر رہے تھے اس کو ترک کر دیں، لہذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الدِّينَ

عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ﴿ (آل عمران: 19) "بے شک (معتبر) دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔"

مزید اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ {آل عمران: 85} "اور جو کوئی اسلام کے علاوہ اور دین کو اختیار کرے تو اس کی طرف سے یہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔"

مزید اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ {مائده: 48} "اور (اے رسول محمد! صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تم پر بھی حق پر مشتمل کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان کی گہبان ہے۔"

مزید سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے پیغام کی نوعیت دوسروں سے کچھ معنوں میں مختلف ہے۔ مثال کے طور پر ان کا پیغام آخری ہے اور کامل ہے، اسلامی ریاست اس پیغام کے اجزاء میں ایک نمایاں امتیازی جزو کی حیثیت میں ابھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ اس میں اسلامی ریاست کو ایسے شرعی طریقہ (میکانزم یا پُرزہ) کی حیثیت دی گئی جو اس پیغام کی حفاظت کرتی ہے اس کو نافذ کرتی ہے اور اس (اسلام) کی تبلیغ کرتی ہے، جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ان کے اپنے لوگوں تک محدود تھی اور وہی افراد اس کے مخاطب و منشاء تھے۔ لیکن ایسے افراد جو ان انبیاء کی قوم کا حصہ نہیں تھے ان پر اس پیغام کا کوئی اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ لہذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کی دعوت معین زمان اور مکان کے لئے ہوتی تھی۔ اسلام کا پیغام اس کے برعکس ہے، اسلام



کے اٹل احکامات ہر زمانہ اور مکان میں قابل عمل ہیں۔ چنانچہ یہ نمایاں فرق اسلام کو کسی دوسرے دین پر قیاس کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور مسلمانوں کو پابند کرتا ہے کہ وہ صرف اسلام سے ہی احکامات لیں اور یہی واحد راستہ ان کے لئے باقی بچتا ہے کیونکہ اسلام کے قوانین آپس میں اس ترتیب سے باہم مربوط ہیں جو اس کی فطرت کے لئے موزوں ہیں۔ مثال کے طور پر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے پیغام کو دیکھیں تو یہ واضح طور پر نبی کریم ﷺ کے پیغام سے مختلف ہے۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام ایک روحانی اور اخلاقی پیغام تھا جس میں ریاست کے قیام کی کوئی دعوت موجود نہیں تھی، کیونکہ ان کے پیغام کے ساتھ حدود اور معاملات وغیرہ کے قوانین نہیں آئے تھے کہ جن کے نفاذ کے لئے شرعی ریاست کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے اور ان کا پیغام بنی اسرائیل کے لئے خاص تھا۔ لہذا اسلام اور عیسائیت کے درمیان شرعی قوانین کا کیونکر موازنہ کیا جاسکتا ہے؟

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہمیں آج دین میں واضح و قطعی معاملات کو زیر بحث لانا پڑ رہا ہے، اس سے یہ عیاں ہے کہ آج دعوت کا درجہ کتنا کمتر ہو چلا ہے، ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں جو قرآن عظیم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے کہہ چکا ہے: ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي وَسُبْحَانَ اللَّهِ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ {یوسف: 108} ”(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: ”یہ میرا راستہ ہے۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی، اور میں مشرکوں میں نہیں۔“

## مصلحت کے بہانے حرام کو حلال کرنا

شرع نے کچھ معاملات فرض ٹھہرائے، کچھ معاملات کو حرام ٹھہرایا ہے۔ اس نے لوگوں کے لئے جائز نہیں کیا کہ وہ اس میں رد و بدل کریں، تبدیل کریں یا اس میں تحریف کریں، حکیم شارع نے متعدد مقامات پر رخصت بھی دی جہاں وہ جانتا ہے کہ انہیں اسکی ضرورت پڑے گی اور جہاں بھی اللہ نے رخصت نہیں دی ہے تو اللہ نے لوگوں کے لئے جائز نہیں کیا کہ وہ اُس حکم سے فرار اختیار کریں یا اس سے بچ نکلیں چاہے ان کی خواہشات اور شیطان مصلحت کے نام پر راہ فرار کو کتنا ہی خوشنما بنا کر کیوں نہ پیش کرے۔ اور جو شخص اللہ کے فرض کردہ حکم کو چھوڑنے کو جائز ٹھہراتا ہو اور اللہ کے حرام کردہ کی خلاف ورزی کی اجازت دیتا ہو جس کے متعلق اللہ کی جانب سے کوئی رخصت موجود نہ ہو اور اسے جائز ٹھہراتا ہو تو وہ کافر ہے یا جاہل فاسق ہے۔

### بعض لوگوں نے نظام میں حصہ لینے کے لیے مصلحت سے استدلال کیا

انہوں نے حوالہ دیا مصلحت کی اس تعریف کا جو انہوں نے یوں بیان کی کہ 'مصلحت عمل کی وہ صفت ہے جس سے ہمیشہ یا اکثر بھلائی اور منفعت حاصل ہوتی ہے، یہ بھلائی اور منفعت افراد اور عوام دونوں کی خاطر ہو سکتی ہے'۔ ان کا کہنا ہے کہ علماء نے شریعت پر غور کیا اور مصلحت کا شرعی پہلوؤں سے جائزہ لیا تو ہدایت کے ساتھ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شریعت درحقیقت دنیا و آخرت میں بندوں کی بھلائی اور منفعت کے لئے وضع کی گئی ہے۔

انہوں نے مصالحِ مرسلہ اور ان معاملات کا حوالہ دیا جو اس کی بنیاد ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ اقتدار میں شرکتِ مصالحِ مرسلہ میں سے نہیں، کیونکہ واضح نصوصِ قطعیت کے ساتھ یہ بتاتی ہیں کہ جو بھی جاہلانہ نظام میں شامل ہو اور شرکت کرے تو وہ گناہگار ہے۔ بلکہ یہاں مصالحِ مرسلہ کے استدلال سے مراد دو بھلائیوں میں سے بہتر کو ترجیح دینا اور دو برائیوں کے درمیان بدترین کی شناخت کرنا ہے اور دو مقاصد (منفعت) کے درمیان کمتر کو نظر انداز کر کے بڑے مقصد کا حصول، دو بڑے خساروں یا دو بڑی دشواریوں میں شدید ترین سے گریز اختیار کرتے ہوئے کمتر خسارہ کو اختیار کرنا ہے۔

انہوں نے کہا اس راستے سے شریعت کے نزدیک واضح نقشہ موجود ہے لہذا اسلام نے خمر اور جو ابازی کو حرام قرار دیا، مگر اس کے ساتھ اس کا بھی اظہار کیا کہ ان میں بندوں کے لئے منفعت بھی ہے مگر یہ تھوڑا نفع ہے جس کے مقابلے میں ان دونوں کے اندر پایا جانے والا نقصان زیادہ ہے لہذا ترجیح اس کے نقصان کو ہوگی۔

شرع نے جہاد کو فرض قرار دیا اس کے باوجود کہ اس میں مؤمنین ہلاک ہونگے اور مالی نقصانات بھی اٹھائیں گے، کیونکہ جہاد میں ایسے عظیم فائدے موجود ہیں جو رب کے نزدیک پسندیدہ اور بندہ کے لئے عظیم نفع (فائدہ) کا باعث ہے۔

اسلامی تاریخ میں حکمران اور علماء اپنے اسلامی حرکات میں اس طریقہ کار کی رعایت کیا کرتے تھے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کعبہ کی تعمیر کی خاطر اس کو مسمار کرنے اور ابراہیم علیہ السلام کے وضع کردہ بنیادوں پر اس کی تعمیر نو سے باز آتے ہیں، حالانکہ اس کو مسمار کر کے دوبارہ تعمیر کرنے میں نفع تھا۔ ایسا انہوں نے اس لئے کیا کیونکہ کعبہ مسمار اور پھر تعمیر کرنے کی صورت میں جس نقصان کا خدشہ تھا، وہ

اس کے فائدے سے بڑھ کر تھا۔ آپ ﷺ نے اپنی زوجہ عائشہؓ سے فرمایا: ((لَوْ لَا أَنْ قَوْمَكَ حَدِيثُو عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، لَهْدَمْتُ الْكَعْبَةَ وَلَجَعَلْتُ لَهَا بَابِينَ)) "اگر تمہاری قوم کا خدشہ نہ ہوتا جو حال ہی میں دور جاہلیت سے نکل کر آئی ہے، تو میں کعبہ کو مسمار کر دیتا اور اس کے دو دروازے بنادیتا"۔ (رواہ ترمذی و نسائی)

اس کے علاوہ وہ متعدد دیگر مثالوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ بلاشبہ جاہلیت کے نظام حکومت میں شرکت اختیار کرنے میں عظیم مفسد ہیں، یہ حکومتیں طاغوت کے قانون کا نفاذ کرتی ہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فرمان اور احکام سے انحراف کرتی ہیں اور اس کے احکام کو متنازع بناتی ہیں اور اس کی خلاف ورزیاں کرتی ہیں، اللہ کا حکم تو یہ ہے: ﴿إِنَّ الْحُكْمَ إِلَّا لِلَّهِ﴾ {یوسف: 40} "حکم کسی کے لئے نہیں سوائے اللہ کے" ﴿وَلَا يُشْرِكْ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا﴾ {کہف: 26} "اور وہ اپنے فیصلہ اور حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا"

اس کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ بعض اوقات تحریک یہ دیکھتی ہے کہ اقتدار میں شرکت اسلام کی خاطر، مسلمانوں کی خاطر اور کسی صورت تحریک اسلامی کے لئے بہت نفع مند ثابت ہوگی، اور یہ طاغوت کو مٹانے اور حق کو متعارف کروانے کے لئے ذریعہ بن سکتا ہے۔ آئیں ہم اس موضوع پر ان کے بیانات کے حوالہ سے ان کی رائے کا مطالعہ کریں تاکہ اس رائے کی حقیقی نوعیت کو پہچان سکیں، اور ان کے طریق فکر پر رد کر کے یہ بھی جان سکیں کہ یہ رائے اپنا کر ان لوگوں نے اپنے آپ کو شرعی طریق فکر سے کتنا زیادہ دور کر لیا ہے۔ وہ خود یہ کہتے ہیں کہ:

1- مسلمانوں کا جاہلیت کے نظام میں شامل ہونا انہیں ایک بہت بڑے تضاد کی صورتحال میں مبتلا کر دے گا۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ طاغوتی ریاستوں کے خلاف جدوجہد کریں، لہذا یہ کس

طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود طاغوت کا نفاذ کرے؟ اللہ نے ان لوگوں کے متعلق اپنا یہ فیصلہ سنایا ہے جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہوں لیکن فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہوں: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ {النساء: 60} " (اے پیغمبر!) کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکار کر پر لے درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔"

2- جو بھی اللہ کے احکام کے بالمقابل قانون سازی کرتے ہوں ان تمام طاغوتوں کی اطاعت کا مطلب انہیں اللہ کے بجائے مالک، رب، حاکم اور معبود تسلیم کرنا ہے، اللہ نے اہل کتاب کے متعلق درج ذیل ارشاد فرمایا ہے: ﴿اتَّخِذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَهًا وَاحِدًا﴾ {التوبة: 31} " انہوں نے اللہ کے بجائے اپنے احبار (یعنی یہودی علماء) اور راہبوں (یعنی عیسائی درویشوں) کو خدا بنالیا ہے، اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ اُن کو ایک خدا کے سوا کسی کی عبادت کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا۔"

رسول اللہ ﷺ نے عدی بن حاتم کو سمجھانے کے لئے (أَزْبَابًا مِّنْ دُونِ اللَّهِ) کی تشریح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "ان کو اللہ کے علاوہ رب بنالیا تھا" سے مراد ہے کہ ان (راہبوں اور علماء) کی اطاعت اختیار کر لی، یہ راہب اور علماء اللہ کے حلال کردہ کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے، یہ لوگ اس میں ان کی اطاعت کرتے تھے۔

3- ہم اس زمانہ میں دیکھتے ہیں کہ امراء یا حکام دیندار قسم کے لوگوں کو عہدے اور وزارتیں دے کر اپنی بھدسی اور غلیظ حکمرانی کو مزین کرنے میں ان کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے عوام الناس اور بھولے بھالے لوگوں کو فریب دیا جاسکے، اس طرح یہ حکام کہتے ہیں کہ اگر ہم حقیقت میں باطل پر ہوتے تو فلاں فلاں عالم یا بااخلاق شخصیتوں نے ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونا تسلیم نہ کیا ہوتا۔

4- مزید مشکلات تب پیدا ہو جاتی ہیں جب وہ ان بھلی مسلم شخصیتوں (وزراء) کی وساطت سے سیاہ اور ظالمانہ قوانین جاری کرواتے ہیں اور جب یہ قوانین اپنے شیطانی مقصد حاصل کر لیتے ہیں تو پھر یہ امراء ان وزراء کو کھجور کی گٹھلی کی طرح پھینک دیتے ہیں۔

5- اقتدار کی شرکت ظلم کی طرف جھکاؤ کو ظاہر کرتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے اس طرح خبردار کیا ہے: ﴿وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ {ہود: 113} "اور (مسلمانو!) ان ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کبھی دوزخ کی آگ تمہیں بھی آپکڑے۔"

مزید براں اقتدار میں شرکت جاہلیت کے نظاموں کو نئی زندگی بخشتا ہے اور ان کی مدت کو طول دینے کا باعث بنتی ہے۔

6- ہمارا اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ جو بھی اس قسم کی حکومت میں شرکت کرے وہ ان لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے، جن کے متعلق اللہ جل شانہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ {مائدہ: 44} "اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ لوگ کافر ہیں۔" (المائدہ: 44) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ {مائدہ: 45} "اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلہ

نہ کریں وہ لوگ ظالم ہیں۔“ (المائدہ: 45) ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ  
الْفَاسِقُونَ﴾ {مائدہ: 47} ”اور جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے مطابق فیصلے نہ کریں وہ لوگ  
فاسق ہیں۔“ (المائدہ: 45)

یہ تمام نکات ان تحریکات کے داعیوں اور امیروں سے چھپے نہیں ہیں، آیات کی عبارت کا  
واضح انداز اور قطعی نوعیت کا ہونا اور ان کے اشارات کسی بھی دیکھنے والے سے ڈھکے چھپے نہیں۔

اس سب کے ساتھ وہ مزید آگے یہ بھی کہتے ہیں کہ تحریک اسلامی کچھ حالات کے تحت ایسی  
رائے اختیار کر سکتی ہے کہ ’ اقتدار میں شرکت مسلمانوں اور اسلام کے لئے اور تحریک اسلامی کے لئے  
عظیم نفع کا باعث بن سکتی ہے اور یہ طاغوت کے مٹنے کا ذریعہ اور وسیلہ بن سکتی ہے اور حق کو مزید مستحکم  
کر سکتی ہے‘ ہم اقتدار میں شرکت کے نفع کا مندرجہ ذیل نکات کے تحت خلاصہ کر سکتے ہیں۔

(1) تحریک اسلامی کے خلاف کی جانے والی سازشوں کا پردہ فاش کرنا اور بند دروازے کے  
پیچھے ہونے والی خفیہ سرگرمیوں کی معلومات اور شناسائی حاصل کر کے ان کے متعلق  
اقدامات کے ذریعے ان پر قابو پانا۔

(2) جمعیت کا ایسا نمونہ پیش کیا جاسکے کہ یہ عوام کی راہبری کی اہل ہے نہ کہ صرف درویشوں  
کی جمعیت ہے۔

(3) اسلام پر دوبارہ یقین و اطمینان پیدا کیا جاسکے کہ وہ زندگی کے نجی اور شہری امور کے  
انتظام کا اہل ہے۔

(4) قوانین کے انتظامی امور کے مختلف طور طریقوں کے متعلق تحریک کے تجربہ کو بڑھایا جاسکے۔

(5) تحریک موجودہ نظام حکومت سے شناسائی حاصل کر لے اور اس کی برائیوں سے خود کو بچاسکے۔

(6) ایک خصوصی تربیت یافتہ اسلامی گروپ کے لئے حکومتی وظیفہ کے انتظام کے ذریعہ ان کی تعلیم و تربیت کا نظم کیا جاسکے۔

(7) اسلامی جمعیت کے کارکنوں میں سے ان افراد کا ایک مجموعہ تیار کیا جاسکے جو عوام کے درمیان اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیتوں پر مشتمل ہو، یہ وہ افراد ہونگے جو تحریک اور اسکے ممبران کی بیشتر دشواریوں کا حل پیش کریں گے۔

(8) تاکہ مزید اسلامی مراکز قائم کئے جاسکیں، اور کفر کے کیمپ کے مراکز کا مقابلہ کیا جاسکے۔

(9) اسلامی گروپ کو سیاست میں تربیت دلائی جاسکے اور مزید تجربہ کار بنایا جاسکے تاکہ اسکے داؤ پیچ کو بے اثر کرنے کے قابل بنیں۔

(10) تحریک کے نفع کے لئے اقتدار کے اثر و رسوخ کا استعمال کیا جاسکے۔

(11) اگر اسلامی تحریک اقتدار میں حصہ نہیں لے گی تو بسا اوقات ان کا متبادل شرکت کرنے والے وہ لوگ بنیں گے جو دشمن اسلام ہو سکتے ہیں جو اپنی تمام تر سرگرمیاں تحریک اسلامی یا اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے میں استعمال کریں گے۔



ہم نے ان کے موقف کو کافی تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے، حالانکہ ہمارے بیان کا انداز ان کے حوالہ جات پیش کرنے کی بجائے ان پر رد کرنے کے انداز میں زیادہ تھا، یہ ترتیب ان کے موقف کی نوعیت کی حقیقت کو واضح انداز میں سمجھنے کے لئے اختیار کی گئی ہے تاکہ ہر کسی کے سامنے کھل کر واضح ہو جائے کہ انہوں نے اللہ جل شانہ کے دین کے خلاف اپنی شوخی و گستاخی میں کس حد تک بڑھ جانے کی جرات کی ہے جب وہ ایسے فتوے صادر کرتے ہیں جو آسمانوں اور زمین کے خالق کے غیظ و غضب کو پکارتے ہیں اور مومنین کے درمیان آپس میں نفرت پیدا کرتے ہیں، اور جو اللہ کے حقوق کے آداب اور اس کے حکم کی پابندی کے بغیر ہوتے ہیں۔ یہ ترتیب اسلئے بھی اختیار کی گئی تاکہ مسلمان جان جائیں کہ ان کی رائے کس حد تک قطعی شرعی احکام کے برخلاف اور متنازع ہے جو کہ کسی بھی طرح تبدیل نہیں کئے جاسکتے اور مسلمان یہ بھی جان لیں کہ ان لوگوں نے اسلام میں استنباط کے صحیح طریقہ کار کی پابندی توڑ کر کتنی دور نکل چکے ہیں اور ان کی استنباط کے ایک نئے طریقہ کار کی تخلیق کی فسوف کاری کو کھلی آنکھوں دیکھ لیں، جس کے آثار اس وقت ہی نظر آگئے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تھا اور مسلمان مغرب سے ہیبت زدہ اور مرعوب ہو چکے تھے، حتیٰ کہ انہوں نے اپنی سوچ کے طریقہ کار میں بھی مغرب کی نقالی اختیار کر لی تھی یعنی مغربی طرز فکر کو اپنایا تھا اور یہ ترتیب اس لئے بھی ہے کہ ہم ان کے افکار کا تفصیلی تعاقب کر سکیں اور ان کو مسترد کر سکیں اور ان کی اس نئی طرز فکر کا پیچھا کرتے ہوئے اسے رد کر سکیں۔

ایک واضح اور قطعی حکم جس میں اجتہاد کی قطعی گنجائش نہیں ہے، یہ ہے کہ ربا یا سودی لین دین ہر گز جائز نہیں ہے، اللہ نے صاف طور پر اس سے منع فرما دیا ہے جب اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے یہ فرما کر اسے حرام قرار دیا: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ {البقرة: 275} "اللہ نے خرید فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔"

واضح اور قطعی قرائن سے اس کے بارے بہت سخت الفاظ آئے ہیں اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا : ﴿يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتِ﴾ {البقرة: 276} "اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے انہیں خبردار کر دیا جو سودی معاملات میں ملوث ہیں اور ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا : ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ {البقرة: 279-278} "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمے) باقی رہ گیا ہو اسے چھوڑ دو، پھر اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ سن لو۔"

مزید اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے سود کھانے والوں کا انجام اس طرح بیان کیا ہے : ﴿الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ﴾ {البقرة: 275} "جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔"

رسول اللہ ﷺ نے اس کو بڑے کبیرہ گناہوں میں سے گناہ ہے اور اس کو شرک سے جوڑ دیا ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا : ((اجتنبوا السبع الموبقات. قالوا: وما هي يا رسول الله؟ قال: الشرك بالله، والسحر، وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق، وأكل الربا، وأكل مال اليتيم، والتولي يوم الزحف، وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات)) (متفق عليه) "سات مہلک گناہوں سے بچو۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ وہ کون کون سے ہیں؟ آپ ﷺ نے جواب دیا: اللہ کے ساتھ

کسی کو شریک کرنا، سحر کرنا، ناحق قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، میدان جنگ سے پسپائی اختیار کرنا، مؤمن اور سیدھی سادھی پاکدامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

ان تمام کے باوجود ہمیں ایسے افراد نظر آتے ہیں جو اس موقف کو اپناتے ہیں کہ سودی لین دین جائز ہے! اس تمام صریح اور قطعی حرمت کا کیا ہوا، وہ انتباہ اور دھمکیاں کہاں اوجھل ہو گئیں، اپنے اس طریقہ کار کے ذریعے اللہ کے احکام میں ہیر پھیر اور تغیر و تبدیل کرتے رہتے ہیں، شرعی قوانین کو دھندلا بنا رہے ہیں، دینی معاملات میں غفلت و بے پرواہی کے رجحان کو عام کر رہے ہیں اور اس کو مزید ایک فطری امر بنا رہے ہیں اور اس کے ساتھ شرع کے متعلق مسلمان کے رویہ میں لا پرواہی پیدا کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔

سود کی حرمت کے حکم کی طرح اللہ کی نازل کردہ آیات کے مطابق حکومت کرنا فرض ہے، اس کے متعلق خود ان کی گواہی کے مطابق حکومت کو اللہ کے لئے خاص کرنا فرض ہے، اس کی شہادت دینے کے باوجود ان کے اس نئی ایجاد شدہ طریقہ کے تحت انہوں نے مسلمانوں کے لئے کفر نظام حکومت میں اقتدار میں شرکت کو جائز ٹھہرایا ہے، ملاحظہ ہو ان کے یہ حوالے جو اوپر درج کئے گئے ہیں تاکہ صاف نظر آجائے کہ وہ لوگ جو خود کو اسلامی تحریک کے لیڈر، دانشور، علماء اور امیر جتلاتے ہیں وہ کس قدر حق سے منحرف ہوئے ہیں حالانکہ امیر یا لیڈر اپنے ماتحت افراد سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ یہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں:

(1) بلاشبہ جاہلیت نظام حکومت میں شرکت اختیار کرنے میں عظیم خسارہ ہے۔ یہ حکومتیں طاغوت کے قانون کا نفاذ کرتی ہیں اور اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے فرمان اور احکام سے انحراف کرتی ہیں اور اس کے حکم کو متنازع بناتی ہیں اور اس کی خلاف ورزیاں کرتی ہیں۔

(2) مسلمانوں کا جاہلیت کے نظام میں شامل ہونا مسلمانوں کو ایک بہت بڑے تضاد کی صورت حال میں مبتلا کر دے گا، مسلمان پر لازم ہے کہ وہ طاغوتی ریاستوں کے خلاف جدوجہد کرے، لہذا یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود طاغوت کا نفاذ کرے؟ اللہ نے ان لوگوں کے متعلق اپنا یہ فیصلہ سنا دیا ہے جو ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہوں لیکن فیصلہ طاغوت سے کرواتے ہوں:

(3) جو بھی اللہ کے احکام کے بالمقابل قانون سازی کرتے ہوں ان تمام طاغوتوں کی اطاعت کا مطلب انہیں اللہ کے بجائے مالک، رب، حاکم اور معبود تسلیم کرنا ہے۔

(4) امراء یا حکام اچھے اور بھلے لوگوں کو عہدے دے کر اپنی بھڑی اور غلیظ حکمرانی کو مزین کرنے میں ان کا استعمال کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے عوام الناس اور بھولے بھالے لوگوں کو دھوکہ دیا جاسکے، اس طرح یہ حکام کہتے ہیں کہ اگر وہ حقیقت میں باطل پر ہیں تو فلاں فلاں عالم یا بااخلاق شخصیتوں نے ان کے ساتھ اقتدار میں شریک ہونا تسلیم نہیں کیا ہوتا۔

(5) ان بھلی مسلم شخصیتوں (وزراء) کی وساطت سے ظالمانہ اور کالے قوانین جاری کرواتے ہیں۔

(6) جب یہ قوانین اپنے شیطانی مقصد حاصل کر لیتے ہیں تو پھر یہ امراء ان وزراء کو نکال باہر کرتے ہیں جس طرح کوئی کھجور سے گٹھلی نکال کر پھینک دیتا ہے

(7) موجودہ اقتدار میں شرکت دراصل ظلم و زیادتی کرنے والوں کی جانب مائل ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

(8) مزید براں اقتدار میں شرکت جاہلیت کے نظاموں کو نئی زندگی بخشتا ہے اور ان کی مدت کو طول دینے کا باعث بنتی ہے۔

(9) جو بھی اس قسم کی حکومت میں شرکت کرے وہ ان لوگوں میں شامل ہو گا جن کے متعلق اللہ جل شانہ نے یہ ارشاد فرمایا ہے: ﴿الْكَافِرُونَ﴾ {مائدة: 44} ”کافر ہیں۔“ (المائدة: 44) ﴿الظَّالِمُونَ﴾ {مائدة: 45} ”ظالم ہیں۔“ (المائدة: 45) ﴿الْفَاسِقُونَ﴾ {المائدة: 47} ”فاسق ہیں۔“ (المائدة: 47)

ان کے ان تمام بیانات کے باوجود وہ ایسی رائے نکال لائے ہیں، اللہ کے دین کے ساتھ یہ کیسی گستاخی کا مظاہرہ کر رہے ہیں!

مزید اس معاملہ کو یہ امر بدترین کر دیتا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف اللہ کے احکام کو توڑ رہے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کے قانون کو توڑنے اور اس کی ہتک حرمت کی دعوت دے رہے ہیں، جو بلاشبہ ایک گناہ عظیم ہے۔

ان کی شرع کی اس خلاف ورزی کے بیان کے بعد ان سے ایک سوال یہ پچتا ہے کہ اگر وہ اقتدار میں شرکت کر لیں تو بالآخر وہ کیا حاصل کریں گے؟ ہمارا خیال یہ تھا کہ وہ اس دعوت (اقتدار میں شرکت) کے بارے میں احتیاطوں کے بیان اور اس کے بارے میں تنبیہات کرنے کے بعد شائد وہ ان مفادات اور عظیم مقاصد کو بیان کریں گے جن کی اطلاع ان کو تو ہو گئی مگر شرع اس سے بے خبر رہی، اور ان کے نامنظور منطق اور بانجھ طرز فکر کے مطابق یہ مفادات اس لائق ہیں کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے شرع کی مخالفت کی جائے ان کی یہ انوکھی سوچ جو اس معاملہ میں قانون سازی کا اپنا کردار ادا کرتے ہوئے نظر آتی ہے مسلمانوں کو اس نے وہ نتائج اخذ کر کے دیئے ہیں جو ان کے لئے آخرت میں بربادی کا

سبب ہو سکتے ہیں، جو نہ تو ان کی دعوت میں کسی بھی طرح مددگار ہیں اور نہ ہی وہ مسلمانوں کو حق سے قریب تر کرتے ہیں اور نہ انہیں حق پر ثابت قدم ہونے کی دعوت دیتے ہیں، نہ ہی انہیں اللہ کی نصرت سے قریب کرتے ہیں اور کم از کم نہ وہ حقیقتِ حال کو تبدیل کرنے میں کوئی تعاون کرتے ہیں، بلکہ نتائج الٹ بھی ہو سکتے ہیں یعنی حقیقت انہیں ہی تبدیل کر کے رکھ دے اور واقعات اس خدشہ کی گواہی دیتے نظر آتے ہیں، لہذا وہ قنڈار میں شرکت کر کے کبھی خود مختار نہ اقتدار بھی حاصل کر سکیں گے؟ یہ یقینی نہیں ہے لیکن یہ ضرور یقینی ہے کہ وہ اس خلاف ورزی کے نتیجے میں اللہ کا غضب ضرور مول لیں گے۔

انہوں نے کل 11 نکات پیش کئے اور کہا کہ یہ عظیم مقاصد ہیں جو جاہلیت نظام میں شمولیت اور شرکت کے ذریعہ حاصل کئے جاسکتے ہیں، خدا را! آپ ان مقاصد کو دیکھیں اور سوچیں کہ یہ مقاصد اس گناہ عظیم کے ساتھ موازنہ میں کتنے حقیر ہیں، ان میں سے کچھ کو ہم دیکھتے ہیں اور ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

- قوانین کے انتظامی امور کے مختلف طور طریقوں کے متعلق تحریک کے تجربہ کو بڑھایا جاسکے۔

- اسلامی گروپ کو سیاست میں تربیت دلائی جاسکے اور مزید تجربہ کار بنایا جاسکے تاکہ اسکے داؤ پیچ کو بے اثر کر سکیں۔

- ایک خاص اسلامی گروپ کے لئے حکومتی وظیفہ کے انتظام کے ذریعہ ان کی تعلیم و تربیت کا نظم کیا جاسکے۔

یہ تینوں نکات ایک ہی مضمون سے تعلق رکھتے ہیں، موزوں یہی ہوتا کہ ان تینوں کو ایک میں جمع کر دیا جاتا، سوائے یہ کہ نکات کی کثرت کر کے اپنے دعویٰ پر تائیدات کی کثرت کا اظہار کر سکیں، تاکہ دیگر افراد کے مشاہدہ میں آسکیں اور اس کی وجہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ موضوع کی اساس، اس کے متعلق علم کی وسعت یا اس کی تفصیل کے متعلق ان کی معلومات نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل یعنی اس نظر یہ کا شرع کے تحت صحیح اور جائز ہونا ہے۔ کیا یہ مضامین جواز مہیا کرتے ہیں کہ مومنین اپنے العظیم رب کی نافرمانی کر سکتے ہیں اگر اس کی بدولت انہیں نفع کا حصول ہوتا ہو؟ کیا ایسا کوئی دوسرا سستہ میسر نہیں ہے جس کے ذریعے اپنے رب کا غضب حاصل کئے بغیر تحریک اپنے شباب (نوجوانوں) کو تربیت دلا سکے اور ان کے تجربہ کو مزید بڑھا سکے؟ ایسی تیاریوں کے لئے شرعی طریقہ میں کیا کوئی کمی پائی جاتی ہے؟ اسلامی تحریک جو شرع سے جائز طریقہ پر نبی کریم ﷺ کے طور پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتی ہے، وہ ان نام نہاد حکمرانوں کی حقیقت اور کافر حکومتوں کے حکمرانوں کے ساتھ ان کے رشتوں کی وسعت اور مراتب، ان کے سیاسی کھیل اور مکارانہ طرزِ عمل کے متعلق اپنی واقفیت اور تجربات میں اضافہ حاصل کر لیتی ہے، کیا داعی ایک شرابی کو شراب ترک کرنے کی دعوت دینے سے قاصر ہے اور محتاج ہو چکا ہے کہ وہ خود شراب خانہ میں داخل ہو کر شرابی کے سامنے شراب نوش کرے پھر اس طرزِ عمل کو ترک کر دے اور اس طرح شرابی کو بھی شراب ترک کرنے پر تیار کرے اور پھر اس طریقہ پر مطمئن ہو جائے؟ واللہ کتنے کمزور عقل کے ہیں وہ ذہن جو اس سوچ کو لے کر آئے ہیں! وہ کس طرح خود پر جائز ٹھہرا سکتے ہیں تاکہ وہ اللہ کے حکم (دین) میں رد و بدل کر سکیں؟ جبکہ خود وہ اس مقصد کو لے کر اٹھے ہوں کہ اللہ کا دین نافذ کر سکیں!

انہوں نے مزید تین مذکورہ ذیل نکات کو بیان کیا کہ:

- تاکہ تحریک موجودہ نظام حکومت سے شناسائی حاصل کر لے اور اس کی برائیوں سے خود کو بچا سکے۔

- تحریک اسلامی کے خلاف رچی جانے والی سازشوں کا پردہ فاش کیا جاسکے اور بند دروازہ کے پیچھے ہونے والی خفیہ سرگرمیوں کی معلومات اور شناسائی حاصل کر کے ان کے متعلق اقدامات کے ذریعے ان پر قابو پایا جاسکے۔

- اگر اسلامی تحریک اقتدار میں حصّہ نہیں لے گی تو دوسرے حصّہ لینے والے دشمنانِ اسلام ہو سکتے ہیں جو اپنی تمام تر سرگرمیاں تحریک اسلامی الغرض اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے میں استعمال کریں گے۔

یہ تینوں نکات بھی محض ایک ہی موضوع کے گرد ہیں جو کہ 'غیر اسلامی حکومتوں کے شر سے اپنے آپ کی حفاظت کرنے اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں کے دفع کرنے سے متعلق ہے، لہذا جس صورت حال کو انہوں نے بیان کیا ہے ہم اس کے قائل ہوئے بغیر اس کو اسی جوں کے توں بیان کریں گے اور ان ہی اصول و پیمانہ سے ان کے متعلق فیصلہ کریں گے، لہذا ہم ان سے یہ جواب طلب کرتے ہیں کہ کیا واقعی انہوں نے ایسی حکومتوں میں شامل ہو کر جو اللہ کے نازل کردہ قوانین کے علاوہ سے حکم کرتی ہیں، ان کے خطرات سے خود کا اور امت کا دفاع کر دیا ہے؟ جبکہ انہی کے الفاظ میں وہ کہتے ہیں کہ حکمران بھلے لوگوں کو اقتدار میں وزارت دے کر دراصل اپنے اقتدار کی مدت لمبی کرتا ہے اور تاکہ وہ اپنے منصوبوں کو ان کے ذریعے عملی جامہ پہنا سکے اور عوام کے سامنے اپنے اقتدار کی شبیہ کو صاف ستھری جتلا کر پیش کر سکے اور پھر جب یہ حکمران اپنے شیطانی مقصد حاصل کر لیتے ہیں تو پھر ان بھلے وزراء کو نکال باہر کرتے ہیں جس طرح کوئی کھجور سے گٹھلی نکال کر پھینک دیتا ہے، چنانچہ شیطانی



منصوبوں سے وہ دفاع کی صورت کدھر ہے؟ اس اقتدار میں مسلمانوں کی شرکت سے جاہلیت نظاموں کی شبیہ ہرگز نہیں سنورتی ہے، بلکہ ان بھلے مسلمانوں کی شبیہ ضرور بگڑ جائے گی اور عوام الناس کا فیصلہ اس اقتدار اور اس میں شرکت کرنے والوں کے لئے یکساں ہی ہوگا۔

مزید انہوں نے دو مندرجہ ذیل نکات بیان کئے جو گزشتہ نکات کی طرح ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں:

۔ جمعیت کی ایسی شبیہ پیش کی جاسکے کہ یہ عوام کی راہبری کی اہل ہے نہ کہ صرف درویشوں کی جمعیت ہے۔

۔ اسلام پر دوبارہ یقین و اطمینان پیدا کیا جاسکے کہ وہ زندگی کے نجی اور شہری امور کے انتظام کا اہل ہے۔

جمعیت (گروپ) کبھی بھی ایسی شبیہ حاصل نہیں کر پائے گی بلکہ اس نے لوگوں کے لئے ایک غلط مثال پیش کی ہے اور ایسا خاکہ پیش کیا ہے جس کے تحت اسلام میں دوبارہ یقین و اطمینان پیدا کرنے کیلئے پیش قدمی کبھی حاصل نہیں کی جاسکتی ہے، خود حقیقت ہی اس کا سب سے واضح ثبوت ہے، اگر دیگر سنجیدہ اور اسلامی جمعیتیں نہ ہوتیں، جنہوں نے اس دعوت کی مخالفت کی اور ایسے سنجیدہ فکر مند علماء اس کے مخالف نہ ہوتے تو موجودہ حکومتوں کی حمایت میں ان کی اس دعوت کے تحت اس رائے کے زیر اثر اسلام شائد لوگوں کے دلوں سے کھرچ جاتا۔ اللہ کے نزدیک اور اس کے بندوں کی نظروں میں کتنا عظیم فرق سامنے آتا ہے ان علماء یا تحریکوں کے درمیان جو کہ اقتدار کی مہیا کی ہوئی آسائشوں میں اپنی خود ساختہ باطل قیادت کے بھرم کے گرد پروان چڑھتے ہیں اور اقتدار کی رعونت اور گھمنڈ سے بھر پور فضاء میں سانس لیتے ہیں اس کے برخلاف وہ علماء اور تحریک جو علی الاعلان حق کی دعوت دیتی ہے اور

کسی کی ملامت کی پرواہ کئے بغیر الزام تراشیوں سے بے خوف ہو کر اس پر پابند رہتی ہے، اللہ کی رضا کے لئے وہ سب کچھ کر گذرتی ہے، چاہے اس کے لئے انہیں اس کے لئے حکمرانوں کی طرف سے زنداں کی قید کیوں نہ گوارا کرنی پڑے وہ اسے اللہ کی اس یاد دہانی کے ساتھ گوارا کر لیتے ہیں: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَرْشِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ {الاحقاف: 35} "(اے پیغمبر!) اسی طرح صبر کئے جاؤ جس طرح اولو العزم پیغمبروں نے کیا۔" ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا﴾ {الطور: 48} "اور تم اپنے پروردگار کے حکم پر جے رہو کیونکہ تم ہماری نگاہوں میں ہو۔" ﴿فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ﴾ {المومن: 55} "لہذا (اے پیغمبر!) صبر سے کام لو، یقین رکھو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔"

انہوں نے مزید چار نکات بیان کئے جو گذشتہ نکات کی طرح ایک ہی موضوع سے متعلق ہیں اور محض ایک ہی نکتہ میں ان کا خلاصہ بیان کیا جاسکتا ہے۔

انہوں نے کہا:

- اسلامی جمعیت میں سے ایسے افراد کا جھگڑا تیار کیا جاسکے جو عوام کے درمیان اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیتیں ہوں، یہ وہ افراد ہونگے جو تحریک اور اس کے ممبران کی بیشتر دشواریوں کا حل پیش کریں گے۔

- تاکہ مزید اسلامی مراکز قائم کئے جاسکیں جو کفر کے کیمپ کے مراکز کا مقابلہ کر سکیں۔

- اسلامی گروپ کو سیاست میں تربیت دلائی جاسکے اور مزید تجربہ کار بنایا جاسکے تاکہ اسکے داؤ پیچ کو بے اثر کر سکیں۔

- تحریک کے نفع کے لئے اقتدار کے اثر رسوخ کا استعمال کیا جاسکے۔

یہ نکات ان افراد کی سطحی اور ادنیٰ قسم کی اُمید اور تمناؤں کا مظاہرہ ہے جو اس رائے کی حمایت کرتے ہیں، کیا اس قسم کے نتائج اس قابل ہیں کہ ان کی خاطر اللہ کی خوشنودی کو داؤ پر لگا دیا جائے اور اللہ کی جانب سے ظالمون اور فاسقون قرار دیئے جانے اور زیادتی کرنے والوں کا ساتھ دینے کا "تمغہ" وصول کیا جائے؟ اگر تحریک ان نقصانات میں پڑے بغیر ان نتائج کو حاصل کر سکتی ہے تو کر دکھائے۔ ہم قطعاً اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ تحریک ان نتائج کو حاصل کر لے گی، اگر وہ اللہ کی خلاف ورزی کرے اور جاہلانہ اقتدار میں شرکت کرے اور اللہ کو ناراض کر لے۔ بلکہ نتائج اس کے برعکس ہونگے جماعت کے لئے، دعوت کے لئے اور عام طور پر اسلام کے لئے۔ اگر اس رائے کے حامی افراد ایسے 11 نقاط یا وجوہات دریافت کر سکتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اس برتاؤ پر مجبور ہوئے تو ہم کچھ دیر کے لئے ان ہی کے ناجائز طرزِ فکر کے مطابق ایسے کئی دیگر نکات دریافت کر سکتے ہیں جو اس عمل میں دشواریاں اور رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں مثال کے طور پر:

اس رائے کے طرزِ عمل پر چل کر تحریک کے ذمہ داران اور شباب (نوجوان) منافقت سیکھیں گے اور جب وہ حکمرانوں کی موجودگی میں ہوتے ہیں جنہوں نے ان کو اقتدار میں جگہ دی ہے تو ان سے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان حکمرانوں کو پسند آئے اور جب اپنے لوگوں کے درمیان وہ تنہا ہوتے ہیں تو وہ کچھ اور بات کہتے ہیں اور حکمرانوں کے سامنے یہ ظاہر کر کے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ حکمران کے معتمدِ خاص اور قریب ہیں تاکہ ان کی حکومت کو ختم کر کے اسے ہتھیاسکیں۔

جمیعت کی پیش کشیں پھیکی اور ڈھیلی پڑتی جائیں گی اور جمیعت بے فکری اور عدم استحکام کا شکار ہوتی جائے گی۔ یہ سب بنیادی تجویز اور تبدیلی کی جگہ لیتی ہے۔

حکومت کو آزادی ہوگی کہ وہ تحریک کے ممبران اور حامیوں کی گنتی کرے اور ان کی چھپی باتوں کو آشکار کر دے اور ان کے راز معلوم کرے، حکومت کے سامنے ممبران کے درمیان اختلافات آشکار ہو جائیں گے، لہذا حکومت ان اختلافات کو مزید ہوا دینے اور دیگر ممبران کے درمیان ابھارنے کی کوشش کرے گی تاکہ وہ باآسانی جمیعت کو قابو میں کر سکے اور وقت پڑنے پر اس میں مزید تفرقہ پیدا کر کے جمیعت کو تقسیم کر سکے۔

ایسی جمیعت کی دعوت صرف انہی قوانین کی حد تک محدود ہوگی جہاں تک انہیں چھوٹ دی گئی ہے اور جہاں تک وہ حکومت کے لئے درد سر نہیں بن سکتے اور دعوت دیگر اہم امور پر خاموش رہے گی اور اس طرح دعوت اور اسلام کی ایک غلط شبیہ سامنے آئے گی۔

جب حکومت اس کی سلطنت میں سرگرم تحریک کو اجازت دیتی ہے تاکہ وہ اپنے مرکز قائم کر لے جس کے ذریعے وہ اپنی سرگرمیاں انجام دے سکیں تو جماعت ان مراکز کی محبت کی اسیر ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ اس خدشہ میں رہتی ہیں کہ حکومت ان پر اپنا ہاتھ نہ ڈالے اور انہیں ضبط نہ کر لیں چنانچہ وہ کسی ایسی چیز کے متعلق اپنا آزادانہ فیصلہ نہیں دے سکتیں جو حکومتوں کی ناراضگی کا باعث بنے نتیجتاً جماعتیں ان مراکز سے علیحدہ ہونے کے متعلق تصور بھی نہیں کر پاتیں۔

جب مسلم تحریکیں جاہلیت نظام میں شرکت قبول کرتی ہیں تو اس طرح ان کا عمل حکومت کو جواز فراہم کرتا ہے کہ دیگر ایسے گروہ جو رسول اللہ ﷺ کے طریقہ پر تبدیلی کے لئے اپنی سرگرمیاں انجام دیتی ہیں، حکومت ان کو اپنا مخالف سمجھ کر انہیں بنیاد پرست اور پر جوش اور متعصب قرار دے کر

ان پر اپنا شکیبہ کس لیں اور انہیں اپنی گرفت میں لے لیں، اور وہ جو حکومت کے ساتھ مل کر کام کریں انہیں وہ روشن خیال، معتدل اور سیکولر مسلم تسلیم کرنے لگتی ہیں۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے کہ اس نرم اور لطیف طریقہ کار کے حامی افراد نے اپنی علمی مکالمات میں ظاہر کیا ہے کہ ان کے اس طریقہ کار کی وجہ سے حکومتوں کے نزدیک وہ قابل قبول ہیں اور حکومت ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے تیار ہے جب کہ حکومت کے نزدیک دیگر جماعتیں بنیاد پرست ہیں۔

ایسے اسلامی جمعیتوں کے نظریات میں اسلامی احکامات کے متعلق حالات کے پیش نظر زبردست تغیرات رونما ہوئے ہیں مثلاً غیر مسلم ذاتی سے جزیہ وصول کرنے کے حکم کے متعلق ان کا انکار اور انہیں اہل ذمہ نہ پکارنا اگر اس سے ان کے جذبات مجروح ہوتے ہوں، اس کے علاوہ ان کا یہ خیال کہ جمہوریت دراصل ان کا اپنا اسلامی نظریہ حیات ہے جو ان تک دوبارہ پہنچا ہے یا سود کے معاملات میں لین دین کا جائز کیا جانا، اللہ کے نازل کردہ قوانین کے علاوہ قوانین سے جاری حکومت میں داخلہ اور شرکت اختیار کرنا جو خود ان کے نظریات کی تردید کرتا ہوا ایک بڑا واضح تغیر ہے، جیسا کہ اس سے قبل ان کا شرکت کے متعلق یہ کہنا تھا :

یہ ایسے جاہلانہ نظام کی مدت کو بڑھا دیتا ہے۔

یہ جاہلانہ نظام کی ایک خوبصورت تصویر پیش کرتا ہے۔

اسلام لوگوں کے ذہنوں سے ان کے تمام مسائل کے حل کی حیثیت میں قائم نہیں رہتا جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان حکومتوں کے ذریعے اسلام نے انہیں کچھ نہیں دیا ہے، خاص طور پر جب اس نظریہ کے حامی افراد نے لوگوں سے من و سلویٰ کا وعدہ کیا تھا یعنی تمام اقسام کی دولت و ثروت۔ یہ منظر تلاتا ہے کہ وہ اپنے مسائل صحیح طور پر حل نہیں کر سکتے، لہذا تحریک خود کو ایک قابل تقلید نمونہ کے بطور

نہیں پیش کر سکتی تا کہ دوسرے اس کی نقل و پیروی کر سکیں، بلکہ وہ ایک بدنام زمانہ مثال بن کر رہ جاتی ہے۔

نوجوان شباب کے کردار خراب ہونے لگتے ہیں جب دعوت میں ان کی فکر صرف اپنے گروپ کی غلط عملی کے متعلق صفائی پیش کرنا بن جاتا ہے۔ چاہے حکومت یا اس کی کارگزاریوں کا دفاع کرنا ان کی فکر نہ بھی ہو۔

تحریک خاموش رہتی ہے، جب دوسرے داعی حکمرانوں کے زیر عتاب آتے ہیں یا انہیں قید و بند میں مبتلا کرتے ہیں حتیٰ کہ تحریک ان کو ملامت کرتی ہے تا کہ حکمرانوں کو خوش کر سکیں یا ان کی درخواست کی بجا آوری میں ایسا کرتے ہیں جیسا کہ مصر میں حال ہی میں سامنے آیا۔ (جس وقت یہ کتاب لکھی گئی تھی)

یہ طریقہ کار مصلحت ( مفاد) کو گروپ کے افعال کا معیار بناتا ہے، بجائے کہ شرعی حکم پر پابندی اختیار کی جائے، جو بھی عمل نفع کا باعث بنتا ہو اسے اختیار کیا جائے گا چاہے وہ صاف طور پر شرع کی خلاف ورزی میں ہو۔ چنانچہ مسلمان کی نظر میں منافع شرع سے زیادہ عزیز ہونے لگتے ہیں۔ لہذا دیگر ایسی کئی وجوہات ہیں جو دین اور دعوت کی بربادی کا سبب بنتی ہیں۔

ہم نے اب تک ان تمام کو حقیقت سے دیکھنے کی کوشش کی ہے نہ کہ شرعی دلائل کے ذریعے، یہ صرف اس لئے کہ ہم انہیں بتلا سکیں کہ ان کا سوچنے کا نظریہ انہی کے اپنے مکتب فکر کے تحت اسلام اور دعوت کے لئے شیطانی ثمرات کے علاوہ کچھ اور نہیں دے سکتا، یہ ایک بانجھ طرز فکر ہے جس کو شرع کی منظوری حاصل نہیں ہے۔

یہ ہمارا طریقہ کار نہیں ہے اور یہی کچھ ہم نے شرع سے اخذ کیا ہے کہ جس کے تحت ہم کسی نظریہ کے باطل پن کے لئے صورت حال سے دلیل لے کر آپس میں یا شرعی حکم کی عقلی بنیاد پر نفی کرتے پھریں۔ ہم نے گفتگو کی شروعات ان کے طریقہ کار کی بنیاد پر کی تاکہ انہی الفاظ کی تنقید کریں جو ان کی زبانوں سے ادا ہوئے ہیں اور انہی کے نظریہ سے انہوں نے جو بیان کیا اسکی نفی کریں۔ البتہ ہم دوسرے سنجیدہ اور سمجھ دار مسلمانوں کی طرح یہ جانتے ہیں کہ کسی بھی فعل یا قول کی قبولیت یا نا منظور کی لئے واحد کسوٹی شرع ہے۔ جب امر واقعہ یہ ہے تو انہوں نے جو شرعی دلائل پیش کئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وہ ان کے متعلق علم رکھتے ہیں اور یہ دلائل دوسروں سے مخفی نہیں ہیں تنہا ان شرعی دلائل سے استدلال ان کی رائے اور فہم کو مسترد کرنے کے لئے کافی ہیں، چاہے وہ کتنی ہی مثالوں کو بیان کریں، کیونکہ یہ معاملہ حقیقت سے متعلق نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی جڑ سوچنے کا طریقہ اور معیار ہے۔

ہم ان کی یہ بات نہیں سنیں گے کہ چونکہ وہ اپنی بات خود جانتے ہیں، سو انہیں اس سے متعلق یاد دہانی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ جو ان کی بات ہے کہ ان تمام شرعی دلائل کے متعلق علم کے باوجود انہوں نے ان پر عمل نہیں کیا جس کے لئے کچھ اسباب انہوں نے ذکر کئے ہیں۔ تو یہ جائز نہیں ہے، یہ دین پر جرات و دلیری ہے اور دین کے پختہ، قطعی اور صحیح اصولوں سے غفلت اور ان کو پس پشت ڈالنا ہے۔ جہاں تک کچھ علماء کے اقوال کا معاملہ ہے جو ان کے اس موقف کی تائید میں انہوں نے پیش کئے ہیں تو پہلے تو ان کے اقوال اس حقیقت کے متعلق نہیں ہے جس پر یہ ان کو چسپاں کرنا چاہتے ہیں دوم انسانوں کے اقوال شرعی نصوص کا درجہ نہیں رکھتے، اعتبار دلیل کا ہوتا ہے اور ان سے درست استدلال کا ہوتا ہے، اگر وہ کہتے ہیں کہ فلاں اور فلاں عالم کا یہ قول ہے تو ہمارا ان سے مطالبہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرمان ہے جو صحیح ہے، قطعی ہے، محکم (واضح اور غیر منسوخ) ہے۔ کیا یہ جائز ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جو فرمایا ہے اس کو کسی فرد واحد کے قول سے منسوخ یا مسترد کر دیا

جائے؟ مصلحت (منفعت) کا تصور اس طریقہ عمل کے حامی ان افراد کے ذہنوں پر اس قدر حاوی ہو چلا ہے کہ انہیں 'دعوت کا سودا گر' کہنا زیادہ موزوں ہو گا۔ البتہ سودا گر بھی تجارت نفع کمانے کی غرض سے کیا کرتا ہے نہ کہ نقصان اٹھانے کے لئے، (آخرت کا)۔

ان کی طرز فکر کی غامی ایک دوسرے زاویہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے جب وہ غیر جائز قیاس (analogy) پر اعتماد کرتے ہیں جو شرعی عبارتوں کی عقلی علت (reasoning) پر منحصر ہے اور یہ علت مفاد یا منفعت کی فوقیت اور ترجیح پر قائم کی جاتی ہے، ان کے ذریعے اس سے جو چیز اخذ ہوتی ہے وہ شرع سے استنباط کا ایک ایسا جدید طریقہ ہے جس سے امت اسلامی آشکار ہی ہے اور نہ ہی اس امت کے علماء کے علم میں اس سے قبل کبھی تھا۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے صحیح طریقہ استنباط کو چھوڑ دیا اور جس پر سلف صالحین میں سے ہر عالم نے اختیار کیا اور ان کے بعد ان تمام نے جو احسان (اخلاص) کے ساتھ اس طریقہ کی پیروی کرتے رہے۔ ان افراد کی کسی بھی بحث میں اس صحیح اور باضابطہ شرعی طریقے کی کوئی نشانی اور جھلک نہیں پائی جاتی۔ انہوں نے عقلی قیاس اور منفعت کی دریافت کر کے درحقیقت اس مغرب کی نقالی اختیار کی ہے جس سے وہ پہلے ہی مرعوب ہیں، ان پر یہ فرمان رسول ﷺ برجستہ صادر ہوتا ہے: ((إِنَّهُ مِنْ يَعْشَ مِنْكُمْ فِسِيرِي اخْتِلَافًا كَثِيرًا. وَإِيَاكُمْ وَمَحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ مُحَدَّثَةٍ بَدْعَةٍ، وَكُلُّ بَدْعَةٍ فِي النَّارِ)) (رواہ الترمذی و ابو داؤد) "تم میں سے جو زندہ رہا یقیناً وہ بہت اختلافات دیکھے گا۔ تم نئی باتوں سے بچو کیونکہ (دین کے اندر) ہر نئی بات بدعت ہے اور (صاحب) بدعت جہنم میں ہو گا۔"



وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے جوئے بازی اور شراب نوشی کو حرام قرار دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس میں لوگوں کے لئے کچھ نفع ہے مگر یہ نفع بہت قلیل ہے، لہذا شراب اور جوئے بازی کے معاملہ میں عظیم خسارہ کو ترجیح ہوگی۔

شرع نے جہاد کو فرض کیا حالانکہ اس میں مؤمنوں کی جانوں اور مالوں کا نقصان ہے، یہ اس لئے کیونکہ جہاد میں بڑا نفع و مفاد موجود ہے (اللہ سبحانہ و تعالیٰ) کے نزدیک اور انسانیت کے لئے بھی اس میں بڑا نفع و مفاد موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ کعبہ کی تعمیر کی خاطر اس کو مسمار کرنے سے باز آتے ہیں اور اس کو بنیادِ ابراہیمی پر دوبارہ قائم کرتے ہیں حالانکہ اس کو مسمار کر کے دوبارہ تعمیر کرنے میں مذہبی نفع تھا، ایسا انہوں نے اس لئے کیا کیونکہ کعبہ مسمار اور پھر تعمیر کرنے کی صورت میں نقصان کا اس کے نفع سے بڑھ جانے کا خدشہ تھا۔

ان تمام کی بنیاد پر وہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ جاہلیت نظام میں شرکت میں زبردست نقصان ہے لیکن کچھ حالات کے تحت تحریک یہ سوچ سکتی ہے کہ اقتدار میں شرکت اختیار کرنا اسلام کے لئے، مسلمانوں کے لئے، تحریک اسلامی کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے، اور حتیٰ کہ یہ طاغوت کے خاتمہ اور حق کے قیام کا ذریعہ و وسیلہ بھی بن سکتی ہے۔

انہوں نے اپنی اس فکر کو دوسرے زاویہ سے بھی پیش کرنے کی جدوجہد کی جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کا یہ طرز فکر کس طرح ان کے ذہنوں کی گہرائی میں جا کر پیوست ہو چکا ہے۔

نصوص کو اس طرح سمجھنا اور ان سے ایسے حکم اخذ کرنا جو اسلام سے متناقض ہوں ایک لمحہ فکریہ اور دردناک معاملہ ہے۔ اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس رجحان میں مغربی تہذیب سے مرعوبیت اور تاثر کے اس دور میں مزید قوت اور اضافہ ہو رہا ہے، جو مصلحت پر مبنی قیاس پر قائم ہے۔ یعنی ایسا استنباط مغرب کے نظریہ منفعت کو استحکام بخشتا جاتا ہے۔ دور اول کے علماء اسلام کے ان باضابطہ اصول پر گامزن رہے جن کو اسلام کی فطرت و طبیعت لازمی قرار دیتی ہے۔ وہ فطرت اسلام جو اللہ کے فرمان کو ہر معاملے میں بغیر کسی انسانی مداخلت کے بنیاد بناتی ہے اور مداخلت کو خواہ کتنی ہی قلیل مقدار میں کیوں نہ ہو، جائز نہیں کرتی، ان شاء اللہ عنقریب ہم اس کا بھی مطالعہ کریں گے، دوسری جانب ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں نے اس جدید اور خود ساختہ روش کے ذریعے ایک ایسا دروازہ کھول دیا جو احکام سازی تک لے جاتا ہے اور اس میں داخل بھی ہو گئے۔ انہوں نے کسی بھی فعل کی جس کو وہ خود انجام دینا چاہتے تھے، منفعت یا نقصان کی جانچ پڑتال کے لئے اپنی خواہشات کو کسوٹی بنایا۔ عقلی نقطہ نظر سے جب نفع اس کے نقصان سے انہیں زیادہ معلوم ہوتا تو اس فعل کو انجام دینے کا حکم کیا جاتا اور جب خسارہ نفع کے مقابلے میں انہیں زیادہ معلوم ہوتا تو ان پر واجب ہو جاتا کہ وہ اس فعل سے گریز کریں، اس نئے طریقہ استنباط سے مسلمان خود حاکم (قانون ساز) بن گئے کیونکہ خود اس کی خام خیالی کی بنیاد پر اور اس کی عقل کی بنیاد پر اس نے نفع کے متعلق فیصلہ دینا شروع کر دیا۔

اس طرح افعال کے متعلق حکم حاصل کرنے کے لئے اس شکل کے ساتھ نصوص کو سمجھنے پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ طریقہ ہے جس پر مغرب میں اعتماد کیا جاتا ہے، پس مغرب ایسی ذہنیت پر انحصار کرتا ہے۔

بہر حال یہ وہ طریقہ ہے جو مسلمانوں کو مفاد یا نفع کی عبادت کرنے پر مجبور کرتا ہے نہ کہ اللہ کے حکم کی عبادت کے لئے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب نفع یا مفاد شرعی حکم سے ٹکراتا ہے جو معنی و مطالب میں بالکل واضح اور قطعی ہو تو شرعی حکم کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کی بجائے نفع کی بنیاد پر حکم اخذ کر کے اسکو قبول کیا جاتا ہے۔

شرعی حکم کا استعمال کے متعین اصول ہیں جن کی پابندی کئے بغیر شرعی حکم پر عمل ہی نہیں ہوتا، مسلمان جو ان اصولوں پر کاربند رہتا ہے دراصل اللہ کی عبادت کرتا ہے اور اللہ کے حکم کا فرمانبردار ہوتا ہے اور جو بھی حکم استنباط کے صحیح طریقہ کو استعمال کر کے وہ اخذ کرتا ہے، وہ درحقیقت اللہ کا حکم ہوتا ہے اور یہ ناممکن ہو گا اگر وہ اس علت پر انحصار کرے جو شرع میں بیان نہ کی گئی ہو۔

حق و باطل، اچھا اور برا، قابل تحسین اور قابل مذمت افعال اور حلال و حرام ان تمام کا بیان اور ان کی تعریف صرف اللہ رب العزت ہی کر سکتے ہیں، یہ حق انسان کو کبھی بھی نہیں دیا گیا، اگر یہ حق انسان کے پاس ہوتا تو اس کے اندر ابتداء ہی سے قانون سازی کی صلاحیت بھی ودیعت کر دی جاتی اور شریعت پھر کسی حکم کی تفصیل میں مداخلت نہ کرتی اور مسلمانوں کے لئے اتنا ہی کافی ہوتا کہ وہ اللہ کے خالق کل ہونے پر یقین رکھیں اور ان پر یہ یقین رکھنا واجب نہ ہوتا کہ اللہ اس کی زندگی کے تمام امور پر قدرت رکھنے والا اور ان کا انتظام کرنے والا ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہزاروں کتب کی تصنیف کی گئی جو استنباط کے شرعی طریقہ پر ہی انحصار اور اعتماد کیا کرتی تھیں ہمارے اولین فقہاء اسی طریقہ استنباط سے تمام مسئلوں کو حل کرنے کی قدرت رکھتے تھے، یہ ایک عملی اور سادہ طریقہ ہے اس کے لئے جس کو اس کے علم کی دولت سے نوازا گیا اور جو خود کو اس کے اصولوں کے تحت پابند رکھے۔ اس جدید بدعت کے طریقہ استنباط سے پیدا

ہوئے بگاڑ کو یوں محسوس کیا جاسکتا ہے کہ اس کے ذریعے ایسے احکام حاصل ہوئے جو شرع کے واضح اور قطعی احکام سے قطعاً مختلف ہیں۔ اگر یہ طریقہ حق بجانب ہوتا تو اس کے ذریعے حاصل شدہ احکام شرع کے احکام سے موافق ہوتے، یہ امر بذاتِ خود اس طریقہ کے فاسد ہونے کو ظاہر کرتا ہے جیسا کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے والے غلط اثرات ظاہر کرتے ہیں، چند مثالوں سے یہ مزید واضح ہو گا۔

دعوت کو شرعی طور پر انجام دینے کی خاطر صاف گوئی، حوصلہ، جرات و بیباکی، منظوظی اور فکر درکار ہوتی ہے، اور یہ کہ وہ ان تمام کو لکارے جو اسلام سے متناقض ہوں اور ان کے مقابلے پر اتر آئے تاکہ اس کا باطل ہونا ظاہر کر دے، قطع نظر اس کے کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے یا حالات کیسے ہیں۔ اس دعوت کا تقاضا ہوتا ہے کہ بالادستی علی الاطلاق (absolutly) اسلامی مبدا ہی کو ہو، چاہے یہ فکر اکثریت سے متفق ہو یا نہ ہو، ان کی روایات سے اتفاق کرتی ہو یا نہ کرتی ہو اور اکثریت اس فکر کو قبول کرے یا مسترد کرے یا مخالفت کرے۔ دعوت لوگوں کی خوشامد نہیں کرتی اور نہ ہی اقتدار کی خوشامد کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا دعوت کے متعلق یہی طرزِ عمل تھا اور جس حقیقت کی وہ دعوت دے رہے تھے اس پر یقین رکھتے ہوئے رسوم و رواج، مذاہب، حکمرانوں، عوام الناس کسی کی بھی پرواہ کئے بغیر آپ ﷺ نے تمام دنیا کو لکارا۔ انہوں نے کسی بھی شے پر توجہ نہیں دی سوائے اس پیغام کے جو اسلام کی شکل میں نازل ہو رہا تھا، ابن ہشام کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کو لکارا تو انہوں نے اُن کے بتوں کے نام گنائے اور ان تمام کو کھلم کھلا جھٹلایا اور ان کی ذہنیت کی تحقیر کی اور ان کے آباؤ اجداد کو گمراہی پر بتایا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں قریش نے آپ ﷺ کو جھٹلایا اور مخالفت اور دشمنی میں اکٹھے ہوئے۔ یہ دعوت کی وہ طرز ہے جس پر مسلمان کی دعوت آج ہونی چاہیے وہ جو کہ رسول ﷺ کی تاسی (پیروی) اور اتباع کرنا چاہتا ہے تاکہ رب العزت کے فرمان پر عمل کرے۔ ﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾

{یوسف:108} ”(اے پیغمبر) کہہ دو کہ: ”یہ میرا راستہ ہے۔ میں بھی پوری بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف بلاتا ہوں اور جنہوں نے میری پیروی کی ہے وہ بھی۔“ ((ترکت فیکم ما إن اعتصمتم به فلن تضلوا أبداً، أمراً بیناً، کتاب اللہ و سنة نبیہ)) ”میں تمہارے درمیان ایسی واضح چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کو مضبوطی سے تھامے رکھا تو ہرگز نہیں بھٹکو گے، اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت۔“

اور وہ جو سلف الصالحین کے اس قول کی پیروی کرے، (لا یصلح آخر هذا الأمر إلا بما صلح به أوله) ”اُس کے بغیر اس دین کی انتہا بہتر نہ ہو سکے گی جس کی بدولت اس دین کی ابتدا بہتر ہو سکی تھی“ اس کو لازمی طور پر چاہئے کہ وہ اس طرز کی دعوت کو انجام دے۔

آج اس جدید اور بدعتی طریقہ استنباط کے مطابق جو کہ شرع کے نزدیک غیر مسلمہ ہے، ہم نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جو یہ کہتے ہیں کہ: رائج منفعیت سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ بہتر اور موزوں یہ ہو گا کہ ہم ہر معاملہ میں بہت حکمت سے کام لیں اور ہم احسن طریقے سے دعوت دیں جو سب سے بہترین ہو۔ یہ احسن ہونا بھی ان کے طریقے کے مطابق نہ کہ شرع کے مطابق۔ مزید وہ کہتے ہیں کہ اس طرح دعوت سے کیا فائدہ حاصل ہو گا اگر ہم ہر اس چیز کو لٹکانے لگیں جو اس کی مخالف ہے؟ ایسا کرنے سے ہم ان کے دلوں کے دروازے کھولیں گے یا مزید بند کر دیں گے؟ ہم لوگوں کو خواہ مخواہ کیوں محسوس ہونے دیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ بنیادی طور پر دوسروں کے پاس موجود ہر شے کی نفی کرتی ہے؟ کیا بہتر یہ نہیں ہو گا کہ ہم لوگوں کو وہ کچھ بتلائیں جو ان میں اور ہم میں مشترک ہیں، جو شائد ان کے دلوں اور دماغوں میں ہمارے لئے تھوڑی جگہ بنا دے اور ہم ان تک پہنچ سکیں، بالخصوص جب معاملات اس طرح ظاہر ہوں کہ ان میں اور ہم میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے؟ کیا یہ دعوت کے حق

(مفاد) میں بہتر ہو گا کہ آپ حکمرانوں کی مخالفت کرو اور ان کی سازشوں کو امت کے سامنے بے نقاب کرتے پھر دو اور ان کے منصوبوں کو ظاہر کر دو؟ اور اس طرح انہیں مشتعل کر دو اور ان کا عتاب اپنے سر لے لیں، یا یہ بہتر ہے کہ ہم ان سے قریب ہو جائیں اور ان کے دوست بن جائیں؟ شائد کہ وہ ہمیں اپنے قریب کریں اور ہمیں اس حیثیت میں لاکھڑا کر دیں اور ان مراکز تک پہنچائیں جو دعوت کو نفع دیں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے ہر کسی کو فائدہ پہنچے، یہ بھی ممکن ہے کہ ہم اس طرح حکومت کو بھی حاصل کر سکیں۔ اس لئے ہمیں ان کو باور کرانا ہو گا کہ انہیں ہم سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی ہماری ان سے قربت سے انہیں کوئی خطرہ ہے، یہاں سے خوشامد کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور وہ الفاظ ادا ہونے لگتے ہیں جو سچائی اور منہج حق سے بہت دور ہوتے ہیں، مزید یہ حکام کی رضا جوئی کے مراحل، ان کے کرتوتوں پر ناحق شہادت دینے، باطل پر خاموشی اختیار کرنے، چھوٹے معاملات میں الجھ جانا جن پر بات کرنا حکمران کے عتاب کا باعث نہ بنتا ہو اور اہم ترین معاملات جس کے متعلق امت کو خبردار کرنا ضروری ہو اسے نظر انداز کر دینے اور ان جیسے دیگر مختلف بیانات اور افعال کرنے کی جو حق سے ہٹ کر ہوں، ان تمام کو انجام دینے کی ایک شروعات ہوتی ہے، یہ تمام ترتیبی ان کے طرز فکر کے اندر مذکورہ تبدیلی واقع ہونے سے ہوئی۔

وہ عالم جو نبی کا وارث ہوتا ہے اس پر اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حق ہے کہ وہ اس کا حق ادا کرے اور ان مجاہدین کی صف اول میں کھڑے ہو کر حق کی آواز بلند کرے جو حق پر قائم ہوتے ہیں اور حکمرانوں کا احتساب کرتے ہیں اور ان کے منصوبوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر اسے علم، محراب اور جہاد کا امام ہونا چاہئے۔ یہی ہمارے سلف صالحین کا منہج اور طرز عمل ہوا کرتا تھا، ہم دیکھ کر جان سکتے ہیں کہ اس بدعتی طریقہ سے ایک ایسی بدعتی سمجھ اور فہم پیدا ہوئی ہے جو اس طرز عمل کے بالکل برخلاف ہے جو اولین علماء میں نظر آتا ہے، ان کی یہ سمجھ اور فہم اس طرح عیاں ہو جاتی ہے جب وہ بیان

کرتے ہیں کہ اگر عالم کلمہ حق کہے اور وہ مارا جائے یا قید کر لیا جائے تو اس کی جگہ کون لے گا؟ وہ خسارہ جو اس کی قید یا شہادت سے امت اٹھائے گی اُس اجر اور نفع سے کئی گنا زیادہ ہو گا جو وہ عالم اپنے موقف کے نتیجے میں حاصل کرے گا، لہذا ہم امت کو اُس عالم کی سرپرستی اور برکت سے کیوں محروم کر دیں؟

اسی طرح پارلیمانی انتخابات میں حصہ لینا جائز ہے، البتہ اس کی کچھ شرائط ہیں: نمائندہ مسلمان ہو اور اسلامی قوانین پر کاربند ہو، وہ کفریہ قانون کو قبول نہ کرتا ہو بلکہ وہ اس کا توڑ پیش کرتا ہو اور اس کی بجائے اسلامی شرعی قانون متبادل کے طور پر پیش کرتا ہو، اس کے لئے جائز نہیں ہو گا کہ ایک غیر مسلم شخص کو صدارت کے لئے منتخب کرے، یا جس کی حکومت اسلام کی بنیاد پر مبنی نہ ہو۔ اس کے لئے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ حکومت کو اعتماد کا ووٹ دے، بلکہ اس پر یہ لازم ہو گا کہ اس پر اعتماد نہ کرے کیونکہ حکومت کی تشکیل اسلام کی بنیاد پر نہیں ہوئی ہے، یہ ایک واضح شرعی حکم ہے۔

البتہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج اس جدید اور بدعتی طریقہ استنباط کی بدولت ان افراد کو ایسی رائے معلوم ہوئی جس کے تحت مسلمان ایسے نمائندہ کو منتخب کر سکتے ہیں جو قانون سازی، حکمران کے محاسبہ اور انتخاب کے لئے شرع کو تسلیم نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ تو عیسائیوں کو منتخب کرنے کو بھی جائز کرتے ہیں اور انتخابی فہرست میں ان کا داخلہ بھی قبول کر لیتے ہیں، اس عذر داری کے ساتھ کہ دستور کے تحت ہر علاقہ کے پارلیمانی نمائندگان مقرر ہوتے ہیں اور اس راستے سے عیسائی نمائندہ جیت پاتے ہیں چاہے مسلمان ان کی حمایت کریں یا نہ کریں، لہذا اس حالت میں بہتر صورت یہ ہے کہ ہم کسی ایسے نمائندہ کو منتخب کریں جو مسلمانوں کے لئے بہتر ہو بجائے اس کے کہ اُس کے لوگ کسی ایسے کو منتخب کر دیں جو ہمارا مخالف ہو۔

یوں اس طریقہ کار کے حامی افراد جوں جوں آگے بڑھتے ہیں وہ مزید خود کو حق سے دور کرتے جاتے ہیں۔

اس بدعتی طریقہ استنباط اور اس ذہنیت اور طرز عمل کے افراد سے، جو حق سے بہت دور نکل چکے ہیں، خبردار ہونا چاہئے کہ ان کی ذہنیت اور طرز عمل کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جو کر رہے ہیں اس سے سچی توبہ کرنی لازم ہے، اسلامی دعوت کو ان افراد کی ضرورت تو ہے لیکن اس ذہنیت اور اس طرز عمل کے بغیر، تاکہ وہ اسلام کے حمایتی رہیں نہ کہ حکومتوں کے حمایتی بن جائیں جو کہ اللہ کے نازل کردہ قوانین کے بجائے دوسرے قوانین سے حکومت کرتی ہے۔

نقصان اور نفع کی قطعی و یقینی تعریف صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ بیان کر سکتے ہیں جو تمام کائنات کا خالق اور پروردگار ہے جس نے نفع اور نقصان یعنی خیر و شر کو پیدا فرمایا ہے، اس کے سوا کوئی یہ نہیں جانتا کہ کیا چیز ہمارے لئے نفع لے کر آئے گی اور کیا نقصان کا باعث بنے گی، اور اگر انسان کے لئے یہ ممکن ہوتا تو وہ قانون ساز بن جاتا اور اسے اللہ کی جانب سے کسی دین کی ضرورت نہ ہوتی جو انسانی زندگی کے امور کی تدبیر کرے۔ چنانچہ اگر ایسا ہوتا تو انسان کسی بھی ہدایت کا محتاج نہ رہتا، لیکن انسان محتاج ہے۔ لہذا اسلام مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے رب کی شرع کے تابع اور مطیع ہو کر رہے، شرع جس کام کو کرنے کا مطالبہ کرے وہی منفعت ہے، اسی میں نفع ہے اور شرع جس چیز سے ہمیں روکے وہ مضر ہے اُسی میں نقصان ہے، اس سے پہلے ہم کسی بھی شے کے متعلق نہیں جانتے ہیں کہ وہ سود مند ہے یا مضر ہے، جب تک اس کے متعلق کوئی حکم نازل نہ ہو جائے، اس سے قبل اس کی حقیقت کا پتہ لگانا ہماری بساط سے باہر ہے، ایسا اس لئے کیونکہ انسانی عقل کے پاس وہ معیار نہیں جس کی بنیاد پر وہ خیر اور شر میں تفریق کر سکے اور خوبصورتی اور بد صورتی کا پتہ لگا سکے۔ اسی وجہ سے اس شرعی قاعدہ کی بنیاد پڑی:



(حيثما يكون الشرع تكون المصلحة) ”ہم جہاں کہیں بھی اللہ کا حکم موجود پاتے ہیں وہی فائدہ ہے، نفع ہے“ اس کے برعکس وہ قاعدہ جو یہ بتلاتا ہے کہ: (حيثما تكون المصلحة يكون الشرع) ”جہاں کہیں بھی نفع موجود ہے وہ اللہ کا حکم ہے“ بالکل غلط اصول ہے، یہی وہ بات ہے جس کے متعلق یہ عظیم آیت ہمیں ہدایت دیتی ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ {البقرة: 216} ”تم پر (دشمنوں سے) جنگ کرنا فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم پر گراں ہے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو برا سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو۔ اور (اصل حقیقت تو) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔“

اس بنیاد پر ہم اللہ کے اس فرمان کو سمجھ سکتے ہیں: ﴿وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ﴾ {الاعراف: 157} ”اور ان کے لئے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دے گا۔“

لہذا طیب یا پاک وہ ہے جس کو اللہ نے حلال کیا ہے اور ہم اس کے طیب ہونے کو اس وقت تک نہیں جانتے تھے جب تک اللہ نے اسے حلال نہیں ٹھہرایا تھا۔ اسی طرح خبیث وہ شے ہے جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اور ہم ہرگز نہیں جانتے تھے کہ اس میں کوئی خباثت موجود ہے جب تک اللہ نے اسے ممنوع قرار نہیں دیا تھا۔ اس آیت کے معنی یہ نہیں کہ ہمارے ذہن نشاندہی کریں کہ کیا چیز طیب ہے پھر اسے حلال ٹھہرائیں اور ہمارے ذہن نشاندہی کریں کہ کیا خبیث ہے اور اسے حرام قرار دیں۔

ان افراد کی سمجھ ایسی ہی تھی جب انہوں نے کہا کہ ”دو خیر میں سے بہتر خیر کو اور دو بری چیزوں میں سے بدترین کو ترجیح اور دو مقاصد میں سے کمتر مقصد کو چھوڑ کر عظیم مقصد کا حصول اور دو بڑے خساروں اور نقصان میں سے کمتر نقصان کو اختیار کر کے بڑے سے اپنے آپ کو بچانا ہے۔“ ان کا یہ بیان غلط ہے اور شریعت کے لئے خطرناک ہے۔ یہ ’مصلح مرسلہ‘ کے تصور سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ کیونکہ مصلح مرسلہ پر عمل کرنے کی مجبوری اس وقت پڑتی ہے اور انہیں تب اختیار کی جاتا ہے جب معاملہ کے متعلق کوئی شرعی دلیل نہ پائی جاتی ہو، لیکن ان کے اس قول کے تحت ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے لئے اللہ کے قوانین کے اندر تبدیلی اور اپنی عقلوں کے لئے اُسے منسوخ کرنا جائز کر دیتے ہیں، یہ دین کے لئے نہایت مضر اور بہت خطرناک ہے اور یہی وہ وجہ ہے کہ ان کے خیالات اور ان کی رائے حق سے دور ہو گئے ہیں۔

جو کچھ ہم نے ابھی تک پیش کیا ہے ہم نے دیکھا کہ ان کے اصول ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہیں اور اللہ کے قوانین میں مداخلت پر متفق ہیں، کیونکہ یہ لوگ اپنی عقلوں اور خواہشات کو عقلی اصول کو سامنے رکھ کر غیر شرعی اصول بنانے کی اجازت دیتے ہیں اور عقلی طرز فکر کے ذریعے ان مقاصد تک پہنچنا چاہتے ہیں جو ان کی چاہت ہے نہ کہ شریعت کی۔ اسی لئے ہر معاملہ میں ان کی رہنمائی عقل و دانش کی بنیاد پر قائم ’قیاس‘ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ اس حقیقت کے باوجود کے سب سے زیادہ اہم چیز جسے شارع نے مسلمانوں کے لئے مسترد کر دیا ہے، وہ ہے عقلی بنیاد پر قیاس، کیونکہ اس میں اللہ کی مخالفت ہے اور اللہ کے حکم میں شرکت کرنا ہے، یہ حق سے انحراف اور بے رخی ہے اور یہ فرد کا اپنے توہمات و گمان اور رجحانات کی پیروی کرنا ہے۔ اور ان کی اس بحث کی بنیاد طاغوت کو ثالثی کا اختیار دینا ہے جس کا انکار کرنے کا ہمیں حکم ملا ہوا ہے، کیونکہ طاغوت اللہ کے نازل کردہ احکامات کے بجائے دوسرے قوانین سے ثالثی کروانا ہے۔

بحث کے اختتام میں قیاس عقلی اور قیاس شرعی کے درمیان فرق کا بیان ضروری ہے، تاکہ قیاس عقلی کے فساد کو واضح کیا جائے اور اپنی، امت اور تمام انسانوں کی نجات کے لئے قیاس شرعی کی ناگزیر اہمیت کو جان سکیں۔

یہ مسلمان حکم شرعی میں بھی منفعت کو عقلی طور پر متعین کرنے کے راستے پر آگے بڑھتے رہے اور شرعی حکم کے فائدہ کو متعین کرنے لگے، انہوں نے شرعی حکم سے حاصل ہونے والے فائدہ اور اس پر مرتب ہونے والے نقصان کے درمیان موازنہ کیا، اس کے لئے انہوں نے عقل کو پیمانہ بنایا۔ ان کی نظر میں ”اگر مفاسد زیادہ ہو جائیں تو شرعی حکم کو چھوڑا جائے گا، وہ حکم شرعی جو اس مسئلہ میں اللہ کا حکم ہے اور اس کے متبادل اس عقلی حکم کو اختیار کیا جائے گا جس میں مصالح موجود ہوں۔ اور اگر شرعی حکم میں زیادہ مفاد موجود ہے تو وہ اس پر عمل کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ اللہ نے انہیں اس کا حکم دیا ہے بلکہ اس لئے کہ ان کی عقل اس کے نفع کے متعلق مطمئن ہو گئی ہے، یہ ایک خطرناک راستہ اور خطرہ سے بھرپور طرزِ عمل ہے جس پر خاموشی جائز نہیں، یہ اس لئے کیونکہ اس سے شرع کے اوپر عقل و گمان کو بالادستی حاصل ہوتی ہے اور عقل کو اللہ کے قانون کے لئے معیار اور ثالث بناتا ہے اور شرع پر عقل کو فوقیت دیتا ہے، یہ تو بالکل وہ شے ہے جس کو ہم انسان کے بنائے ہوئے قانون کہتے ہیں۔ یہی ان کے اس عمل کی تشریح ہے کہ وہ ایسی رائے نکال لائے ہیں جو شرعی قوانین کی مخالف ہے، بالخصوص ہمارے اس موضوع کے متعلق۔ اس لئے یہاں اختلاف صرف اس بنیاد پر نہیں کہ اللہ کے نازل کردہ کے علاوہ سے حکومت میں شرکت جائز ہے یا نہیں، بلکہ اختلاف اور اعتراض اس طریقہ فکر سے ہے جس پر چل کر وہ غیر شرعی حکم، عقلی حکم، اللہ کی نازل کردہ آیات کے علاوہ سے حکم اور طاغوت کی حکومت تک پہنچ جاتے ہیں جس کے متعلق انہیں انکار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ سمجھنے کا یہ طریقہ فہم حاصل کرنے کے صحیح طریقہ کی بندش سے آزاد اور اس سے اختلاف کرتا ہے، اس کی حقیقت ہی اس کے جھوٹ سے پردہ ہٹا دیتی ہے، اس پر اعتماد اور انحصار اور اس کے مطابق حکم حاصل کرنا غلط اور باطل ہے، کیونکہ نفع اور نقصان کا حقیقی معنوں میں یقینی علم صرف اللہ کو ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے، ہمیں کس چیز سے نفع ہو گا اور کس طرح ہم نقصان سے بچیں گے یہ علم اللہ کے علاوہ کوئی نہیں رکھتا۔ ایسا اس لئے کہ اگر یہ علم انسان کے پاس ہوتا تو انسان کو قانون ساز مان لیا جاتا۔ لیکن انسان کا ایک ایسے الہامی دین کے محتاج ہونے کی وجہ سے جو انسانوں کے تمام امور کا انتظام کرے، اسلام نے مسلمان پر فرض قرار دیا کہ وہ اپنے رب کی شرع کا پابند اور اطاعت کرنے والا رہے، چنانچہ شرع نے جس کے متعلق عمل کرنے کا حکم دیا ہے وہ ہمارے لئے نفع قرار پایا اور جس کے متعلق باز رہنے کا حکم دیا وہ نقصان دہ قرار پایا۔ ہمیں کچھ بھی پتہ نہیں کہ فلاں شے مصلحہ ہے یا مفسدہ (نقصان)، سوائے یہ کہ اس کے متعلق شرعی حکم نازل ہو چکا ہو۔ اس سے قبل ہم اس کے نفع یا نقصان کو خود اپنے طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ (اس لئے بھی کہ ہم خالق نہیں ہیں لہذا مخلوق کے مختلف پہلوؤں اور تمام امور کے متعلق مکمل علم نہیں رکھتے اور اس لئے بھی کہ ہم مستقبل کے متعلق علم نہیں رکھتے اور اس لیے بھی کہ انسان عام طور پر ہر مسئلہ کا حل اس مسئلہ کی حقیقت کے ساتھ جوڑ کر حاصل کرتا ہے اگر کسی کو دیدہ بینا حاصل ہو تو شاید وہ اس حل کو مزید مسائل کے تناظر میں دیکھ سکے بہر حال وہ تمام مسائل اس کی سوچ اور جذبات، پسند و ناپسند کے تحت محدود ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں جو بھی حل وہ حاصل کرے گا، محدود ہو گا۔ لہذا انسان کے ذریعے ایک مسئلہ کا حل دوسرے تناظر میں بذاتِ خود ایک مسئلہ بن کر بارہا ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔)

جب انسان قانون بناتا ہے تو وہ عقل کی بنیاد پر قیاس (مماثلت) کرتا ہے جس کے لئے درکار ہوتا ہے کہ یکساں معاملات کو یکجا کیا جائے اور ان پر کم و بیش یکساں قسم کا حکم لگایا جائے، اسی طرح

مختلف معاملات کے درمیان تفریق کی جائے اور ان کے لئے مختلف قسم کے احکام وارد کئے جائیں، اس کے برخلاف جب ہم اسلامی شریعت کو دیکھتے ہیں جو اللہ العلیم والبصیر نے تشکیل دی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے یکساں قسم کے معاملات کے لئے مختلف قسم کے احکام اللہ رب العزت نے نازل کئے ہیں اور بہت سے مختلف معاملات کے لئے یکساں احکام نازل فرمائے ہیں، یہ حقیقت عقلی قیاس کے متضاد ہے۔ شریعت نے ایسے قوانین بھی دیئے ہیں جن میں عقل کا کوئی کردار نہیں ہے شرعی قوانین کے متعلق یہ حقیقتیں ان افراد کے ذریعے تشکیل کردہ بدعتی طریقہ استنباط کو مسترد کرنے کے لئے کافی ہیں۔

# حرام کو حلال کا وسیلہ نہیں بنایا جاسکتا

## ( نتیجہ ذرائع کو جائز نہیں بناتا )

کچھ مسلمانوں کے ذہن عقلی قیاس کے راستے پر ڈالے جا چکے ہیں جس کا انحصار شرع میں موجود علامت پر نہیں ہوتا جو اس قیاس کی ضرورت کو ظاہر کرے، یعنی ایک مخصوص شرعی نص میں موجود شرعی علت جس کی تکمیل کیلئے شرعی قیاس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے مطابق عقلی قیاس اُس کی شرعی علت کو ظاہر کرنے والی مخصوص شرعی نص پر توجہ دیئے بغیر عقل اس کو مجموعی طور پر شرع سے اخذ کرتی ہے۔ یا عقلی قیاس ایک حکم کے دوسرے حکم پر قیاس کرنے سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے، صرف اس بنا پر کہ عقلاً ان کے درمیان مماثلت موجود ہے، جبکہ اس حکم کا کوئی ایسا باعث بھی موجود نہیں ہوتا جو شرع میں موجود ہو۔ یا عقل اس کو اس طرح سمجھ لیتی ہے کہ مفاد کو شرعی حکم اور اس پر قیاس کئے جانے والے دیگر احکام میں عقلی ترجیح قائم کی جائے۔

کسی بھی حال میں ان میں سے کوئی بھی جائز نہیں ہے، ان کے مطابق پوری شرع نے مجموعی طور پر حفاظتِ دین، حفاظتِ جان، حفاظتِ عقل، حفاظتِ نسل اور حفاظتِ مال سے متعلق بتایا ہے، ان کے نظریہ کے تحت جو بھی چیز یا عمل ان پانچوں مقاصد کی حفاظت کا باعث ہو وہ شرعی لحاظ سے مطلوب ہیں، چاہے اس کی فرضیت کے لئے شرع میں کوئی بیان موجود ہو یا نہ ہو حتیٰ کہ اس کو ظاہر کرنے کے لئے شرع میں کوئی علت موجود ہو یا غیر موجود ہو۔ ایسا وہ صرف دو معاملات کے درمیان موجود

مماثلت کی بنا پر کرتے ہیں، مزید انہوں نے یہ خیال کیا کہ شرع نے مسلمان کے لئے بحالت مجبوری حرام غذا کھانے، یا شراب پینے کو جائز کیا ہے، چنانچہ مسلمان جو مجبور ہو چکا ہو کہ وہ سود کا معاملہ کرے تو ایسا کرنے میں کوئی برائی نہیں، کیونکہ ان کے درمیان مماثلت ہے۔ لہذا یہ مجبوری کے حالات کے تحت جائز ہو جاتا ہے۔

حکم کو سمجھنے کا یہ طریقہ اس کے صحیح طریقہ کی بندش سے آزاد اور اس سے مختلف ہے۔ اس کی حقیقت اس کے باطل پن سے پردہ ہٹا دیتی ہے اور قطعی موزوں نہیں کہ اس پر اعتماد اور انحصار کیا جائے کیونکہ یہ عقلی قیاس اس کا تقاضا کرتا ہے کہ مماثل معاملات کو ایک ساتھ جوڑا جائے اور مختلف معاملات کے درمیان تفریق کی جائے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شرع نے کئی یکساں معاملات میں تفریق کی ہے اور کئی مختلف قسم کے معاملات کو ایک ساتھ جوڑا ہے اور اس کے علاوہ ایسے احکام دیئے ہیں جس میں عقل کا کوئی کردار نہیں ہے یعنی عقل ان کو سمجھنے سے قاصر ہے، یہ حقیقت کافی ہے جو اس طریقہ کا ابطال کرتی ہے۔

### یکساں امور کے درمیان فرق:

یکساں معاملات کے درمیان امتیاز دیکھیں، شرع نے اوقات کے درمیان تفریق کی ہے جو مسلمانوں کو رتبہ میں یکساں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ شرع نے لیلة القدر کو رتبہ میں دوسری تمام راتوں پر فضیلت دی ہے۔ اسی طرح شرع نے مقامات کے درمیان رتبہ میں امتیاز کیا ہے مثلاً مکہ کی مدینہ پر فضیلت رکھی جبکہ مدینہ کو دوسرے تمام مقامات پر فضیلت دی ہے۔ شرع نے نمازوں کے درمیان قصر میں فرق کیا ہے، چار رکعتوں والی نمازوں میں قصر جائز جبکہ دو اور تین رکعتوں والی نمازوں کے قصر میں

کوئی رخصت نہیں دی گئی ہے، شرع نے منی اور مذی کے درمیان امتیاز کیا ہے حالانکہ دونوں کا اخراج ایک ہی جگہ سے ہوتا ہے۔ اُس نے منی کو پاک اور مذی کو ناپاک قرار دیا ہے اور منی کے اخراج کی صورت میں غسل کو واجب قرار دیا ہے اور منی کا دانستہ غیر فطری اخراج روزہ کو فاسد کر دیتا ہے لیکن مذی کے اخراج پر کوئی مضائقہ نہیں ہے، شرع نے بچگی کے پیشاب کا کپڑوں پر لگنے کی صورت میں اس کو دھونے کا حکم دیا ہے جبکہ بچہ کا پیشاب کپڑے پر لگنے کی صورت میں اس پر پانی کے چھینٹے ڈالنا کافی قرار دیا ہے، شرع نے ماہواری والی حائضہ عورت کو روزہ کی تلائی کا حکم دیا ہے لیکن نمازوں کی تلائی سے چھوٹ دی ہے، شرع نے تین درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، لیکن جس نے دھوکہ دہی کے ذریعہ دولت پر قبضہ کیا اس پر یہ سزا مقرر نہیں کی ہے، شرع نے طلاق شدہ عورت کے لئے عدت کا وقفہ تین ماہ واریاں مقرر کیا ہے جبکہ بیوہ کے لئے عدت کا وقفہ چار ماہ اور دس دن مقرر کیا ہے حالانکہ رحم کی صورت دونوں میں برابر ہے۔ اس طرح ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایسے کئی معاملات ہیں جو مشابہ ہیں اور ان کے درمیان جامع امر بھی موجود ہوتا ہے۔ یعنی اگر ان معاملات کے فیصلوں کو عقل کے سپرد کر دیا جاتا تو عقل لازماً غلط فیصلہ پر پہنچتی اور ایسے فیصلے کرتی جو شرع کے حکم سے متضاد ہوتے۔ شرع نے ان میں سے ہر ایک کے لئے مختلف فیصلے کئے ہیں جو عقل کی بنیاد پر قیاس کے غلط اور بدعتی طریقہ کے کھوٹے پن کو ظاہر کرتے ہیں۔

### مختلف قسم کے معاملات کو یکجا کرنا:

شرع کا مختلف معاملات کے متعلق یکساں رویہ دیکھیں تو شرع نے مختلف معاملات کے لئے یکساں حکم دیئے ہوئے ہیں حالانکہ عقلی قیاس کے تحت اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا، مثلاً شرع نے



طہارت کے لئے پانی اور مٹی کو اکٹھا کر دیا، جبکہ عقل کے نزدیک پانی صفائی فراہم کرتا ہے لیکن دھول گندہ کرتی ہے، شرع نے سونے اور گندم پر زیادہ نفع کو حرام کر دیا، حالانکہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں، شرع نے مرتد اور زانی (شادی شدہ) کے لئے یکساں سزا یعنی موت تجویز کر رکھی ہے جبکہ دونوں گناہوں کی نوعیت بالکل مختلف ہے، شرع نے مسلمان اور ذمی دونوں کی حفاظت لازمی کر رکھی ہے، حالانکہ دونوں دین کے اعتبار سے مختلف ہیں، شرع نے کسی عورت پر زنا کا جھوٹا بہتان لگانے پر اور شراب نوشی پر 80 کوڑے کی سزا مقرر کر رکھی ہے جبکہ دونوں فعلوں کی حقیقتیں الگ الگ ہیں۔

اس طرح ایسے کئی احکام ہیں جن کی حقیقتیں بالکل مختلف ہیں اور انہیں کسی بھی طرح یکساں شمار نہیں کیا جاسکتا، مگر شرع نے انہیں یکساں شمار کرتے ہوئے ان کے لئے ایک ہی حکم دیا ہوا ہے، اگر یہ معاملات قیاس کے لئے عقل کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے تو عقل مختلف احکام دے دیتی اور ان کی حقیقتوں کے فرق کے بموجب کبھی بھی انہیں ایک ہی حکم کے تحت جمع نہ کرتی، یہ حقیقت بھی قیاس کے اس عقلی طریقہ کو فاسد و باطل ظاہر کرتی ہے۔

مزید شرع نے ایسے قوانین دیئے ہیں جس میں عقل کوئی کردار اور دخل نہیں رکھتی ہے، مثلاً شرع نے تجارت حلال کر دی ہے لیکن سود کو حرام قرار دیا ہے، حالانکہ غور کریں تو دونوں ہی تجارت ہیں اور مماثل ہیں، اس نے زنا کے لئے چار گواہ مقرر کئے ہیں لیکن قتل کے معاملہ میں دو گواہ مقرر کئے ہیں حالانکہ قتل زنا سے زیادہ گھناؤنا عمل ہے۔ خلع کے متعلق گواہ لازمی طور پر مسلمان ہونا ضروری ہے جبکہ میراث کے متعلق کافر کی گواہی بھی جائز ہے۔ شرع نے حیا کو لازم کیا ہے یعنی آزاد عورت جو قبیح صورت ہو اس کے بالوں اور جلد کے متعلق نظر کا جھکایا جانا لازم ہے حالانکہ اس کی جانب چاہے طبیعت مائل نہیں ہوتی ہو لیکن شرع نے خوبصورت لونڈی سے نظر کا جھکایا جانا لازم قرار نہیں دیا، حالانکہ اس

کی جانب طبیعت مائل ہو سکتی ہے۔ اس نے خفین (چمڑے کے موزوں) کے نچلے حصہ کی بجائے اوپر سے مسح کو لازم قرار دیا جبکہ نچلے حصہ کو صاف کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے، اس عمل کے متعلق سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ 'اگر دین کی بنیاد عقلی قیاس پر ہوتی تو پھر موزوں کے نچلے حصہ پر مسح کرنا زیادہ موزوں ہوتا بجائے کہ اوپری حصہ پر مسح کیا جائے'۔

اسی بات نے ابو العلاء المعری جیسے معروف شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ:

يَدْ بِخَمْسٍ مِئِينَ عَسَجِدٍ وَدَيْتٍ مَا بِأَلْهَا قُطِعَتْ فِي رِبْعٍ دِينَارٍ

ایک ہاتھ جس کی دیت پانچ سو سونے کے دینار ہے پھر ایک دینار کے چوتھے حصے کے لئے کیوں کاٹا جائے؟

دوسرے الفاظ میں اگر کوئی بازو ضائع کیا جائے تو اس کا خون بہا 500 دینار ہوتا ہے تو پھر اسے ایک دینار کے چوتھائی حصہ کی چوری پر کیسے کاٹا جاسکتا ہے؟ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ ہاتھ کو دینار کے چوتھائی حصہ کی خاطر کاٹ دیا جائے۔ شاعر معری عقل کے اس فیصلے سے شرع کے فیصلہ کا مذاق اڑاتا ہے، اور اگر عقل کو اختیار دے دیا جائے کہ وہ مجموعی شرع سے علت کو طے کرے یا نص کے ظاہری الفاظ سے علت کو اخذ کر لے، یا دو احکامات یکساں معلوم ہوں تو ان کے درمیان قیاس کیا جائے، اس صورت میں عقل ایسے بہت زیادہ احکامات کو حرام قرار دیتی جسے اللہ نے حلال کیا ہے اور جسے اللہ نے حرام کیا ہے اسے حلال ٹھہرا دیتی۔ چنانچہ قیاس اسی صورت میں جائز ہے جب اسے قیاس کے شرعی طریقہ کے مطابق انجام دیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں جائز شرعی قیاس تب تک انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک اس کی شرعی علت موجود نہ ہو اور جسے شرعی نصوص میں بیان نہ کر دیا گیا ہو، اور ایسی نص میں بھی قیاس نہیں کیا جائے گا جس کے اندر کوئی شرعی علت موجود نہ ہو، نہ ہی اس کے لئے عقل

سے کوئی علت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی شرعی علت فرض کی جاسکتی ہے، جب تک کہ نص میں اس کا ذکر یا تعین وارد نہ ہو جائے۔ لہذا فقہاء نے نصوص سے شرعی علت معلوم کرنے کے طریقوں کو متعین کیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ ”شرعی علت پر یا نص صراحتاً دلالت کرتی ہوگی یا پھر دلائل یا استنباطاً یا قیاساً (اس کی مزید وضاحت کے لئے اُصول الفقہ کی کتب کا مطالعہ کریں)۔

جب نبی کریم ﷺ نے قیاس کے استعمال کو منظور کیا تو آپ ﷺ نے اس کی نوعیت کی بھی وضاحت کر دی، احمد اور نسائی عبد اللہ ابن الزبیرؓ سے روایت کرتے ہیں: ((جاء رجل من خثعم إلى رسول الله ﷺ فقال: إن أبي أدرکه الإسلام وهو شيخ كبير لا يستطيع ركوب الرحل، والحج مكتوب عليه. أفأحج عنه؟ قال: أنت أكبر ولده؟ قال: نعم. قال: رأيت لو كان علي أبیک دين فقضيته عنه أكان يجزي ذلك عنه؟ قال: فاحجج عنه)) "قبیلہ خثعم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور کہا: میرے والد نے اسلام کا زمانہ پالیا تھا، جبکہ وہ بہت بزرگ تھے اور حج بھی اس کے اوپر فرض ہو چکا تھا، زیادہ بوڑھا ہونے کی وجہ سے اس کے لئے سواری پر بیٹھنا مشکل تھا، تو کیا میں اس کی طرف سے حج کر سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: آپ اس کے بڑے بیٹے ہو، اس نے کہا: ہاں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آپ بتائیں کہ اگر تیرے والد پر کوئی قرض ہوتا اور آپ اس کی طرف سے دے دیتے تو کیا یہ اس کی طرف سے ادا ہو جاتا، تو اس آدمی نے جواب دیا بالکل! پھر آپ ﷺ نے کہا: پھر اس کی طرف سے حج کرو۔"

حج ایک عبادت ہے اور قرض کی ادائیگی معاملات میں سے ہے اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ البتہ حج ادا کرنا قرض ادا کرنے کے مشابہ ہے ان معنوں میں کہ دونوں قرض ہے جس کی

ادائیگی ضروری ہے۔ چنانچہ بیٹے کو باپ کے عوض حج ادا کرنے کو جائز کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ یہ بھی قرض کی ادائیگی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے قرض (حج کی ادائیگی) کو انسانوں کے قرض کے ساتھ جوڑ دیا ہے، کہ دونوں کا ادا کرنا فرض ہے اور دونوں کا فائدہ بھی ہے۔ اگر نبی کریم ﷺ نے اس کا حکم نہ دیا ہوتا تو ہمارے ذہن شرع کے اس فیصلہ تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔

احکام کی پشت پر تعلیل (علت کا بیان) اُس شے کی وضاحت پر دلیل ہوتی ہے جس کی وجہ سے شرع نے حکم دے دیا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی علت پائی جائے اس کی پیروی کرنی ضروری ہے اور یہی قیاس ہے۔ مثلاً جب نبی کریم ﷺ نے بلی کے متعلق فرمایا کہ: **((انہا لیست بنجس))** "وہ نجس (ناپاک) نہیں ہے"۔ یعنی اس کا جھوٹا اور لعاب، یہ ناپاک کیوں نہیں آپ ﷺ نے اس کے لئے علت کو یوں بیان کیا ہے: **((انہا من الطوافین علیکم والطوافات))** "کیونکہ یہ ان جانوروں میں سے ہے جو تمہارے گھروں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں (یعنی پالتو)۔ (بخاری و مسلم) اس لئے دوسرے مختلف جانور جو آس پاس گھومنے پھرنے والے جانوروں میں سے ہوں وہ بھی ناپاک نہیں ہیں، جب تک ان کے ناپاک ہونے کی کوئی خاص دلیل نہ پائی جائے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ: **((انما جعل الاستئذان من أجل النظر))** (البخاری و مسلم) "اجازت صرف اس لئے طلب کی جاتی ہے تاکہ نظر نہ پڑے"۔

اس کے معنی ہیں کہ مسلمان پر لازم ہے کہ گھروں میں داخلے سے قبل اجازت حاصل کر لیا کرے کیونکہ گھر کا اپنا تقدس ہے اور گھر بھی عورت میں شمار ہوتا ہے۔ اجازت طلب کرنے کے حکم کی علت ممنوعہ جگہ پر نگاہ ڈالنے سے روکنا ہے۔ جملے میں آپ ﷺ کے خصوصی الفاظ ”(من اجل النظر)“ یعنی (نگاہ کی وجہ سے) حکم کی شرعی علت کو واضح کر رہے ہیں، یعنی اجازت طلب کرنے کی

قانون سازی کا باعث۔ اس بنا پر ایک مسلمان پر اپنے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت فرض نہیں ہے، کیونکہ اُس کے لئے علت موجود نہیں ہے لہذا حکم بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر گھر میں مہمان وغیرہ موجود ہوں، تو اجازت لے کر جائے گا۔ چنانچہ جب علت موجود ہوتی ہے تو حکم بھی موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکم کے ساتھ اسکی علت، موجودگی اور غیر موجودگی کی بنیاد پر جڑی ہوئی ہے۔

چنانچہ قیاس نہایت نازک معاملات میں سے ایک ہے۔ یہ بات جان لیں کہ قیاس کرنا ایسے ذہین و فطین اور باشعور عالم کا کام ہے جو نصوص، حکم، اور واقعات کے متعلق صحیح بصیرت رکھتا ہے۔ ہر ایک کا یہ کام نہیں کہ اپنی خواہشات کے مطابق قیاس کرے، یہ صرف انہی لوگوں تک محدود ہونا ضروری ہے جنہیں اللہ نے بصیرت، فہم اور دین کی دولت سے نوازا ہے ورنہ یہ تباہی اور اسلام کے حقیقی حکم سے انحراف کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے گا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ”یہ کسی کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ قیاس کرے جب تک سنن کے متعلق مکمل علم نہ رکھتا ہو، سلف کے اقوال سے واقفیت نہ رکھتا ہو اور عربی زبان پر اسے دسترس حاصل نہ ہو۔ اس کی عقل ٹھیک ہو کہ وہ یکساں معاملات (مشتبہات) میں امتیاز کرنے کی اہلیت رکھتا ہو اور فیصلہ کرنے کے متعلق جلد بازی نہ کرتا ہو، جو اس سے اختلاف کرنے والوں کی بات سننے اور قبول کرنے میں بھی مزاحمت نہ کرتا ہو، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اختلاف کرنے والے کسی ایسی بات پر متوجہ کریں جس سے وہ غافل رہا ہے، یا ایسی غلطی کی نشاندہی کریں جس کو وہ صحیح سمجھتا ہو۔“ اس لئے قیاس کے استعمال میں باریک بینی درکار ہوتی ہے، اور حکم کے استنباط کے لئے قیاس کا استعمال مجتہد کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

اس سے قبل ہم نے جو کچھ بیان کیا ہم نے صرف ان لوگوں کے دلائل کے حوالے پیش کئے جو کفر یہ اقتدار میں شرکت کو جائز قرار دیتے ہیں اور ان کی تردید پیش کی ہے۔ ہم نے یہ بھی بیان کیا کہ

یہ دلائل اس موضوع کے متعلق دلائل کا درجہ اور شرعی ثبوت کی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ لہذا اب آگے یہ سمجھیں گے کہ اس میں اسلام کی قطعی رائے کیا ہے؟ جس میں اجتہاد یا اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔

شرع اپنے عقیدہ کے حوالے سے ایک اللہ پر ایمان پر قائم ہوتا ہے، اور یہ کہ تمام عبادات صرف اس کے لئے ہونی چاہئیں۔ اور (لا الہ) کو ماننے کا معنی ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی غیر کے متعلق معبود ہونے اور شارع ہونے کی نفی کرنا۔ اور (الا اللہ) کا معنی مذکورہ امور کا صرف اللہ کے لئے اقرار کرنا۔ کہ وہی الہ برحق ہے، وہی عبادت کا مستحق ہے اور صرف وہی اپنے بندوں کے لئے قانون بنا سکتا ہے۔ اللہ کی عبادت، اس کے سامنے عاجزی و انکساری کا اظہار اور اس کی شرع کی معرفت نبی کریم ﷺ کے ذریعے حاصل کی جائے گی۔ یہ حقیقت شہادتین (دو شہادتوں) کے دوسرے حصہ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کے معنی ہیں۔ چنانچہ شرع کو لینا اور پیروی صرف رسول اکرم ﷺ کی ہی کی جائے گی۔

یہاں تک کہ اصول فقہ کا کام بھی وحی کے ذرائع متعین کرنا ہے، تاکہ قانون اختیار کرنے میں ان ذرائع کے علاوہ کسی دوسرے ذریعہ کو استعمال نہ کیا جائے اور اصول فقہ استنباط کے اصولوں کو باضابطہ بناتا ہے تاکہ کوئی بھی چیز جو شرع سے نہ ہو شرع میں داخل نہ ہو سکے۔ لہذا اسی لئے پہلی بحث اصول فقہ یہ انجام دیتی ہے کہ اللہ سبحانہ ہی حاکم ہے، تمام فیصلوں کا وہ تہما مالک ہے اور یہ کہ شرع کے نزول سے قبل اور نہ ہی شرع کے علاوہ سے کوئی حکم دیا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد صرف اللہ کی عبادت کی عملی تعبیر کے لئے فقہ کا نمبر آتا ہے، اللہ کی مکمل اطاعت و فرمانبرداری سے کیا مراد ہے؟ اللہ کے علاوہ کسی غیر کے کسی بھی حکم سے انکار اور فیصلوں کے لئے اللہ کی قائم کردہ حدود کا لحاظ کرنا ان تمام کو فقہ بیان کرتی ہے۔

کفریہ نظاموں میں شرکت کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ جو شخص اس کی دعوت دیتا ہے وہ انسانوں کی قانون ساز حیثیت کے لئے اللہ کی تشریعی حیثیت میں شرکت کو قبول کرتا ہے، چنانچہ وہ شرع کی قانون سازی کے علاوہ غیر شرعی حکومت کی قانون ساز حیثیت کو تسلیم کر لیتا ہے، اس کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ حکم کو حاصل کرنے کے اب مختلف ذرائع بھی تسلیم کئے جائیں گے لہذا پھر معبود کی وحدانیت کہاں باقی رہتی ہے جو لازم کرتی ہے کہ کھلی اور ڈھکی تمام عبادات صرف اللہ واحد کے لئے ہی ہیں؟

اللہ کے ساتھ شرک کرنے کی ممانعت کا تقاضا ہے کہ اس کے فیصلے میں بھی کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ لہذا شرع کلی طور پر جاہلی نظام میں شرکت کو ممنوع قرار دیتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت کسی شک و شبہ کے بغیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپ ﷺ کی دعوت کا طرز عمل بنیادی تبدیلی کا تھا جو زمانہ کے حالات، رسوم و رواج و قبائلی طور طریقے ہر ایک اثر سے آزاد ہو، زمانہ کو ایک نئے رخ پر ڈالنے کا کام تھا۔ ایسا کام جو حقیقت پر اثر انداز ہو سکے وہی عمل اصل تبدیلی کا باعث بن سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت میں کبھی بھی کفار مکہ کے اندر شریک نہ ماحول کا لحاظ نہیں کیا، انہوں نے ان کے رسوم و رواج اور طور طریقوں کو خاطر میں نہیں لایا اور نہ ہی آپ ﷺ نے لوگوں کا انہیں قبول کرنے یا انکار کرنے کی پرواہ کی۔ نہ ہی انہوں نے مکہ کے اقتدار کی کوئی خوشامد کی۔ حالانکہ خود نبی ﷺ اور آپ ﷺ کی دعوت وہاں نازک حالات میں تھی۔ آپ ﷺ نے سرعام اعلان کر دیا ”کوئی الہ انہیں اللہ کے سوا اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں“ جو اپنے اصل میں کل اسلام ہے، یعنی پورا اسلام اس جملہ میں سمایا ہوا ہے اور یہ اسلام کے عقیدہ کے علاوہ ہر ایک عقیدہ کا انکار ہے۔ اسلام کی شرع کے علاوہ ہر ایک شرع (قوانین) کا انکار ہے۔ یہ انکار وہ بنیادی وجہ تھی جس کی بنا پر ابو جہل نے اسلامی عقیدہ کو مسترد کیا اور مکہ کے دوسرے سرداروں نے اس

کا انکار کیا، اسی اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک کالے اور سفید کے سامنے علی الاعلان کلمہ حق کی گواہی دی، کمزور و طاقتور کے سامنے، غلام و آزاد کے سامنے، امیر و غریب کے سامنے، عرب و غیر عرب کے سامنے، بتوں کی پوجا کرنے والوں اور اہل کتاب کے سامنے، غرض رب کے اس پیغام کو ہر ایک حقیقت کے بالمقابل لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ آپ ﷺ اُن کے مقابل آئے اور ان کی مخالفت کی اور ان کے دیوی دیوتاؤں کے نام لے کر انہیں لٹکارا۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے آپ ﷺ کے خلاف عداوت و دشمنی اختیار کی، پھر سودے بازی کرنے کی کوشش کی اور مطالبہ کیا کہ آپ ﷺ ان کے متعلق خاموش ہو جائیں تو وہ آپ ﷺ کے متعلق خاموشی اختیار کر لیں گے۔ ان کی خواہش تھی کہ نبی کریم ﷺ سمجھوتہ کر لیں تو وہ بھی سمجھوتہ کر لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کو قبول نہیں کیا، بلکہ صبر اختیار کیا جب وہ آپ ﷺ کی دعوت کو اذیت پہنچاتے یا آپ ﷺ کے اصحاب پر ظلم کے پہاڑ توڑتے، مومنین ان تمام اذیتوں اور مصائب کو صبر کے ساتھ سہتے۔ ان تمام افراد کا پائیدار صبر اُن کی دعوت اور انکی اس صدا کی سچائی کی علامتوں میں سے ایک علامت تھی۔ وہ صبر پر ثابت قدم رہے حتیٰ کہ آپ ﷺ جب بنو صعصعہ کے پاس گئے، دین کی دعوت پیش کی اور دین کی خاطر مدد طلب کی اور پھر آپ ﷺ نے نصرت کے عوض بنو صعصعہ کی پیش کردہ شرط کو ٹھکرا دیا، حالانکہ وہ اسلامی دعوت کے سخت ترین دور سے گزر رہے تھے اور آپ ﷺ کا کوئی بھی یار و مددگار نہ تھا۔ بنو صعصعہ ایک شرط پر آپ ﷺ کی مدد و نصرت کے لئے تیار تھے کہ آپ ﷺ کے بعد اقتدار بنو صعصعہ کے حصہ میں آئے گا۔ اس واقعہ پر آپ ﷺ کے الفاظ قابل غور ہیں آپ ﷺ نے یہ نہیں کیا کہ ایک موقعہ آپ ﷺ کے ہاتھ آیا تھا اور جس سے وہ نفع (مفاد) حاصل کر سکتے تھے، جبکہ ہر طرف سے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ بلکہ آپ ﷺ نے اُن سے اور ان



کے بعد ہم سے معلم، داعی اور اسوہ حسنہ کی حیثیت میں یہ فرمایا کہ: ((الأمر لله يضعه حيث يشاء)) "امر (حکومت) اللہ کا ہی ہے، وہ جہاں وہ چاہے رکھے۔"

اس سے آپ ﷺ کی مراد تھی کہ حکومت صرف اللہ ہی کا حق ہے اور کوئی دوسرا اس میں اللہ کا شریک نہیں ہو سکتا اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنی جانب سے اسے یہ اقتدار عطا فرماتا ہے اور کسی کو اس معاملہ میں کچھ کہنے (شرط) کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ بغیر کسی طاقت اور امید کے صرف اس فکر و نظریہ کی طاقت اور اللہ کی مدد پر اعتماد کرتے ہوئے دعوت میں مشغول ہو گئے۔ بالآخر دعوت مدینہ میں دارالاسلام کے قیام کے ساتھ اپنی منزل پر پہنچ گئی جب اللہ نے ان لوگوں کے دلوں اور شعور کو کھول دیا جنہوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو نصرت دی اور آپ ﷺ کی مدد کے لئے تیار ہوئے، چنانچہ نصرت صرف اللہ کے اختیار میں ہے اور وہ اسے ان لوگوں کو عطا کرتا ہے جو صرف اس پر توکل کرتے ہیں اور اسی سے مدد و نصرت طلب کرتے ہیں اور فکر و نظریہ کو اخلاص و پختہ فہمی کے ساتھ ساتھ پختگی اور استقامت کے ساتھ قائم رکھتے ہیں اور جو راہ حق اختیار کرنے کے علاوہ اُس پر عمل کی دُرستی کے ساتھ جمے ہوئے رہتے ہیں۔

چنانچہ اللہ کے نازل کردہ احکامات کے علاوہ حکومت میں شرکت کے متعلق اب اس گفتگو کے اختتام میں ہم موجودہ نظاموں میں شرکت کی حقیقت کو واضح کریں گے اور اس میں داخلہ اور شرکت کس طرح کی جاتی ہے اس پر گفتگو کریں گے اس کے بعد ہم ان آیات اور احادیث کا ذکر کریں گے جو اس راستہ کو ممنوع قرار دیتی ہیں اور اس کے لئے تمام غیر معقول وضاحتوں اور جوازوں اور اعذار کے سلسلوں پر روک لگا دیتی ہیں، کیونکہ یہ آیات اپنے معنی میں قطعی ہیں۔

ریاست چاہے اسلامی ہو یا جمہوری بنیاد پر قائم ہوئی ہو کسی بھی ریاست کا آئین کسی مخصوص فکری نظریہ کی بنیاد پر قائم ہونا لازمی ہوتا ہے۔ یہ اساس جمہوری بھی ہو سکتی ہے اور اسلامی بھی۔ اس طرح کہ اس میں کوئی حکم ایسا نہ ہو جو اس نظام کی بنیادی فکر سے ہم آہنگ اور اس کے عقیدہ سے نہ نکلا ہوا ہو۔

چنانچہ جمہوری نظام میں حکومت کا اس کی بنیاد کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہوتا ہے اور جمہوری نظام کی بنیاد ہے کہ خود مختاری اور بادشاہی عوام کے لئے ہے، یعنی عوام ہوتے ہیں جو قانون ساز اسمبلی کے ذریعے قوانین بناتے ہیں جس کو وہ اس مقصد کے لئے منتخب کرتے ہیں اور اسے پارلیمنٹ کہا جاتا ہے اور انتظامیہ قانون ساز تھارٹی کے منظور کئے گئے قوانین کو نافذ کرتی ہے۔ عوامی فیصلوں پر کاربند ہونے کی حفاظت کے واسطے پارلیمنٹ کو اختیار دیا گیا کہ وہ حکومت کو اعتماد کا ووٹ دے سکتی ہے، اس طرح کہ وہ قانونی طور پر حکومت تب تک نہیں بن سکتی جب تک اسے اعتماد کے ووٹ کے تحت پارلیمنٹ کی توثیق حاصل نہ ہوئی ہو۔ پارلیمنٹ کو حکومت کی کارکردگی پر نگرانی، جواب طلبی اور احتساب کا اختیار دیا گیا ہے چنانچہ اسے یہ بھی اختیار حاصل ہے کہ وہ تمام حکومت یا کسی مخصوص وزیر سے اعتماد واپس لے سکتی ہے، اگر وہ خلاف ورزی کرے یا دستور کے قوانین کی پابندی نہ کرے۔

لہذا حکومت کے ذریعے انجام پانے والے تمام افعال کی بنیاد جمہوریت ہوتی ہے نہ کہ اسلام، جیسا کہ ہم نے پچھلی گفتگو میں بیان کیا ہے کہ اسلام کسی بھی ایسے فعل کو تسلیم نہیں کرتا جو الہامی بنیاد یعنی روحانی بنیاد پر قائم نہ ہو ہوا اور یہ بنیاد اللہ پر ایمان رکھنے کی بنیاد ہے۔

ہر نظام کا اپنا ایک بنیادی ڈھانچہ ہوتا ہے جس طرح اس کی ایک واحد بنیاد اور پالیسی ہوتی ہے جس کو وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں اور وہ تمام وزارتوں کے ساتھ مل کر اسے قائم کرنا چاہتے ہیں، ہر ایک

وزارت کی پالیسی کا تمام وزارتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ضروری ہوتا ہے ان پالیسیوں کو بنانے کا کام پوری حکومت مل کر کرتی ہے۔ ایک اکیلے مسلمان وزیر کی آواز کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہوگی کہ وہ بھی ان تمام آوازوں کے جملگٹھے میں ایک آواز ہوگی جو صدر کے ساتھ مل کر آئین کی ہدایات کی روشنی میں اور جمہوری بنیادوں کے مطابق پالیسی مرتب کرتا ہے، یہ اس امر کے قانونی پہلو کی وضاحت ہے۔ البتہ اس کے عملی نفاذ میں ایک زبردست فرق پایا جاتا ہے اس طرح کہ کابینہ کے وزیروں کے انتخاب سے پہلے ہی ملک کا لیڈر اور اس کی ٹیم حکومت کی پالیسیاں بنا چکی ہوتی ہیں، وزیر کو کوئی موقع اور مرضی میسر نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ بنائی ہوئی پالیسیوں کی بنیاد پر کابینہ میں شامل ہو جائے یا پھر انکار کر دے، اس کو اختیار اور حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنی وزارت کی ایک علیحدہ پالیسی بنالے۔

مزید برآں وزیروں کی ذمہ داریاں اجتماعی نوعیت کی ہوتی ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر حکومت چاہے کہ طے شدہ پالیسی پر عمل درآمد کیا جائے اور ضروری قراردادیں حاصل کی جائیں تو ان قراردادوں میں جمہور کی رائے تسلیم کر لی جاتی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر وزیر دوسرے کے معاملات میں مداخلت کرتا ہے اور حکومتی قراردادوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے، اس بنا پر ایک مسلمان وزیر کو اس کی اپنی اور دوسری وزارتوں سے متعلق اور ان سے صادر ہونے والے تمام ہدایات کے بارے میں ذمہ دار بنادیتا ہے، ایسی صورت میں اس کی ذمہ داری بن جاتی ہے کہ وہ پارلیمنٹ سے باہر اور عوام کے سامنے حکومت کے فیصلہ کا دفاع کرے چاہے کابینہ کے اندر وہ اس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کرے، یہاں پر آکر یہ سوچنا کہ مسلمان وزیر اسلام کے مخالف پیش کئے جانے والی ہر رائے کا مقابلہ کرنے والے کا کردار ادا کرے گا، اس قسم کے خیالات بھولے پن یا کم ظرفی کی نشانی ہے۔ کیونکہ وزیر ممبر پارلیمنٹ سے مختلف ہوتا ہے، لہذا قانونی حیثیت سے ممبر پارلیمنٹ ان افراد کی نمائندگی کرتا ہے جنہوں نے اسے منتخب کر دیا ہے لیکن نفاذ کی حیثیت میں یا عملی طور پر وہ ان کی نمائندگی نہیں کرتا۔

چنانچہ وہ جمہوری نظام میں مسلم افراد کا نمائندہ ہو سکتا ہے یا سرمایہ دارانہ جمہوری نظام میں وہ سوشلسٹ یا بائیں بازو کا نمائندہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بحیثیت وزیر وہ صرف حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے جس کو کابینہ میں اس لئے شامل نہیں کیا جاتا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرتا رہے، ورنہ وہ شخص اپنے اختلافات کی بنیاد پر حکومت سے باہر حزب اختلاف یعنی اپوزیشن میں ہی پڑا رہ جائے گا، لہذا وزیر کو اختیار نہیں ہوتا کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے۔ چنانچہ جمہوری نظام میں جو حکومت یا کسی قانون یا بل سے اختلاف کرے، تو اس کی جگہ باہر ہوتی ہے اور اس کو اندر داخل نہیں ہونے دیا جاتا ہے، اگر کسی غلطی یا غلط فہمی کی بنا پر وہ داخل بھی ہو جائے تو اسے زبردستی نکال باہر کیا جاتا ہے، حکومت فیصلے کرنے اور ان کو نافذ کرنے کے لئے آتی اور قائم ہوتی ہے، اس کے پاس ایک پالیسی موجود ہوتی ہے جس کو وہ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ حکومت اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ مختلف تضادات کو اکٹھا کر لے اور جس کسی کو بھی اس کی پالیسی سے اختلاف ہو گا وہ وزیر اعظم کی دعوت پر اس مخالفت کو ترک کرے گا یا تمام وزیروں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے اختلافات کو ختم کرے گا، ممبران پارلیمنٹ ذاتی طور پر اس شخص پر سے اپنا اعتماد اٹھالیں گے اور حکومت اس کی شرکت کے بغیر اپنی کارگردگی انجام دیتی رہے گی۔

اس حقیقت کی بنیاد پر یہاں پر یہ بتانا لازمی ہو گا کہ مسلم وزیر کا حکومت میں شامل ہونا ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس نے ملک میں موجود دستور و قوانین کو قبول کر لیا ہے اور ساتھ ہی نظام جن بنیادوں پر استوار ہوا ہے اس پر بھی یقین رکھتا ہے، ہم یہاں جس حزب اختلاف کا ذکر کر رہے ہیں، اس کا اختلاف اصل نظام کے حوالے سے نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کا اختلاف نظام کے اندر سے ہی ہوتا ہے اور یہ اختلاف نظام کی فروعات میں کیا جاتا ہے نہ کہ اس کی بنیاد میں، نظام کی بنیاد کو ہر کوئی تسلیم کرتا ہے اور اس کا پابند ہوتا ہے۔

مزید یہ کہ کوئی بھی قانون جو کسی بھی وزارت سے متعلق ہو اور اسے منظور کیا گیا ہو وہ تب تک فعال اور اس پر عملدرآمد نہیں ہوتا جب تک اسے تین فریقوں کی موافقت اور قبولیت حاصل نہ ہو اور ان کے اس پر دستخط حاصل نہ کر لئے گئے ہوں، یہ تین فریق ریاست کا سربراہ، وزیر اعظم اور متعلقہ وزیر ہوتے ہیں، اسکے معنی ہوتے ہیں کہ مسلمان وزیر اپنے وزارتی قلمدان سے متعلق معاملات کی تنفیذ کو بھی خود مختار نہ طور پر یعنی بغیر مداخلت کے انجام نہیں دے سکتا اور نہ ہی تنہا عملی اقدامات کو آزادانہ انجام دے سکتا ہے۔

چنانچہ ان حقائق کی بنیاد پر چند نکات واضح ہوتے ہیں:

قوانین جن کے ذریعے حکومت فیصلے کرتی ہے ان کی بنیاد آفاقی بنیاد (اللہ کے حاکم اعلیٰ ہونے کے یقین) پر نہیں ہوتی ہے بلکہ ان کی بنیاد جمہوریت (یعنی اکثریت کی رائے) پر ہوتی ہے جس میں قانون سازی عوام کرتے ہیں نہ کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ۔

حکومت انتظامی ڈھانچہ ہے یہ حکومت کو سنبھالنے اور دستور کے نفاذ کی اتھارٹی ہوتی ہے۔ حکومت، اس کے سربراہ اور تمام وزراء میں سے ہر ایک فرد، ان تمام میں سے کسی کے لئے جائز نہیں ہوتا کہ وہ دستور کے قوانین کی مخالفت کریں ورنہ ان پر الزام لگادیا جائے گا کہ انہوں نے دستور کی خلاف ورزی کی ہے۔

کوئی بھی وزیر بھلا وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، تنہا اپنے قلمدان کی پالیسی طے نہیں کرتا ہے، بلکہ وہ حکومت کی طے کردہ پالیسی کو نافذ کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس قسم کے نظام میں ہر معاملات ضابطہ کے تحت کئے جاتے ہیں اس طرح کہ کسی کو بھی اختیار حاصل نہیں ہوتا کہ وہ علیحدہ طور پر کابینہ میں کچھ عمل دخل کر سکے یا اپنی مرضی کے تحت معاملہ طے کر سکے۔

اس طرح کی حکومتوں کی حقیقت یہی ہے، متعدد آیات شاہد ہیں جو مسلمانوں کا ان میں داخلہ اور شرکت حرام قرار دیتی ہیں۔

لہذا اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے لازم قرار دیا ہے کہ فیصلہ (حکم) صرف اللہ کی خاطر ہونا ضروری ہے، اللہ کی ذات اقدس ہی ہر فیصلے کے لئے مبداء یعنی سرچشمہ ہونا ضروری ہے جس سے تمام احکامات حاصل ہوتے ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ {النساء: 65} "نہیں، (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصلہ ساز نہ بنائیں پھر تم جو کچھ فیصلہ کرو اس کے بارے میں اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اس کے آگے مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دیں۔" ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ {الاحزاب: 36} "اور جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا حتمی فیصلہ کر دیں تو نہ کسی مؤمن مرد کے لئے یہ گنجائش ہے نہ کسی مؤمن عورت کے لئے کہ ان کو اپنے معاملے میں کوئی اختیار باقی رہے۔ اور جس کسی نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی، وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔"

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے لازم قرار دیا کہ حاکم صرف مسلم ہی ہو سکتا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِيَ الْأَمْرِ مِنْكُمْ﴾ {النساء: 59} " اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی بھی اور تم میں سے جو صاحب اختیار ہیں، اُن کی بھی۔ "

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے لازم قرار دیا کہ مسلمان حکمران صرف اسلام کی بنیاد پر فیصلے کرے، چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ {مائدہ: 49} ”اور (ہم حکم دیتے ہیں) کہ تم ان لوگوں کے درمیان اسی حکم کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، اور ان کی اس بات سے بچ کر رہو کہ وہ تمہیں فتنے میں ڈال کر کسی ایسے حکم سے ہٹادیں جو اللہ نے تم پر نازل کیا ہو۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مسلم حکمران کو اسلام سے انحراف یا رخ موڑنے سے خبردار کیا، چاہے معاملہ کسی ایک حکم کے متعلق کیوں نہ ہو، چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأَحْذَرُكُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾ {مائدہ: 49} ”اور ان کی اس بات سے بچ کر رہو کہ وہ تمہیں فتنے میں ڈال کر کسی ایسے حکم سے ہٹادیں جو اللہ نے تم پر نازل کیا ہو۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے ہم (عوام) پر لازم کیا کہ کسی حاکم (مسلم) کے ذریعے کھلم کھلا کفر (قوا میں) کے ذریعے حکومت کئے جانے پر تلوار سونت لیں۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ ”اے رسول اللہ ﷺ کیا ہم تلواروں کے ساتھ اس کے خلاف قتال نہ کریں؟ تو فرمایا: ((لَا

إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ فِيهِ مِنَ اللَّهِ بَرَهَانٌ)) ”تب تک نہیں جب تک تم کھلم کھلا کفر نہ دیکھ لو جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کی جانب سے کوئی برہان موجود ہو۔“ (مسلم)

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے حاکم کے مشیروں اور حالی موالی کو منع فرمایا کہ وہ اسلام کے سوا کسی اور کی موافقت و حمایت کریں۔ ﴿لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُونِكُمْ﴾ {آل عمران: 118} ”اپنے سے باہر کے کسی شخص کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ تمام فیصلوں کے لئے بنیاد اسلام کو بنائیں اور اللہ نے حرام کیا کہ وہ طاغوت سے رجوع کریں۔ اللہ نے واضح کیا کہ جو کوئی ایسا کرے اس کا ایمان محض ایک دعویٰ ہے اور اس میں کوئی سچائی نہیں ہے چنانچہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا﴾ {النساء: 60} ”(اے پیغمبر!) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ اُس کلام پر بھی ایمان لے آئے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا ہے اور اُس پر بھی جو تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا، (لیکن) ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنا مقدمہ فیصلے کے لئے طاغوت کے پاس لے جانا چاہتے ہیں؟ حالانکہ ان کو حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ اس کا کھل کر انکار کریں۔ اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بھٹکا کر پر لے درجے کی گمراہی میں مبتلا کر دے۔“

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے مسلمانوں پر حرام قرار دیا کہ وہ مسلمانوں کے علاوہ کسی کو بھی اپنا دوست اور مددگار بنائیں یا تسلیم بھی کریں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئْسُوا مِنَ الْآخِرَةِ كَمَا يَتَّسِرَ الْكُفَّارُ مِنْ أَصْحَابِ الْقُبُورِ﴾



{الممتحنة: 13} ”اے ایمان والو! اُن لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جیسے کافر لوگ قبروں میں مدفون لوگوں سے مایوس ہیں۔“

مزید اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾ فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ ۚ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهِ فَيُضْبِحُوا عَلَىٰ مَا أَسْرَوْا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ ﴿51-52﴾ {المائدة: 51-52} ”اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں کو یار و مددگار نہ بناؤ۔ یہ خود ہی

ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں، اور تم میں سے جو شخص ان کی دوستی کا دم بھرے گا تو پھر وہ انہی میں سے ہو گا۔ یقیناً اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ چنانچہ جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے، تم انہیں دیکھتے ہو کہ وہ لپک لپک کر اُن میں گھستے ہیں، کہتے ہیں: ”ہمیں ڈر ہے کہ ہم پر کوئی مصیبت کا چکر آپڑے گا“ (لیکن) کچھ بعید نہیں کہ اللہ (مسلمانوں کو) فتح عطا فرمائے یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کر دے اور اس وقت یہ لوگ اُس بات پر پچھتائیں جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھی تھی۔“

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ حکمران آج یہودی یا عیسائی نہیں ہیں، تو سچ یہ ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کے وفادار ہیں، اور جو ان حکمرانوں کا وفادار ہو تو اس کی وفاداری دراصل اُن سے ہو گی جن کے وفاداریہ حکمران ہیں۔ ﴿وَالَّذِينَ كَفَرُوا بِعَصَاهُمْ أَوْلِيَاءَ بَعْضٌ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ﴾ {الانفال: 73} ”اور جن لوگوں نے کفر اپنا رکھا ہے، وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی وارث ہیں۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا۔“

مزید اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا بُرَاءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا﴾ {الممتحنة:4} ”جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ”ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو، ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے، جب تک تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔“

یہاں یہ بیان کرنا موزوں ہو گا کہ یہودیوں اور نصرانیوں کو اپنا مددگار نہ بنانے سے مراد یہ ہر گز نہیں ہے کہ ان کے علاوہ ہر کسی سے وفاداری کی جاسکتی ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہر شے اور ہر شخص جو اسلام سے متضاد ہو اس سے وفاداری حرام ہے، ان کے تین وفاداری جتلانے کو حرام کیا جانا یہ لازم کرتا ہے کہ فرد خود کو ان سے علیحدہ کر لے اور فکر و اطوار (سلوک) سے متعلق اُن سے ناٹھ توڑ لے اور ان کا کوئی معاملہ قبول نہ کرے جب تک ان کی اساس کفر پر قائم رہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ﴾ {مائده:56} ”جو اللہ اور اس کے رسول کو اور ایمان والوں کو دوست بنائے تو (وہ اللہ کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے اور) اللہ کی جماعت غلبہ پانے والی ہے۔“

ولاء (وفاداری) خالص اللہ کے لئے اور اللہ کے انبیاء اور مومنوں کے لئے ہونا چاہئے۔

دوسرا سوال جو یہاں پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اقتدار میں شرکت سے ہم اپنی وفاداری ان کے حوالے نہیں کر رہے ہیں بلکہ محض اس نمونہ کی پیروی میں ہم اپنی وفاداری ظاہر کرتے

ہیں لیکن ہمارے دل اس کا انکار کرتے ہیں جو کچھ وہ کرتے ہیں، تو حقیقت یہ ہے کہ وفاداری ایسا معاملہ ہوتا ہے جس میں اعضاء و جوارح اور قلب مشترک ہوتے ہیں یعنی اعضاء و جوارح کا قلب کے ہمراہ ہونا ضروری ہوتا ہے اور ہم پر لازم یہ ہے کہ ہم اپنے اعضاء و جوارح سے، اپنی زبان سے اور اپنے دل سے اس حکمران کا انکار کریں جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے بجائے دیگر احکامات سے حکومت کرتا ہے، کم از کم کوئی اتنا کر سکتا ہے کہ دل سے اسے برا جانے اور مزید اس سے کم پر ایمان باقی نہیں بچتا۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، اب ایسے افراد جو کمزور ترین درجہ ایمان کو اختیار کریں تو ان کے افعال اور بیانات میں انہیں حکمران کے اس قانون کو قبول کرنا یا اس کی مدد نہیں کرنا چاہئے اور جو اسے قبول کریں یا ان کی مدد کرتے ہیں تو وہ اللہ کی نافرمانی اور گناہ میں مبتلاء ہو رہے ہیں، چاہے وہ دل سے اسے بُرا مانیں۔ اگر وہ دل سے اسے تسلیم کر لیتے ہوں تو ان پر کفر کا الزام ہو گا۔ کم از کم کوئی شخص اتنا تو ان لوگوں کے متعلق کہہ سکتا ہے جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے بجائے دیگر احکامات سے حکومت کرتے ہیں کہ وہ تمام فاسقون ہیں وہ تمام ظالمون ہیں اور اللہ کے نافرمان (گناہگار) ہیں۔

## پیوند کاری اور بنیادی تبدیلی

اس تکلیف دہ صورتحال میں جس میں مسلمان زندگی گزار رہے ہیں ایسی تحریکات اُٹھیں جنہوں نے اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کی اور اس کی جگہ بہتر متبادل فراہم کرنے کی کوششیں کیں، یہ متبادل سب کی نظر میں ایک اسلامی ریاست کی شکل میں وجود میں آسکتا ہے، ان اسلامی تحریکات کے پیش نظر دو طریقہ عمل موجود تھے۔

پہلا طریقہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لئے دعوتی عمل میں اصلاحی طرز عمل کی بنیاد پر تھا، چنانچہ وہ افراد سرگرم ہوئے کہ جو کچھ بھی تباہ ہو چکا ہے اس کو پھر بحال کریں اور جو کچھ مسخ ہو چکا ہے اس کی دوبارہ تصحیح کریں۔

دوسرا طریقہ بنیادوں کی تبدیلی کی بنا پر تھا، جہاں یہ رائے اختیار کی گئی کہ ایسی حقیقت میں اصلاح کا فائدہ مند ہونے کی توقع کرنا بے سود ہے جس میں بگاڑ بنیادوں میں پہنچ چکا ہے اس لئے پیوند کاری اصلاحات یا محض اصلاحی اقدامات غیر فائدہ بخش ہیں۔

ان دو طرز عمل کے درمیان طرز فکر کے اختلاف کی وجہ سے حقیقت کو دیکھنے کے متعلق دو مختلف رائے قائم ہوئی ہیں اور اس بنا پر حقیقت کو درست کرنے کی خاطر دو مختلف علاج سامنے آئے، جس کے نتیجے میں عمل کے لئے مختلف طریقہ کار اور دعوتی طریقہ کار بھی مختلف ہوئے۔

## اس موضوع کے متعلق شرعی حکم کیا ہوگا؟

شرعی حکم حاصل کرنے کے لئے ہمیں اسلام کے سوچنے کے طریقہ کار کے مطابق آگے بڑھنا ہوگا، کیونکہ شرعی بنیاد کے بغیر شرعی حکم کی معرفت حاصل کرنا ناممکن ہوگا یعنی اگر اس کو سمجھنے کا شرعی طریقہ کار اختیار نہ کیا جائے۔

شرعی طرز فکر پر آگے بڑھتے ہوئے اس حقیقت یا اس معاملہ کی تہ تک پہنچنا ضروری ہے جس میں ہمیں دعوتی عمل کو انجام دینا ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حقیقت کے متعلق شرعی نصوص یا دلائل کو اکٹھا کیا جائے، اور اس کے بعد یہ درکار ہے کہ ان کو شرعی طور پر سمجھا جائے۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہے وہ یہ بھی بتلاتا ہے کہ اگر حقیقت اصلاح کا تقاضا کرتی ہو تو اصلاح کی کیفیت کیا ہونی چاہئے اور یہ بتاتا ہے کہ جب ایک حقیقت جو ایسی تبدیلی کا متقاضی ہو تو تبدیلی کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ لہذا آج ان حالات کے تناظر میں شرعاً ہم سے کیا چیز مطلوب ہے؟ اصلاح یا تبدیلی؟

ان دونوں صورت حال میں حتمی فیصلہ کا اختیار صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ہے اور یہ فیصلہ شرعی نصوص کی بنا پر ہی کیا جاسکتا ہے البتہ وہ شے جو دعوتی طریقہ کار کی نوعیت کی وضاحت کرے گی کہ اصلاح ہو یا تبدیلی وہ دراصل حقیقت حال ہے جس کو فرد تبدیل یا اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

جہاں تک تبدیلی کا تعلق ہے کہ یہ افراد کے ذہنوں کی تبدیلی (عقائد، خیالات، احساسات، پسند و ناپسند کی) ہو یا ان کے حالات کی تبدیلی ہو، یا تمام معاشروں کی تبدیلی ہو یا لوگوں اور قوم کے حالات کی تبدیلی ہو تو ایسی ہر تبدیلی کی شروعات وہاں سے ہونا چاہئے جن بنیادوں پر انسان، معاشرہ اور

اس کے حالات قائم ہوتے ہیں کیونکہ یہ بنیاد ہوتی ہے جس پر تمام جزویات قائم ہوتی ہیں۔ بنیاد ڈھے جائے تو اس پر قائم جزوی اشیاء بھی تباہ ہو جاتی ہیں چنانچہ یہ بنیادیں ہی ہیں جن کی بنا پر وہ تمام جزوی خیالات و نظریات پروان چڑھتے ہیں جو انسان کی ذہنیت کو متاثر کرتے ہیں اور یہ متاثرہ ذہنیت انسان کی زندگی میں اس کے برتاؤ پر اثر انداز ہوتی ہے، چنانچہ انسانی برتاؤ پر اثر انداز ہونے کے لئے ان خیالات و نظریات کے لئے یہ بنیادیں مبداء کا کام کرتی ہیں، چنانچہ انہی بنیادوں اور ان سے جڑے خیالات و نظریات پر انسان کی خوشحالی اور بربادی کا انحصار ہوتا ہے اور انہی کی بنا پر قومیں عروج حاصل کرتی ہیں اور انہی کی بنا پر زوال پذیر ہوتی ہیں، چنانچہ وہ بنیادیں کون سی ہیں؟

وہ بنیاد جس پر ایک مسلمان یا اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوتی ہے وہ اسلامی 'عقیدہ' ہے، مسلمان یا اسلامی ریاست کا کوئی ایک عمل بھی اس عقیدہ اور اس کے تقاضوں سے منحرف نہیں ہونا چاہئے۔

جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے جس میں تبدیلی بھی داخل ہے، یہ صرف فروع کی تبدیلی تک محدود ہوتی ہے، بنیادوں کو تبدیل کرنا اس میں شامل نہیں ہوتا کیونکہ اس حقیقت میں بنیادیں مضبوطی سے اپنی جگہ قائم رہتی ہیں، یا اصلاح کے عمل میں یوں ہوتا ہے کہ اصل وجود کو برقرار رکھ کر اساس کی درستگی اور صفائی پیش نظر ہوتی ہے۔

اگر بنیاد باقی ہو، مگر اس پر گرد و غبار کی تہیں جم گئیں ہوں یا یہ بنیاد کچھ افکار سے متاثر ہو جائے اور اس اثر کو غلبہ حاصل ہو جائے تب یہاں پر کرنے کا عمل اصلاح کہلائے گا، اس کو تبدیلی نہیں کہا جاتا۔ اس صورت میں عمل انجام دیا جاتا ہے تاکہ بنیاد کو اس کی خالص شکل میں واپس لایا جائے اور اس طرح اسے قوت بخشی جائے گی تاکہ بنیاد کے اثرات ان تمام فروعات میں ظاہر ہونے لگیں۔ مثلاً وہ مسلمان جو مغربی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہو، اس کے ایمان کو خالص کرنے پر کام کیا جائے گا اور اس

کے ایمان کے ساتھ چمٹ جانے والی تمام آلائشوں کو دور کیا جائے گا، تاکہ اس کا برتاؤ ٹھیک ہو جائے۔ اسی طرح ایک گناہگار مسلمان پر جو محنت کی جائے گی وہ یہ کہ اس کے ایمان کے کمزور پہلوؤں کو مستحکم کیا جائے تاکہ اس میں وہ جوش و قوت پیدا ہو جائے جو اسے تقویٰ کو حاصل کرنے میں مدد دے اور اس کے اندر خوف و خشیت کا وہ محرک پیدا کیا جائے جو اسے گناہ سے بچائے۔ جو کچھ مسلمان فرد پر لاگو ہوتا ہے وہی اسلامی ریاست پر بھی لاگو ہوتا ہے، مثال کے طور پر جب ہم ایک کافر کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہیں ہماری دعوت ایک تبدیلی کی دعوت ہوگی کیونکہ اس کی بنیاد اور جو کچھ اس بنیاد پر قائم ہے تمام باطل ہیں، چنانچہ ہمیں اس بنیاد کو مسمار کر کے ایک نئی اور درست بنیاد قائم کرنی ہوگی۔ لہذا ہم کسی کافر کو عبادت کی دعوت نہیں دیتے اور اس کی کفر بنیاد کو برقرار نہیں رہنے دیتے جس پر وہ قائم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہی کیا اور معاملات کی حقیقت بھی یہی ظاہر کرتی ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے خبردار کیا ہے کہ وہ کفار کا کوئی عمل قبول نہیں کرے گا، چاہے ان کے افعال کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں اور کوئی بھی ایمان نہ رکھنے والا جنت میں اپنے اعمال کی وجہ سے داخل نہ ہو سکے گا جب تک ان اعمال کی بنیاد اس ایمان پر نہ رکھی گئی ہو جسے اسلام لے کر آیا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَقَدْ مَنَّا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا﴾ {25:23} ”اور انہوں نے (دنیا میں) جو عمل کئے ہیں، ہم ان کا فیصلہ کرنے پر آئیں گے تو انہیں فضا میں بکھرے ہوئے گرد و غبار (کی طرح بے قیمت) بنادیں گے۔“

اسی طرح جو مسلمان ارتداد اختیار کرتا ہے، اس کے تمام اعمال اکارت ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایمان ہی تمام افعال کی بنیاد ہونا لازم ہے۔

جہاں تک ایک مسلمان کو دعوت دینے کا تعلق ہے تو ہماری دعوت اصلاح کی دعوت ہوگی، کیونکہ جس بنیاد پر وہ قائم ہے وہ حق ہے لیکن اس کو آلائشوں سے پاک کرنا پھر بھی ضروری ہے اور ان چیزوں سے جس نے اسے صحیح سمت اور فرمانبرداری سے دور کر رکھا ہے۔ تو جب اس کے پاس اصل بنیاد موجود ہے، تو اب اس کو بڑھانے والے اور قوت بخش اعمال کی ضرورت ہوگی اور اس کو زرخیز، تروتازہ اور صاف ستھرا رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ جب ایسا ہو گا تو اس کی سمت درست ہو جائے گی اور وہ صحیح طریقے سے پابندی کرنے لگے گا۔ اگر ایک مسلمان شراب پی لے یا زنا کا مرتکب ہوتا ہے، چوری کرے، سود میں ملوث ہو، یا معاشرہ میں اسلامی زندگی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اسلامی دعوت کو انجام دینے سے پیچھے ہٹ جائے تو اس کے دائرہ ایمان کا علاج کرنے پر اس کا علاج ہو جائے گا۔ اسے خالق کائنات اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی یاد دلائی جائے گی جو کہ تمام معاملات پر قادر ہے اور جس کی عبادت اور اطاعت اس پر لازم ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ یہ نہ دیکھے کہ اس کا گناہ کتنا چھوٹا ہے بلکہ یہ دیکھے کہ اس کا خالق کتنا جلیل القدر اور عظمت والا ہے۔ خالق نے اس کو امر و نہی کی ہے تو صرف ایسے امور کے بارے میں جو اس کے لئے دنیا و آخرت میں بھلائی کا سامان نہ بنے؟ اسی طرح اسے یاد دلایا جائے گا کہ معصیت کے بدلے برائیاں ملتی ہیں جو اسے جہنم میں داخل کر دیں گی اور فرمانبرداری اور اطاعت کے بدلے نیکیاں حاصل ہوتی ہیں جو وہ آخرت کے دن پالے گا جو اسے رحمت الہی کا حق دار بنائیں گی۔ چنانچہ اس کے ساتھ گفتگو میں آخرت کی ہولناکیوں اور جہنم کے دردناک عذاب اور جنت کی نعمتوں اور آسائشوں کی یاد دہانیوں پر اپنی توجہ مرکوز رکھے۔ اس بنا پر اس کا ایمان تروتازہ اور بیدار رہتا ہے، لہذا وہ اطاعت میں پیش پیش رہتا ہے اور محرمات سے دور بھاگتا ہے۔ مسلمان کے معاملہ کی اس کے علاوہ کسی بھی طرح تصحیح اور اصلاح نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں آج مسلمان افراد کو دعوت دینے میں اس بات کو مد نظر رکھنا ہو گا کہ وہ مسلمان ہیں اور ان کے افکار کی تصحیح اور برتاؤ کی درستگی درکار ہے۔



جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے جن کے نظام حکومت دستوروں پر تعمیر ہوتے ہیں اور ان دساتیر کے اپنے سرچشمے ہوتے ہیں، ان سرچشموں کا کوئی نہ کوئی مبدا ہوتا ہے: یہاں دیکھا جائے گا کہ کیا ریاست اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر قائم ہے اور نتیجتاً اس نے قرآن و سنت یا جن کی طرف قرآن و سنت رہنمائی کرتے ہیں، ان سب کو واحد وحی الہی کے سرچشموں کے طور پر اختیار کر لیا ہے؟ کیا ریاست نے ان سرچشموں سے ہی اپنے دستور کے دفعات اخذ کئے ہیں، اس طرح کہ دستور کا کوئی ایک بھی حکم یا دفعہ وحی سے باہر نہ ہو۔ اگر ریاست حقیقتاً ایسا کرتی ہے تو ریاست اس حقیقت کے تحت اسلامی ریاست ہے۔

اگر اس قسم کی ریاست میں فسق و فساد اور بد انتظامی ہو تو پھر اس کو اصلاح کی ضرورت ہوتی ہے، اس کو تبدیل کیا جانا مطلوب نہیں ہوتا جیسا کہ اسلامی ریاست کے اواخر میں عثمانی دور خلافت میں اسلامی ریاست کے حالات ہوئے تھے، اس زمانہ میں اسلامی ریاست کی اصلاح درکار تھی اور اس کے خلاف بغاوت قطعاً ناجائز تھی اور اس کی تباہی کے لئے مغربی کفار کو مدد فراہم کرنا جائز نہیں تھا جو نام نہاد 'شریف حسین' نے انجام دیا تھا۔

اور جب ریاست اپنے اصل ہی سے اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر قائم نہ ہوئی ہو جو کہ آئین یا دستور، نظام، قوانین کی بنیاد ہے تب اس کی تبدیلی مطلوب ہوگی یہاں اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی، جیسی صورت حال اس زمانہ میں موجودہ مسلم ریاستوں کی ہے جن میں مسلمان رہتے ہیں، یہ غیر اسلامی ریاستیں ہیں کیونکہ ان کے نظام اسلامی شریعت سے ماخوذ نہیں ہوتے (چاہے وہ کہتے ہوں کہ ریاست کا ریاستی مذہب اسلام ہے)، کیونکہ ریاست کے لئے نفاذ اور انتظام اہم ہوتا ہے، بیانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے، معنی اہم ہوتے ہیں نام اپنی کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

لہذا چونکہ مسلمانوں پر حکومت کرنے والی ریاستوں کے نظامہائے حکومت کے دساتیر اور ان کے آئین مکمل طور پر قرآن و سنت کی بنیاد پر تعمیر نہیں ہوئے ہیں، معاملہ کی یہ بنیادی حقیقت عملِ تغیر (تبدیلی) کو انجام دینا لازم قرار دیتی ہے اس عمل میں ریاست جن بنیادوں اور ستونوں پر قائم ہے ان کی کلی و بنیادی تبدیلی لازمی ہے۔ ریاستوں کے اس معاملہ کو پیوند کاری کی جزوی اصلاحات کے ذریعے درستی جائز نہیں، بلکہ اس معاملہ کو ایک جامع، بنیادی اور انقلابی تبدیلی کے ذریعے حل کرنا ہوگا، اس معاملہ کو اس ایک واحد طریقہ عمل کے علاوہ کسی اور طرز پر انجام دینا ناجائز ہوگا کیونکہ ایسا کرنا دوسرے معنوں میں اس کا ضمنی اعتراف ہے اور اس لئے بھی کہ ایسا عمل اس معاملہ اور حقیقت کے حوالے سے ایک غیر شرعی مطالبہ ہوگا کیونکہ معاملہ کی حقیقت اللہ کے نازل کردہ احکامات کی بجائے دوسرے احکامات سے حکومت کرنے کی ہے، چنانچہ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تحریکات یا گروہ جو موجودہ ریاستوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تاکہ ان کی اصلاح کریں ان کے ساتھ پہنچتے ہیں اور ریاستی عہدوں اور وزارتوں میں داخل ہونے کے لئے کام کرتے ہیں، جس بھی معاملہ میں وہ سدھار لانا چاہتے ہیں اس کے مطابق ان کا طرز عمل ہمیشہ جزوی رہتا ہے کیونکہ ان کا طریقہ عمل بنیادی طور پر جزوی اصلاحات کا ہے۔ وہ سرگرم رہتے ہیں تاکہ مشترکہ رابطہ کا وسیلہ انہیں حاصل ہو جائے جس کو نظام اور ان کے درمیان تبادلہ خیال کے لئے نقطہ آغاز تسلیم کیا جائے، لہذا ان کے طرز عمل میں مختلف ممالک کے اعتبار سے بوقلمونی نظر آتی ہے، جس میں وہ سرگرم ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ ملک کو اسلامی رنگ میں رنگ دیا جائے، اگرچہ یہ رنگ اصل مغز کی بجائے صرف چھلکے یعنی اوپری سطح پر ہی کیوں نہ ہو، یوں اصل جوہر کو چھپڑے بغیر صرف ظاہری طور پر اسلام کا روپ دھار سکے۔

ہم بنیادی تبدیلی کے داعیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہر معاملہ میں اس امر واقع سے منفرد نظر آتے ہیں جس کو وہ تبدیل کرنا چاہتے ہیں، یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے خیالات کا رشتہ

اس بنیاد کے ساتھ جوڑے ہوئے ہوتے ہیں جس پر ان کا ایمان ہوتا ہے، وہ سرے سے ہی موجودہ حقیقت کا انکار کرتے ہیں۔ تو کوئی بھی بنیاد جب اس بنیاد سے مختلف ہوتی ہے تو اس پر کھڑا ہونے والے ڈھانچے کو بھی نہیں مانا جاتا ہے، چاہے ان دونوں کے درمیان کچھ فروعاتی معاملات میں انہیں مشابہت نظر آئے۔

اس طریقہ عمل کے داعی زندگیاں اس طرح گزارتے ہیں کہ ان کے اذہان میں اُس نمونہ کی ایک پوری شکل اور مکمل ڈھانچہ موجود ہوتا ہے جس کی طرف عوام کو منتقل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، یہ نمونہ انہیں نبی کریم ﷺ اور ان کے اصحابؓ کے دور میں پہنچا دیتا ہے۔ وہ جس حقیقت میں جی رہے ہوتے ہیں اس کی بنیادوں پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ ان کے پیش نظر موجودہ زمانہ کی حقیقت نہیں ہوتی بلکہ اسی نمونہ کی بنا پر موجودہ حقیقت کو تبدیل کر کے اسلام کو اس کی اصل شکل میں اور حقیقت کو اس کے بہترین دور میں واپس لے آتے ہیں، وہ موجودہ حقیقت حال اور اس کی بنیادوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں جس میں وہ زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس گروپ کا طرز عمل ہر ملک میں یکساں پایا جاتا ہے کیونکہ نوآبادیاتی کافروں نے مسلمانوں کو جن حالات سے دوچار کر رکھا ہے وہ ہر جگہ یکساں اور مشابہ ہے اور اس لئے بھی کہ ان کا حل بھی ایک ہی ہے۔

مغرب نے مسلمانوں کے نوآبادیاتی استحصال کی شروعات سے ہی یہ کیا کہ کتاب و سنت کو جو ہماری زندگیوں کے لئے واحد قانونی منبع کا درجہ رکھتے تھے، دور کر دیا۔ اس سے قبل مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی زندگی کے فیصلے قرآن و سنت پر مبنی ہوا کرتے تھے، مغرب نے یہ تب کیا جب اس نے دین اسلام کو ہماری زندگی کے معاملات اور انتظام سے نکلنے پر کام کیا اور اس میں مغرب کامیاب ہوا، مغرب کی یہ کامیابی ہمارے لئے شیطانی نتائج لے کر آئی، آج اسلام کی تاریخ میں بالکل نئی بات معلوم

ہوتی ہے جب اسلامی تحریکات ان بناوٹی وجودوں سے برتاؤ کر رہی ہوتی ہیں جنہیں مغرب نے خود تیار کیا ہے، جب وہ ان وجودوں کے ساتھ ان کی اصلاح کی خاطر معاملات طے کرتی ہیں نہ کہ انہیں اکھاڑ پھینکنے کے لئے۔ بلاشبہ پیوند کاری و مرمت کتنی ہی دفعہ اور کتنی ہی مقدار میں کی جائے اس حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتی اور اس کی تصحیح نہیں کر سکتی ہے۔ وہ جو چیزوں اور معاملات کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے، ان کے بارے میں حکم پہچان پانے سے بھی قاصر ہے۔ چنانچہ ایسا شخص درست عمل اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی بہترین پیروی چھوڑ دیتا ہے۔

وہ جو زمانہ حال میں اللہ کی طرف دعوت دینے کی خواہش رکھتا ہے، رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کو کبھی بھی بھول نہیں سکتا: **((... ثم تكون خلافة على منهاج النبوة))** ”۔۔۔ پھر اس کے بعد نبوت کے نقش قدم پر خلافت قائم ہوگی“ (رواہ الامام احمد)

وہ جو خلافت راشدہ کی موجودگی چاہتا ہو جو نبوت کی طرز پر آئے، تو اس کے پاس منتخب کرنے کے لئے سوائے اشرف الناس رسول اللہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتلائی ہوئی سیرت کے کوئی دوسرا راستہ نہیں، وہ رسول جن کی کوششیں اللہ کی مدد سے ثمر بار ہوئیں اور ان کوششوں سے وہ امت تیار ہوئی جو اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے انسانیت کی تاریخ میں سب سے بہترین امت کے منصب پر سرفراز ہوئی ہے۔ اور یہ ایک ہی زنجیر ہے جو انبیاء اور ان کے پیروؤں کی سیرت کی زنجیر ہے، ہم اللہ سے دعا گو ہیں کہ اللہ ہمیں اس مقدس زنجیر میں شامل کر لے اور اس کی مضبوط کڑیاں بنادے، اور وہ یوں کہ ہم سیرت المصطفیٰ ﷺ کی اتباع کریں پھر لوگ ہماری پیروی کریں، اور ہم سب اس مقدس ترین عمل اور سچی عبادت میں اکٹھے ہو کر رہیں۔

# کیا رسول اللہ ﷺ نے اسلام قبول کرنے والے نجاشی کی جانب سے کفریہ قوانین کے ذریعے حکمرانی کو قبول کیا؟!

جو کوئی اخلاص کے ساتھ اسلام کا پابند ہوتا ہے اور اسلام کو زندگی اور حکومت میں واپس لانے کے لئے کام کرتا ہے خواہ فرد ہو یا جماعت کی شکل میں سرگرم رہتا ہے، ناممکن ہے کہ وہ کفر نظام کے اندر شرکت کرے جبکہ وہ اس کو تباہ کرنے کا دعویدار بھی ہوتا ہے، کیونکہ ایسی کفریہ حکومت میں شرکت کرنا جو کفر نظام اور کفر قوانین کو مسلط کرتا ہے، ان نظاموں کو مزید استحکام بخشنا ہے، یہ اس کو گرانا نہیں کہلاتا۔ لہذا ایسی کوئی بھی دلیل جو کفر نظام میں داخلہ اور شرکت کو جائز کرنے کے لئے پیش کی جائے، مومنوں اور اللہ کو دھوکا دینے سے قبل یہ عمل اپنے آپ سے آنکھ مچولی کھیلنے کے مترادف ہے اور خود فریبی ہے، خاص طور پر جب وہ دلیل اُن واضح و قطعی شرعی دلائل سے متناقض ہو جو معنی اور سند کے اعتبار سے قطعی ہیں۔

یہ بلاشبہ ایک شدید امتحان اور گناہ عظیم ہے کہ ایک داعی کو مصلحت کی آڑ لینا پڑے جس پر اس کی عقل کی نگاہ پڑے اور جس کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں، اور اپنے لئے قطعی الثبوت والدلالہ نصوص کی مخالفت کو جائز ٹھہرانے کے لئے اس کو دلیل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ یا کفر حکومت میں شرکت کو جائز ٹھہرانے کے لئے اسے وہ کچھ استعمال کرنا پڑے جو شبہ الدلیل کے درجہ میں بھی نہ ہو، ایسی حکومت جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے بجائے دوسرے احکامات کے تحت حکومت کرتی ہے جبکہ کفر حکومتوں میں شرکت کا فعل کھلم کھلا ان قطعی واضح نصوص کی خلاف ورزی کرنا ہے جو اسناد اور معنی

کے اعتبار سے قطعی ہیں۔ یہ نصوص لازم کرتے ہیں کہ حکومت صرف اللہ کے نازل کردہ احکامات کے تحت کی جائے اور ما نزل اللہ کے علاوہ دیگر احکامات کے تحت حکومت کو حرام قرار دیتے ہیں۔

مثلاً نجاشی، جس کی موت کا اعلان نبی کریم ﷺ نے اس کی وفات کے دن صحابہ کرامؓ کے سامنے کیا اور اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی، وہ اس واقعہ کو کفر حکومتوں میں شرکت کے لئے ایک دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں، جو اللہ کے نازل کردہ احکامات کے علاوہ سے حکومت کرتے ہیں، ان کی رائے ہے کہ نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا اور اسی نظام کے تحت حکومت جاری رکھی جو وہ قبول اسلام سے قبل استعمال کرتا آ رہا تھا، باوجود اس کے کہ وہ ایک غیر اسلامی نظام تھا۔ اس رائے کے ثبوت میں وہ البخاری کی چھ حدیثیں پیش کرتے ہیں جو نجاشی کی موت اور اس کی نماز جنازہ پڑھائے جانے کے واقعہ کے متعلق ہیں، ان میں سے تین جابر بن عبد اللہ الانصاریؓ سے مروی ہیں اور بقیہ تین ابو ہریرہؓ سے مروی ہیں، حالانکہ یہ چھ حدیثیں بھی کفر حکومتوں میں شرکت کے جواز کے ثبوت کے لئے ناکافی ہیں، مندرجہ ذیل نکات سے اس معاملہ کی تفصیلی وضاحت ہوتی ہے۔

1- جب بخاری نے ان احادیث کی روایت کی تو ان میں سے پانچ کو انہوں نے ”باب موت النجاشی“ کے ترجمہ الباب (عنوان) کے تحت پیش کیا اور چھٹی حدیث کو انہوں نے ”باب الجنائز“ یعنی جنازہ کا باب کے موضوع کے تحت پیش کیا، یہ تمام چھ احادیث مندرجہ ذیل کا بیان کرتی ہیں یعنی نجاشی کی موت، نبی کریم ﷺ کا صحابہ اجمعینؓ کو اس کی موت کی خبر دینا کہ وہ ایک نیک شخص تھا اور ان تمام کا ایک ایمانی بھائی تھا اور نبی کریم ﷺ کا صحابہؓ کو حکم دینا کہ اللہ سے اس کی مغفرت طلب کریں اور آپ ﷺ کے ساتھ اس کی نماز جنازہ میں شریک ہوں، یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ نجاشی مسلمان تھا۔

2۔ ابن حجر العسقلانی اپنی کتاب فتح الباری (شرح صحیح بخاری) میں امام بخاری کے اس ترجمہ الباب کی ذیل میں بیان کرتے ہیں جہاں امام بخاریؒ نے "نجاشی کے قبول اسلام" کے بجائے "نجاشی کی موت" سے ترجمہ قائم کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ”اس پر اشکال (اعتراض) کیا گیا ہے، حالانکہ یہاں ترجمہ الباب نجاشی کا اسلام ہونا چاہئے تھا اس کی بجائے انہوں نے اسے "نجاشی کی موت کے باب" میں پیش کیا۔ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ نجاشی کے اسلام قبول کرنے کا واقعہ امام بخاری کے نزدیک ثابت نہیں ہو پایا تھا جبکہ حدیث اس کی موت کے بارے میں صریح ہے، چنانچہ انہوں نے نجاشی کی موت کے واقعہ کو بیان کیا تا کہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ وہ مسلمان ہو چکا تھا کیونکہ اس کی نماز جنازہ پڑھی گئی تھی۔

3۔ امام بخاریؒ کی احادیث کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اس کی موت کا علم اور قبول اسلام کی اطلاع اس کی وفات کے دن وحی کے ذریعے ملی تھی، ساتھ ہی احادیث کے جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اس کی موت اور اس کے قبول اسلام کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے جب تک آپ ﷺ نے ان کو یہ خبر نہیں سنائی تھی، چنانچہ جابرؓ کی حدیث میں وہ روایت کرتے ہیں :

((مات اليوم رجل صالح، فقوموا فصلوا على أخيكم أوصمة)) ”جب نجاشی کی وفات ہوئی تو پیغمبر ﷺ نے فرمایا: آج ایک نیک شخص فوت ہوا ہے، لہذا اٹھو اور اپنے بھائی اوصمہ کی نماز جنازہ پڑھو۔“

ابو ہریرہؓ کی حدیث میں آیا ہے کہ: ((أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ نَعَى لَهُمُ النِّجَاشِيَّ، صَاحِبَ الْحَبْشَةِ فِي الْيَوْمِ الَّذِي مَاتَ فِيهِ)) ”اللہ کے رسول ﷺ نے ان کو نجاشی، جو حبشہ کا بادشاہ تھا، کی موت کے متعلق خبر دی جس دن اس کی وفات ہوئی تھی۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو نجاشی کی موت اور اس کے قبول اسلام کی معلومات اس دن وحی کے ذریعے حاصل ہوئی جس دن اس کی وفات ہوئی تھی۔ اور نبی کریم ﷺ کا صحابہؓ کو یہ فرمانا جسے جابر بن عبد اللہ نے روایت کیا کہ: ((مات اليوم رجل صالح)) ”آج ایک نیک شخص کی وفات ہوئی ہے“ اور یہ کہ: ((فقوموا فصلوا علی أخیکم أوصحمة)) ”اٹھو اور اپنے بھائی اوصمہ کی نماز جنازہ پڑھو“

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں اس کے اسلام قبول کر لینے کی خبر نہیں تھی کیونکہ اگر انہیں اس کی خبر ہوتی تو رسول ﷺ کا اس طرح تعبیر اختیار کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ: ((رجل صالح)) ”ایک نیک شخص“ ((أخیکم)) ”تمہارا بھائی“

کیونکہ جب آپ ﷺ لوگوں کو کسی صحابی کی نماز جنازہ کی دعوت دیتے تو آپ ﷺ اس طرح کے جملے استعمال نہیں کرتے تھے۔

4- یہ احادیث بتاتی ہیں کہ نجاشی نے موت سے کچھ دیر پہلے اسلام قبول کیا تھا لیکن یہ تفصیل نہیں بتلاتیں کہ اس نے اسلام کب قبول کیا تھا۔ الفاظ کی ادائیگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کی وفات اور اس کے قبول اسلام کے متعلق وحی کے ذریعے اسی دن مطلع کئے گئے تھے جس دن اس کی موت واقع ہوئی جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا جا چکا ہے، ایسی کوئی مستند حدیث موجود نہیں ہے جو بتلاتی ہو کہ نبی کریم ﷺ کو اس واقعہ سے قبل کبھی مطلع کیا گیا تھا کہ نجاشی نے اسلام قبول کیا ہے۔

5- ان چھ احادیث میں ایسا کچھ بیان نہیں ہے جو واضح کرے کہ جس نجاشی کی موت کی خبر آپ ﷺ نے صحابہؓ کو دی اور اس کی نماز جنازہ پڑھی، وہ وہی نجاشی تھا جو حبشہ کی طرف مسلمانوں کی ہجرت کے وقت حبشہ کا حاکم تھا، ایسا کچھ بیان نہیں ہے کہ یہ وہی نجاشی تھا جس کو نبی کریم ﷺ نے خط



ارسال کیا تھا جس میں اسے قبول اسلام کی دعوت دی گئی تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ 'نجاشی' اسم خاص نہیں جو کسی شخص کا نام ہو بلکہ ایک لقب ہے جو حبشہ کے ہر بادشاہ کو دیا جاتا تھا جیسا کہ امام نوویؒ اپنی کتاب 'شرح صحیح مسلم' کی بارہویں جلد میں روایت کرتے ہیں اور جسے ابن حجر العسقلانیؒ نے اپنی کتاب 'الاصابة' کی تیسری جلد میں روایت کیا ہے۔ یعنی یہ اسی طرح کا ایک لقب ہوا کرتا تھا جو فرعون مصر کو دیا جاتا تھا۔ مصر کے بادشاہ کو فرعون کا لقب دیا جاتا تھا جن کے اپنے مخصوص ذاتی نام بھی ہو کرتے تھے۔

6- "شرح صحیح مسلم" کی بارہویں جلد میں امام نوویؒ نے تشریح کی ہے کہ جس نجاشی کو نبی کریم ﷺ نے چھٹے ہجری سال کے اختتام کے قریب خط لکھا تھا جو حُدیبیہ سے واپسی کے بعد کا واقعہ ہے، یہ وہ نجاشی نہیں تھا جس کی نماز جنازہ رسول اکرم ﷺ نے پڑھائی تھی، حدیث کی عبارت اس طرح ہے: ((عن أنس أن النبي ﷺ كتب إلى كسرى وإلى قيصر وإلى النجاشي وإلى كل جبار يدعوهم إلى الله تعالى. وليس بالنجاشي الذي صلى عليه النبي ﷺ)) "انسؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے کسریٰ، قیصر، نجاشی اور ہر طاقتور کو خط لکھ کر اللہ کی جانب دعوت دی، لیکن یہ وہ نجاشی نہیں تھا جس کی نماز جنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی تھی۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس نجاشی کی نماز جنازہ آپ ﷺ نے پڑھی تھی یہ وہ نجاشی نہیں تھا جس کی جانب مسلمانوں نے ہجرت اختیار کی تھی تاکہ اس کی پناہ میں رہ سکیں اور یہ وہ نجاشی بھی نہیں تھا جس کو نبی کریم ﷺ نے ہجرت کے چھٹے سال کے آخر میں خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی، بلکہ یہ ایک دوسرا بادشاہ (نجاشی) تھا جو اُس نجاشی کی موت کے بعد تخت نشین ہوا تھا جسے نبی کریم ﷺ نے عمرو بن اُمیہ الضمری کے ہاتھ خط بھیجا تھا اور اسلام کی دعوت دی تھی اور اُس نے آپ ﷺ کی دعوت قبول اسلام کا کوئی جواب نہیں دیا تھا اور نہ ہی اس نے اسلام قبول کیا تھا کیونکہ اگر اس نے اسلام قبول کیا ہوتا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی خبر صحابہؓ کو دی ہوتی اور اس کی بھی نماز جنازہ

پڑھائی ہوتی اور جعفر بن ابی طالبؓ اور دیگر مہاجرین حبشہ اس کے قبول اسلام کے متعلق جانتے ہوتے، حبشہ کے مہاجرین مکہ کی فتح کے بعد ہجرت مدینہ کے ساتویں سال واپس ہوئے، یعنی یہ واپسی آپ ﷺ کا نجاشی کو خط بھیجے جانے کے بعد ہوئی، اگر اس نے اسلام قبول کر لیا ہوتا تو اس کے اسلام لانے کا چرچا ہوتا اور مسلمانوں کے لئے یہ ایک بہت بڑی خوشی اور مسرت کی بات ہوتی خاص طور پر اس وقت جبکہ خیبر کی فتح حاصل ہوئی تھی اور تب نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ کو اس کے قبول اسلام کی خبر دے دیتے، جب آپ ﷺ نے لوگوں کو جعفر بن ابی طالبؓ کی واپسی کی خبر سنائی تھی تو صرف یہ نہ کہتے کہ: ((ما أدری بأيهما أنا أصر: بفتح خیبر، أم بقدم جعفر)) ”میں نہیں جانتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ خوشی ہوئی ہے خیبر کی فتح یا جعفرؓ کی آمد“ (سیرت ابن ہشام)

آپ ﷺ یہ بھی فرمادیتے کہ "یا نجاشی کا قبول اسلام"، لیکن آپ ﷺ نے اس حدیث میں نجاشی کے متعلق کچھ بیان نہیں فرمایا، حالانکہ حالات متقاضی تھے کہ اگر نجاشی نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہہ کر اسلام قبول کر لیا ہوتا تو اُسے بیان کیا جاتا۔

7۔ وہ لوگ جنہوں نے یہ رائے اختیار کی کہ نجاشی جس کی نماز جنازہ آپ ﷺ نے پڑھائی وہی نجاشی ہے جس کی طرف مسلمانوں نے ہجرت کی تھی اور اس کی امان میں حبشہ میں داخل ہوئے تھے اور یہ کہ یہ وہی نجاشی تھا کہ جس کو ہجرت کے چھٹے سال کے اختتام پر آپ ﷺ نے خط ارسال کیا تھا اور قبول اسلام کی دعوت دی تھی، انہیں اس رائے میں غلط فہمی ہوئی ہے اور اس غلط فہمی کی وجہ یہ تھی کہ جس نجاشی کی طرف نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کے لئے بھیجا تھا آپ ﷺ نے اس کو سراہا اور اس کی تعریف کی تھی اور جو لوگ ہجرت اختیار کرنا چاہتے تھے انہیں یہ بتلایا کہ: ((بأنه

ملك لا يظلم عنده أحد، وأن أرضه أرض صدق)) ” یہ وہ بادشاہ ہے جس کے زیر نگین کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا اور اس کی زمین سچائی کی زمین ہے“ (سیرت ابن ہشام)

آپ ﷺ کی یہ بات سچ ثابت ہوئی، اس نجاشی نے مہاجر مسلمانوں کو بہترین پناہ دی اور انہیں تحفظ فراہم کیا، مسلمانوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اللہ کی عبادت شروع کی، اس نے شاہی پادریوں کی خواہشات کے خلاف انہیں قریش کے دوسفیروں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا جب ان سفیروں نے ان کی حوالگی کا مطالبہ کیا، اس نے انہیں بچایا، حفاظت دی اور ان سے یہ کہا کہ ’تم میری زمین میں محفوظ ہو اور جو تمہیں گالی دے گا اسے جرمانہ کیا جائے گا۔ غلط فہمی کی وجہ جعفرؓ کے جوابات پر نجاشی کے تبصرے ہیں، اول جب جعفرؓ سے نجاشی نے پوچھا کہ تمہارے نبی ﷺ نے کون سا پیغام لایا ہے؟ تو اس سوال کے جواب پر نجاشی نے تبصرہ کیا کہ ”بے شک یہ معاملہ اور جو عیسیٰؑ لے کر آئے تھے ایک ہی چراغ کی روشنی ہے“ اور مزید دوسرے دن جعفرؓ کے جواب پر نجاشی کا تبصرہ جب جعفرؓ سے پوچھا کہ عیسیٰؑ کے متعلق ان کے کیا نظریات ہیں؟ جس کے جواب پر نجاشی نے زمین سے ایک چھڑی اٹھائی اور کہا ”اللہ کی قسم! عیسیٰؑ کے متعلق جو کچھ تم نے کہا اور عیسیٰؑ میں اس چھڑی کی چوڑائی سے زیادہ فرق نہیں ہے۔“ (سیرت ابن ہشام)

ان تمام سے انہوں نے یہ سمجھا کہ شاید نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا، جبکہ نبی کریم ﷺ نے اس کے قبول اسلام کا نہ کوئی اظہار کیا اور نہ ہی کوئی اعلان کیا، اسی طرح ام سلمہؓ جو کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے ہوئیں وہ بھی حبشہ کے مہاجرین میں سے تھیں، انہوں نے بھی نجاشی کے قبول اسلام کا کوئی ذکر نہیں کیا جب وہ نجاشی کے متعلق اور ان کی حبشہ میں روداد بیان کرتی ہیں جو ان کے ساتھ وہاں پیش آئی تھی وہ کہتی ہیں کہ ”جب ہم حبشہ کی سر زمین میں پہنچے تو ہمیں بہترین پڑوسی ملا،

معزز نجاشی، ہم اپنے دین کے معاملات میں خود کو محفوظ پاتے تھے اور بغیر کسی نقصان کے اللہ کی عبادت کی اور ہم نے کوئی ایسی بات نہ سنی جس سے ہم نفرت کرتے ہوں۔۔۔“ مزید وہ بیان کرتی ہیں کہ ”ہم انہی حالات میں تھے کہ حبشہ میں ایک ایسے شخص کا ظہور ہوا جس نے نجاشی کے اقتدار کو لاکارا۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ ”ہم ایسے غمگین حالات میں تھے جو ہم پر اس سے پہلے نہیں گذرے تھے ہمیں یہ خوف تھا کہ یہ باغی شخص نجاشی کو شکست دے سکتا ہے اور اس طرح دوسرا شخص برسر اقتدار آجائے گا جو ہمارے حقوق کو تسلیم نہیں کرے گا جو نجاشی نے قبول کئے تھے“ آگے وہ بیان کرتی ہیں کہ ”اللہ نے جب نجاشی کو اس کے دشمنوں پر فتح نصیب کی اور اس کو زمین میں مزید مستحکم کر دیا تب ہمیں وہ مسرت حاصل ہوئی جو اس سے قبل کبھی نہیں ہوئی تھی“۔ ”نجاشی جب جنگ کے میدان سے واپس ہوا جب اللہ نے اس کے دشمنوں کو شکست سے دوچار کر کے تباہ کر دیا اور نجاشی کو اس کی زمین میں مزید مضبوط کر دیا اور حبشہ کا انتظام اب بہتر ہاتھوں میں تھا چنانچہ ہم اس کے پڑوس میں بہترین گھروں میں رہ رہے تھے جب تک ہم رسول اللہ ﷺ تک مکہ میں نہ آ پہنچے۔“ (سیرت ابن ہشام)، ام سلمہؓ کی اس حدیث سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نجاشی نے اسلام قبول کیا تھا۔

یہ ایک پہلو ہے۔ دوسرے پہلو کے تحت جو لوگ کہتے ہیں کہ جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے مہاجرین کو بھیجا تھا اور جسے خط بھیج کر اسلام کی دعوت دی تھی دراصل وہی نجاشی تھا جس کی نماز جنازہ رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی، شاید انہیں انس بن مالکؓ کی حدیث کا علم نہیں، جو صحیح مسلم میں بھی مروی ہے: ((عن أنس أن النبي ﷺ كتب إلى كسرى وإلى قيصر وإلى النجاشي وإلى كل جبار يدعوهم إلى الله تعالى. وليس بالنجاشي الذي صلى عليه النبي ﷺ)) ”رسول ﷺ نے کسری، قیصر، نجاشی اور ہر ایک طاقتور کو خطوط بھیجے

اور اللہ کی جانب دعوت دی، لیکن یہ وہ نجاشی نہیں تھا جس کی نماز جنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی تھی۔“

جہاں تک ان خطوط کا تعلق ہے جو محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب ’نبوی عہد کی سیاسی دستاویزات‘ میں ظاہر کئے ہیں، اور وہ یہ کہ نجاشی نے نبی کریم ﷺ کو خط لکھ بھیجا جس میں وہ اپنی تبدیلی اسلام کے متعلق بتلاتا ہے اور نبی کریم ﷺ کے پاس آپ ﷺ کے حکم پر آجانے کی اپنی آمادگی ظاہر کرتا ہے اور یہ کہ اس نے اپنے بیٹے ارہاب بن الاسحم بن ابجر کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا، اور یہ خط آپ ﷺ کی طرف سے تب بھیجا گیا تھا جب آپ ﷺ مکہ میں موجود تھے، جبکہ دوسرا خط بتلاتا ہے کہ یہ نجاشی کی طرف سے حبشہ سے واپس ہوتے ہوئے صحابہؓ کے ہاتھوں نبی کریم ﷺ کی طرف بھیجا گیا تھا جبکہ آپ ﷺ مدینہ میں تھے۔

احادیث کی مدلل کتب میں ان دونوں خطوط کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے کتاب ’نبوی عہد کی سیاسی دستاویزات‘ کے مصنف کا بیان ہے کہ اس نے یہ خطوط مختلف تاریخ کی کتب جیسے طبری، قلعشندی، ابن کثیر اور دیگر کتب سے حاصل کئے ہیں، اس نے یہ نہیں بتلایا کہ اس نے کس حدیث کی کتاب سے ان کو حاصل کیا ہے۔ تاریخ کی کتب کو قابل اعتبار تسلیم نہیں کیا جاتا کیونکہ تاریخ کی کتب روایت کی اسناد پر توجہ نہیں دیتی ہیں جس طرح حدیث کی کتابوں میں حدیث کی روایت کے متعلق دی جاتی ہے ان کی مثال تو اس لکڑہارے جیسی ہے جو رات کے اندھیرے میں ہر طرح کی خشک و تر لکڑیوں کو جمع کرتا ہے جسے پتہ نہیں چل پاتا کہ اس کے ہاتھوں میں درخت کی شاخ آئی ہے یا کوئی سانپ ہے، اس طرح یہ دونوں خطوط کوئی وقعت نہیں رکھتے اور اس حکم کی خاطر کسی بھی طرح استعمال کے لائق نہیں ہیں، اور ان کے متعلق اہم یہ ہے کہ یہ انس بن مالکؓ کی روایت کردہ حدیث سے مناقص ہیں جو مسلم

شریف میں مروی ہے اور مزید یہ کہ دونوں ام سلمہؓ کے بیان سے بھی متناقض ہیں جو انہوں نے نجاشی اور حبشہ کے مہاجرین کے متعلق فرمایا جن میں آخری لوٹنے والوں میں جعفر بن ابی طالبؓ تھے جنہوں نے نجاشی کے قبول اسلام کے متعلق کچھ بھی تذکرہ نہیں کیا حالانکہ جعفرؓ ہجرت کے ساتویں سال میں خیبر کی فتح کے بعد آپ ﷺ کے پاس واپس ہوئے اور یہ واپسی آپ ﷺ کے ذریعے تمام بادشاہوں اور شہزادوں کو خطوط بھیج دیئے جانے کے عرصہ بعد ہوئی تھی، چنانچہ یہ دونوں خطوط صحیح نہیں ہیں اور ان سے حکم اخذ کرنا تو کسی صورت صحیح نہیں ہے۔ لہذا وہ دونوں خطوط دلائل کے طور پر مسترد ہیں، ان تمام وقائع سے ایک بات صاف ظاہر ہے کہ وہ نجاشی جس نے اسلام قبول کیا تھا اور اُس کی نماز جنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی تھی اور وہ نجاشی جس کے دور میں نبی کریم ﷺ نے صحابہ کو حبشہ ہجرت کی اجازت دی تھی اور مدینہ ہجرت کے چھٹے سال کے اواخر اور ساتویں سال کے شروعات کے دوران عمر بن امیہ الضمری کے ہمراہ اُس کی جانب خط لکھ بھیجا تھا اور اسلام کی طرف دعوت دی تھی یہ دونوں نجاشی ایک فرد نہیں ہیں بلکہ یہ دونوں الگ الگ افراد ہیں۔ بلکہ یہ وہ نجاشی ہے جس نے حبشہ کا اقتدار اس سے قبل کے اُس نجاشی کی موت کے بعد حاصل کیا تھا جس کی جانب نبی کریم ﷺ نے خط لکھ بھیجا تھا اور اسلام کی دعوت دی تھی۔

النجاشی جس نے اسلام قبول کیا تھا وہ دراصل ہجرت کے ساتویں سال میں برسر اقتدار ہوا کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اپنے قاصدوں کو پیغامات دے کر حاکموں اور بادشاہوں کے پاس بھیجا تھا اور نجاشی بھی ان بادشاہوں میں سے ایک تھا جن کو حدیبیہ کے سفر سے آجانے کے بعد رسول ﷺ نے خطوط بھیجے، مدینہ ہجرت کے چھٹے سال کے اواخر میں ذی الحجہ کے ماہ میں مراسلہ کا یہ کام انجام پایا، اس خط کا مخاطب یہ اول نجاشی ساتویں سال میں فوت ہوا ہو گا اور اس دوران جس دوسرے نجاشی نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ برسر اقتدار آیا اور یہی وہ نجاشی بادشاہ تھا جس کی صلوة الجنازہ نبی کریم ﷺ نے پڑھائی

تھی اور جس کی موت فتح مکہ سے قبل ہجرت کے آٹھویں سال میں واقع ہوئی جیسا کہ الیہقی نے اپنی کتاب ”دلائل النبوة“ میں بیان کیا ہے۔

چنانچہ جس دور میں وہ برسرِ اقتدار آیا، اسلام قبول کیا، اور فوت ہوا دراصل سب کچھ ایک قلیل مدت میں ہوا اور اس نے خفیہ طور پر اسلام قبول کر لیا تھا سوائے اس کے کوئی اس بات کو جانتا نہ تھا، حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ بھی اس کے متعلق اور اس کی موت کے متعلق نہیں جانتے تھے۔ نبی کریم ﷺ کو وحی کے ذریعے اس کی موت اور قبول اسلام کی اطلاع دی گئی یعنی جس دن اس کی وفات واقع ہوئی تھی، جیسا کہ بخاری کی ان چھ احادیث کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے نجاشی کی موت کے متعلق روایت کی ہیں۔ اس مختصر وقت میں جس میں نو مسلم نجاشی نے اپنی زندگی بحیثیت مسلمان گذاری، اُس میں مسلم نجاشی کو اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ اسلام کے تمام احکام جان پاتا اور نبی کریم ﷺ کا اس کے متعلق علم نہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس نجاشی کو ایسی کوئی تفصیل لکھ کر نہیں بھیجی جو اسے بتلائے کہ اُسے کیا عمل کرنا چاہئے۔

لہذا یہ واقعہ اس وجہ سے دلیل کے طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں ہے، بالخصوص ان کے لئے جو کفر حکومتوں میں شرکت اختیار کرنا جائز قرار دیتے ہیں اور جو کہ اللہ کے نازل کردہ کے علاوہ یا اس کی بجائے دوسرے احکامات کے تحت حکومت کرتی ہیں، چنانچہ ان کا دعویٰ باطل ہو جاتا ہے۔

## اعتدال پسندی اور شدت پسندی

اسلام کے خلاف مغرب کی جنگ، مختلف رخ اختیار کرتی اور متنوع میدانوں میں داخل ہوتی ہے، ان سب کے درمیان جامع حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو زمانہ کی حقیقی زندگی سے دور کیا جائے۔ یہ معرکہ صرف اسلام کی صورت کو بگاڑ کر پیش کرنے، خلافت کو تباہ کرنے، اسلامی احکامات کا مذاق اڑانے اور اسلام کو دقیانوسی اور بوسیدہ قدیم بنا کر پیش کرنے تک ہی محدود نہیں تھا، جس کی وجہ سے یہ اس زمانہ کے ہم پلہ نہیں چل سکتا ہو، بلکہ یہ معرکہ ہر اس چیز کو گھیرتا ہے جو اسلام کو پھر سے دنیا کی قیادت کے مقام تک واپس لاسکتی ہے۔ پس وہ اسلام سے مستقل طور پر خطرہ محسوس کرتے ہیں اسی لئے وہ کبھی سازشیں کرتے نہیں تھکتے کہ اگر ایک دفعہ مسلمان اپنے عروج پر واپس ہوئے، ان کے پیروں تلے زمین نکل جائے گی۔

مغرب مسلمانوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسی قوم ہے جس کی زندگی اس کا اسلام ہے اور یہ کہ ان کا دین ایک آفاقی دین ہے جو انسانیت کے لئے موزوں ہے اور ان کے حالات سدھار سکتا ہے اور ان کی روحیں مسلسل وحدت اور یکجہتی کے مواقع ڈھونڈنے کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ اور یہ کہ عنقریب ان کی مختلف ریاستوں کے مختلف اسٹریٹجک علاقے ایک واحد ریاست کے اسٹریٹجک علاقے بن جائیں گے اور جو تمام براعظموں کو اپنی گرفت میں لے گی اور یہ سب پر نظر رکھ سکے گی۔ اور یہ قوم ذرائع و وسائل کے ایسے انبار پر بیٹھی ہوئی ہے جو ایک سپر پاور کو درکار ضروریات و لوازمات سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور ان کی آبادی لگ بھگ دنیا کی تمام آبادی کا ایک تہائی ہے، اور یہ ایسے لوگ



ہیں کہ اگر اللہ ان کو غلبہ دے تو ان کا مقصد مفتوحہ علاقوں کے وسائل کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری نہیں ہوتی، بلکہ ان کا مقصد دلوں کی فتح ہوتا ہے، تمام لوگوں کو کفر کی اندھیریوں سے اسلام کی ہدایت کی طرف نکال کے لے آنا ہی ان کا مطمح نظر ہوگا اور یہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ کسی ایک شخص کا اسلام میں داخل ہونا ان کے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ اس طرح صرف ان کی ایک ریاست دفعتاً ایک طاقتور ریاست کی شکل میں دنیا کی قیادت حاصل کر لے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس کے احکام کے خلاف اور اس کے لئے سنجیدہ کام کرنے والوں کے خلاف کتنی ہی سازشیں دیکھی ہیں، ان سازشوں کا مقصد اہل اسلام اور غیر اہل اسلام پر سے اس کے اثرات کو دور کرنا ہے، جس درجہ وہ خطرات محسوس کرتے ہیں اس کے مطابق منصوبہ بندی اور سازشیں رچائی جاتی ہیں۔

اگر اسلام اللہ کی جانب سے اترا ہوا سچا دین نہ ہوتا تو یہ مٹ چکا ہوتا، روند جاتا اور اس کے نشانات ہی باقی رہ جاتے البتہ اللہ کا ارادہ نافذ ہوتا ہے اور اس کی مشیت ہی غالب ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زوال کے اس بدترین دور میں بھی دین سے وفاداری قائم رکھی ہے، حالانکہ مغرب ان کے معیارات کے بنجے ادھیڑ چکا ہے اور ان کے نظریات و افکار کو بگاڑا ہے اور ان کی ذہنیت کو مسخ کر دیا ہے، یہ تمام اس لئے کہ مغرب نے پہلی صلیبی جنگوں میں دیکھا کہ اسلام مسلمانوں کے دلوں میں اتر چکا ہے اور اس قدر مستحکم ہے کہ اس کو تہس نہس کرنے کی خاطر کوئی بھی کوشش کم ہے، یہی وجہ ہوئی کہ دوسری صلیبی جنگ سے انہوں نے اپنی حکمت عملی اور منصوبہ بندی تبدیل کی، جس کے اثرات ہمیں آج تک پریشان کئے ہوئے ہیں، یہ منصوبہ بندی مسلمانوں کو ان کے دین اسلام سے دور کرنے اور خود صلیبیوں کے افکار و نظریات اور عقائد اور میزانِ عقل کو پھیلانے کی بنیاد پر کی گئی

تاکہ بالآخر انہیں مادی طور پر قابو میں رکھا جاسکے، لہذا پہلے انہوں نے مسلمانوں کے اندر ذہنی غلامی پیدا کی اور پھر اس کے بعد جسمانی طور پر غلبہ حاصل کیا، اس کے بعد انہوں نے اپنے پٹھو بٹھائے اور ان پٹھوؤں کے ارد گرد بددیانت سیاسی و فکری میڈیم کا جال پھیلا دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ساتھ ریاستوں کو اس حکمت عملی کے تحت جوڑنے لگے کہ دنیا کے ہر علاقہ کی ریاستی پالیسی صرف اسی کے مفاد کے لئے ایک ہی رخ پہ چلتی رہے، اس طرح دنیا کو ایک مشترکہ کمپنی بنائی جائے جہاں مالدار اور پیداواری خطہ مغرب ہو، جبکہ اس تشکیل میں دنیا کے دوسرے ممالک مزدور اور صارف بن کر رہ جائیں۔ اس نے دنیا کو ذرائع ابلاغ کے غیر معمولی جال میں اس طرح بٹن دیا کہ دنیا کے دوسرے ذرائع ابلاغ کو ان کا غلام بنایا اور یہ اسی کے میڈیا پر انحصار کرنے لگے، اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ہم وہی کچھ پڑھیں اور وہی جانیں جو وہ لکھتے اور ہمیں بتلانا چاہتے ہیں اور وہی کچھ سنیں جو وہ نشر کرتے ہوں اور وہی دیکھیں جو وہ دکھانا چاہتے ہوں، امور کے بارے میں ہماری گفتگو یا ان کے بارے میں ہماری سمجھ ان کی چاہت اور ان کی نظریات و افکار کی روشنی میں ہو۔ یہ ایک جدید ترقی یافتہ استعمار ہے (نو آبادیاتی نظام ہے)، یہ قدیم استعمار سے زیادہ بھیانک اور بدترین ہے۔ اس سے قبل کا نو آبادیاتی نظام انسانوں کو ظاہری طور پر غلام بناتا تھا، جبکہ یہ نیا نو آبادیاتی نظام انسان کو آدھا اندرونی طور پر اور آدھا بیرونی طور پر غلام بنالیتا ہے تاکہ دنیا اس کی مستقل و مطلق غلام ہو جائے، اور اس کو کسی قسم کا خطرہ نہ ہو۔

حتیٰ کہ مغرب چاہتا ہے کہ ہم اپنا دین بھی اس کے نقطہ نظر اور اس کی خواہش کے مطابق سمجھیں، جو کوئی اس نقطہ نظر سے علیحدہ ہو جائے تو اس کے خلاف اپنے ذرائع ابلاغ کو تیار کرتا ہے اس طرح وہ اسلام کی ایسی غیر فطری صورت پیش کرتا ہے جس کے ذریعے اسلامی روایات میں رخنہ اندازی کی جاسکے، مسلمانوں کے ہاں جانے پہچانے اصول سے انحراف کیا جائے اور امت میں موجود اتفاق کو توڑا جاسکے، وہ اسلام کو دہشت گردی، انتہا پسندی، بنیاد پرستی، تعصب پسندی کی حوصلہ افزائی کرنے والا

دین بتلاتا ہے۔ وہ دین کو انسانیت کا دشمن ظاہر کرتا ہے جو تاریکی کو بڑھا دیتا ہے اور تاریکی میں زندگی گزارنے کے لئے ابھارتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہ وہ جارحیت پر آمادہ، نفرت و دشمنی بھڑکانے والا دین ہے۔ دین کی تصویر مسخ کرنے اور حقائق کو توڑنے مروڑنے کے بعد حکومتیں اس سوچ کے ساتھ کہ یہ دین اسی سلوک کے لائق ہے دین پر حملہ کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ ان تمام کرتوتوں کو انجام دیتے وقت وہ لوگوں کی حقائق و واقعات سے متعلق لاعلمی اور ایسے علماء کی مدد لیتے ہیں جو مغرب کے ہر عمل کو متبرک بتلاتے ہیں اور اس کی منظوری دیتے ہیں۔ مگر جو بیداری آج ہمیں نظر آتی ہے وہ امت کے جسم میں سرایت کرنے لگی ہے اس نے دین کے خلاف ان کی کارکردگیوں کو مشکل کر دیا ہے اور امت کو اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے کہ امت اب مغرب کو، ان نام نہاد حکمرانوں اور بددیانت علماء کو ایک ہی نظر سے دیکھنے لگی ہے، کہ مغرب شیطان ہے اور حکمران اس شیطان اکبر کے حواری ہیں اور سمجھنے لگی ہے کہ ان علماء نے اپنا مقام اتنا ہی حاصل کیا جتنا انہوں نے ان حکمرانوں کے چوکھٹ پر دین کی عزت کو نچھاور کر دیا، جس درجہ انہوں نے دین کو شرمندہ کیا اس درجہ انہیں ترقی دی گئی اور یہ علماء زوال کے دور کے علماء ہیں اور امت کے زوال کے خاتمہ کے ساتھ ان تمام علماء کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، صحیح اسلامی نشاۃ ثانیہ کے علماء گرد آلود اور پر آگندہ بالوں والے ہونگے لیکن تقویٰ اور اخلاص میں قرینہ رکھتے ہونگے۔

آج ہم اس مرحلہ میں ہیں جب مغرب اور ان کے پٹھو حکمران اسلام کے پلٹ آنے کے متعلق حقیقی خوف میں مبتلا ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ اسلام کی ہر ایک دعوت کے متعلق حساس ہو چکے ہیں اور وہ اس کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ لہذا وہ اسے روکنے کے لئے تمام حربے استعمال کر رہے ہیں اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے فریب دہی اور پروپیگنڈہ کے ذریعے اس کے خلاف ہر قسم کے الزامات عائد کر رہے ہیں اور حتیٰ کہ اس کام میں علماء کی خدمات بھی استعمال کی جا رہی ہے، لہذا انہوں نے ہر اس جماعت کو جو صرف اسلام کی طرف دعوت دے رہی ہے انتہا پسند اور دہشت پسند کا نام دے دیا ہے،

مسلم دانشوران اور وطن پرست اور محب وطن قسم کے مصنفوں نے ایسی کتابیں تصنیف کی ہیں اور ایسے لیکچرز دئے جو انتہا پسندی کو چھوڑ کر اس کی بجائے میانہ روی یا نرمی اختیار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اس پہلو سے متعلق یہ تمام ایک ہی نقطہ نظر سے آغاز کرتے ہیں اور یہ صرف مغربی نقطہ نظر ہے۔ اگر ایسے مسلم علماء نہ ہوتے جو اس جنگ میں اُن کے ساتھ شریک ہیں اور مغربی نقطہ نظر کو جائز قرار دیتے ہیں اور اس کو ایک قابل قبول سمت دیتے ہیں تو ان کو جواب دینے کے کام کی ذمہ داری ہم اپنے سر نہ لیتے۔ یہ اس لئے کیونکہ علماء کو جو حیثیت مسلمانوں کے نزدیک حاصل ہے، مسلمانوں کے کسی دوسرے طبقے کو امت کی نظر میں وہ مقام حاصل نہیں اور ان کا رتبہ ایک حاکم کی طرح ہوتا ہے۔ بلاشبہ ان کے حملوں کا الٹ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے حتیٰ کہ یہ علماء خود عوام سے دور ہوتے چلے گئے اور امت نے بھی ان سے اپنا رخ موڑنا شروع کر دیا کیونکہ انہوں نے بارہا ایسی وضاحتیں دیں جس میں کوئی سچائی کی علامات نہیں تھیں اور ان کے فتاویٰ باضابطہ شرعی اصولوں سے انحراف کرتے تھے اور آخری مرحلوں میں وہ نہ صرف امت میں موجود عام اسلامی شعور کے خلاف ہو گئے بلکہ انہوں نے ایسی شرعی نصوص کو معطل کر کے رکھ دیا، جن کے ثبوت اور ان پر عمل کے متعلق امت متفقہ رائے رکھتی ہے، ان فتاویٰ میں سے کچھ تو اس حد تک پہنچے کہ وہ منکرات کا حکم اور معروف سے روکتے تھے، والعیاذ باللہ! یہ علماء اسلام کے لئے ان نئے اور اجنبی افکار اور تصورات کو پیش کرتے ہوئے جو جوش و ولولہ دکھاتے ہیں وہ اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے مقصد سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ان کے حکمرانوں اور ان کے آقاؤں کی خوشنودی اور خوشامد کے لئے ہوتا ہے، اپنے خطاب میں جب وہ مسلمانوں کے لئے فکر مند ہوتے ہیں اور اسلامی دعوت کے مفاد کا اظہار کرتے ہیں تو امت بھی ان کی اس خام خیالی کے باطل پن کو سمجھنے لگی ہے اور حق سے اُن کے انحراف کو پہچاننے لگی ہے جو اس گمراہی کی حمایت کرتے ہیں۔

اس تعارف کے بعد جو 'انتہا پسندی اور میانہ روی' کے موضوع کی حقیقت جاننے کے لئے ضروری تھا، اس کو اسلام کے نقطہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ مسلمان بغیر کسی شک و شبہ کے حق کو پہچان سکیں، کیونکہ تنہا جذبات کے استعمال سے صحیح اور حقیقی نقطہ نظر کو متعین نہیں کیا جاسکتا ہے، لہذا ہم اپنی عادت کے مطابق اس موضوع کے متعلق شرعی اصولوں کے مطابق چلیں گے تاکہ اس معاملہ میں بھی ہم اسلامی بنیاد سے ہم آہنگ رہیں اور وہ بنیاد ہمارا اسلامی "عقیدہ" ہے۔

اسلام دنیا میں جو آیا ہے تو وہ ایک کل کی حیثیت سے انسانی مسائل کی خاطر آیا ہے، لہذا اسلام نے انسان کا اپنی ذات سے تعلق کو "اخلاق"، "مطعمات" (غذائیں) اور لباس سے متعلق احکامات کے ذریعے حل کیا، اسی طرح انسان کا دوسرے لوگوں سے تعلق 'معاملات' (لین دین) اور 'معقوبات' (سزاؤں) کے ذریعے باضابطہ بنادیا ہے، اس کے علاوہ انسان کے خالق سے تعلق کو 'عقائد' اور 'عبادات' کے تحت منظم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کے ہر ایک فعل کے متعلق اسلام ایک جامع حل پیش کرتا ہے، چنانچہ اسلام ایک ایسی جامع فکر ہے جو زندگی کے متعلق تمام معاملات کا حل پیش کر سکتی ہے۔

مزید اسلام کا ڈھانچہ ایک مکمل ڈھانچہ ہے جو ایک ایسی بنیاد پر قائم ہے جس سے تمام حل نکلتے ہیں اور اس بنیاد پر ہی اس کے تمام افکار تعمیر ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اسلام کے تصورات و نظریات، یقین، اور پیمانے سب کے سب اسی نوع کے قبیل سے ہوتے ہیں جو نوعیت بنیادی اسلامی فکر یعنی عقیدہ کی ہے۔ اس کی مزید تشریح میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کے اللہ تعالیٰ پر ایمان کی بنیاد پر اسلام قائم ہوتا ہے، جو الخالق، المدبر (تدبیر کرنے والا) ہے اور یہ کہ انسان کمزور اور ناقص ہے، اس کی ذات حاجتمند اور محدود ہوتی ہے جو حل پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے

اپنے نبی کریم ﷺ کو بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو بتلائیں کہ اللہ کون ہے، المعبود کون ہے اور اس کی عبادت کس طرح کی جائے اور عبادت کرنے نہ کرنے کے نتائج جزا و سزا کی صورت میں آخرت میں کیا ہونگے؟ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے تمام افعال کے لئے ایک ہی معیار مقرر کر لیتا ہے اور یہ معیار حلال و حرام کا معیار ہے۔ اس طرح اس کی عقل شرعی نصوص کے درمیان ثالث کی حیثیت نہیں اختیار کرتی اور نہ ہی نصوص کے ہمراہ قانون سازی کا ارتکاب کرتی ہے، بلکہ عقل صرف شرعی نصوص کے مدلولات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ نصوص جو حل دیتی ہیں وہ اللہ کی نازل کردہ ہوتی ہیں، اور عمل میں انسان کا حصہ صرف اتنا ہے کہ وہ نص کو سمجھے اور اس کی پابندی کرے، نصوص کو سمجھتے وقت کبھی غلطی بھی کرتا ہے اور کبھی درست رائے تک پہنچ جاتا ہے، مگر دونوں حالات میں اسے اجر ملے گا، بشرطیکہ اس نے شرعی طریقہ اجتہاد کی تعمیل کی ہوگی۔

یہاں سے نصوص کے اثبات کے لئے مسلمانوں کا حد درجہ اہتمام سمجھ میں آتا ہے اور جس کے نتیجے میں علم حدیث کی تدوین ہوئی اور اسی بات سے نصوص کی مراد سمجھنے میں مسلمانوں کا نہایت اہتمام کرنا سمجھ میں آتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ 'اصول الفقہ' کی تدوین ہوئی۔ اور اس کے اصولوں میں سے کچھ منضبط ہوئے کہ "اللہ ہی حاکم (فیصلہ کرنے والا) ہے"، "تمام افعال اور چیزوں کی بنیاد صرف شرعی نصوص کی اطاعت پر ہے"، "حسن (اچھا) وہ ہے جس کو شرع حسن مانے اور قبیح یا برا وہ ہے جس کو شرع برا تسلیم کرے"، "معروف وہ ہے جو اللہ کو راضی کرے اور منکر وہ ہے جس سے اللہ ناراض ہو"۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان کا یقین ہوتا ہے کہ اس کی خوشی اللہ کی رضا حاصل کرنے میں ہے اور اس کا اطمینان اور چین اس کی اپنی ذاتی ضروریات اور جبلتوں کو اللہ پر ایمان کے تحت اللہ کی شرع کے حکم کے مطابق پورا کرنے سے حاصل ہوتا ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام کا ڈھانچہ اور عمارت ایک مکمل اور جامع عمارت ہے جس میں اس کے تمام افکار اس کی بنیاد پر قائم اور آپس میں مکمل

ہم آہنگ ہیں اور یہ بنیاد جس چیز کو تسلیم کرے اس کو قبول کیا جاتا ہے اور جو کچھ بھی اس بنیاد سے متناقض ہو اس کو مسترد کر دیا جاتا ہے۔

زندگی کے نقطہ نظر سے متعلق مکمل حل دینے کے متعلق جو کچھ اسلام پر منطبق ہوتا ہے وہ سرمایہ دارانہ نظام یعنی کیپیٹل ازم کے افکار پر بھی صادق آتا ہے، کیونکہ کیپیٹل ازم (سرمایہ دارانہ نظام) ایک مبدئی (آئیڈیالوجیکل) فکر ہے جو اپنے نظریاتی ڈھانچے کے اعتبار سے ہم آہنگ ہے، لہذا اسے یا تو مکمل طور پر اختیار کیا جاتا ہے یا مکمل طور پر مسترد کیا جاتا ہے۔ دین کو دنیا سے علیحدہ کرنے کی سوچ وہ بنیاد تشکیل دیتی ہے جس سے اس کے تمام حل نکلتے ہیں اور اُس بنیاد پر اس کے تمام افکار تعمیر ہوتے ہیں۔ دین کو دنیا سے علیحدہ کرنے کی سوچ جس کی تعمیر ایک مفاہمت اور سمجھوتے کے حل پر ہوئی، اس نے انسان کو یہ ایمان دلایا کہ انسان خود اپنا آقا اور مالک ہے۔ لہذا اس کی خود مختاری کو حاصل کرنے کی خاطر ضروری تھا کہ اس پر سے ہر قسم کی نگرانی اور سرپرستی کو اٹھایا جائے، لہذا یہ طے پایا کہ ایسی خود مختاری تب تک حاصل نہیں کی جاسکتی جب تک انسان اُن چار آزادیوں پر عمل کرنے والا نہ بن جائے، چنانچہ انسان کے نزدیک نظریہ آزادی نے جڑ پکڑ لیا، جس کے انسان کے نزدیک ایک مخصوص معنی ہیں اور خود کا آقا بننے سے مراد ہے کہ اسے جدوجہد کرنا چاہئے کہ وہ اپنی بنیادی ضرورتیں اپنی مرضی اور نقطہ نظر کے مطابق پورا کرے اور کسی بیرونی نقطہ نظر کے قابو میں نہ رہے، چاہے وہ نقطہ نظر اس کے مذہب سے جڑا ہوا ہو یا نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں جمہوریت پیدا ہوئی ہے، چنانچہ جو دین کو دنیا سے علیحدہ کرنے کی سوچ کو اپناتا ہے وہ سوچتا ہے کہ خوشی اسے تب حاصل ہوتی ہے جب وہ بڑی مقدار میں زندگی سے لطف اندوز ہو۔ چنانچہ اس کا ذہن جس کسی بھی شے کو نفع بخش سمجھتا ہے اس کو حاصل کرنا اس کے افعال کا مقصد بن جاتا ہے کیونکہ اس کی عقل اب خود مختار اور قانون ساز ہوتی ہے۔

افکار جب ہم جنس یعنی یکساں ہوتے ہیں تو وہ کسی بھی ملاوٹ کو قبول نہیں کرتے۔ ملاوٹ شرعی معنوں میں شرک کہلاتی ہے جو کفریہ شرک ہوتی ہے یا معصیت کی شرک ہوتی ہے۔

جس طرح اسلام جمہوریت کو قبول نہیں کرتا کیونکہ جمہوریت میں عوام حکمران ہوتے ہیں، جبکہ اسلام میں حکمرانی صرف شرع تک محدود ہوتی ہے، اسی طرح سرمایہ دارانہ جمہوری فکر اسلام کے حق میں اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ وہ طاقت و اقتدار حاصل کر لے، کیونکہ اسلام کو قبول کرنے کے معنی ہونگے کہ جمہوریت اور اس سے نکلے تمام افکار کو معطل کر دینا۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب نے بنیادی تبدیلی کی تجویز اور اقتدار تک رسائی کے لئے کام کرنے والی اسلامی تحریکات کے خلاف مستقل جنگ چھیڑ رکھی ہے، مغرب انہیں اپنے وجود کے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے اور اسے ڈر ہے کہ یہ اس کی جڑ کا خاتمہ کر دیں گی، اس حکمت عملی کے تحت مغرب ان سے جنگ کرتا ہے اور ان کے خلاف جارحیت اور تشدد اپناتا ہے اور انہیں اپنا ازلی دشمن تسلیم کرتا ہے اور انہیں مختلف نام دے کر بدنام کرتا ہے۔ وہ انہیں بنیاد پرست کا نام دیتا ہے کیونکہ وہ ان اصولوں کو بنیاد بناتے ہیں جو مغرب کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے، وہ انہیں انتہا پسند ہونے کا الزام دیتا ہے کیونکہ وہ مغرب سے معاملات طے کرنے اور سمجھوتہ کرنے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ ان کے درمیان کوئی مشترک معاملات نہیں ہیں اور انہیں متعصب اس لئے کہتا ہے کیونکہ وہ مغرب کی پیشکش کی کوئی قدر دانی نہیں کرتے اور اس کے وجود کو بھی قبول نہیں کرتے۔ ہم اگر اس معاملہ کی چھان بین کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب جن ناموں سے ان کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے دراصل وہ خود ان کاموں میں ملوث ہے اور اس کو وہ تمام نام دے جاسکتے ہیں جو وہ دوسروں کو دیتا ہے۔ مغرب کو اپنی سرشت میں ایک بنیاد پرست سمجھا جاتا ہے کیونکہ وہ ایک مخصوص بنیاد پر قائم ہے جس پر اسے مکمل یقین ہے اور اس کے مخالف کسی بھی بنیاد کو تسلیم نہیں کرتا جو اس کے مقابل ہو سکے۔ حالانکہ جمہوریت جس کی مغرب تبلیغ و حمایت کرتا ہے اجازت دیتی ہے



کہ دوسرے بھی اقتدار حاصل کر لیں بشرطیکہ لوگ اس کو منتخب کریں، اس کے علاوہ وہ انتہا پسند، دہشت گرد اور متعصب اس لئے ہے کیونکہ وہ سیاسی اسلام کے وجود کا احترام نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی اس کے لئے مشترک معاملات پر ایک ہونا ممکن ہے۔ کتنی ہی بار مغرب نے اپنے ہی نظریہ زندگی کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ کچھ کیا ہے جس کی الزام تراشی وہ دوسروں پر کیا کرتا ہے؟ یہ کس قسم کی جمہوریت ہے جو الیکشن کو اس لئے رد کر دیتی ہے تاکہ جمہوریت (عوامی حکومت) کی بجائے حکمرانوں کی آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کو لوگوں پر مسلط کیا جائے، کیا مغرب کی نظر میں عوام کی رائے کا اظہار اس طریقے سے کیا جاتا ہے؟

چنانچہ اگر ہم کسی نقطہ نظر کے متعلق یہ متعین کرنا چاہتے ہوں کہ وہ صحیح ہے یا غلط تو ہمیں اس کی بنیاد کو جاننا ہو گا اور اس کی اچھی جانچ کرنی ہو گی اور اسی بنیاد پر اس کو پرکھنا ہو گا، یہ ممکن نہیں ہے کہ جزوی افکار کو اس کی بنیاد کے علاوہ کسی دوسری بنیاد پر پرکھا جائے، مثال کے طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام میں خوشی کے حصول کے لئے بڑی مقدار میں نفسانی تشفی و تسکین یا نفسانی لطف حاصل ہونا لازم ہے اور نہ ہی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اس نظریہ آزادی پر یقین رکھتے ہیں جس پر مغرب کا ایمان ہے کیونکہ اسلامی بنیاد ان افکار کو تسلیم نہیں کرتی ہے اور نہ ہی ان کو جائز قرار دیتی ہے، وہ جو اسلام کو ایک عقیدہ اور بنیاد کے طور پر اختیار کرتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اس سے نکلنے والے تمام افکار کو تسلیم کرے اور اسلام کو پورا کا پورا اختیار کر لے یعنی اسلام میں پورا کا پورا داخل ہو جائے کیونکہ اس کے کچھ حصے کو چھوڑنا پورے اسلام کو چھوڑنا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿أَفْتَوْنُونَ بَبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَى أَشَدِّ الْعَذَابِ﴾

{البقرة: 85} "تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے

ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگی کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پلٹا دیئے جائیں۔“

اس نقطہ نظر سے ہم اسلام کے متعلق مغربی ریاستوں کی طرف سے اس قسم کی باتوں کو رد کرتے ہیں کہ اسلام رواداری اور معتدل دین ہے اور یہ دین انتہا پسندی کو منع کرتا ہے، یہ جملہ ان کا سچ ہے لیکن اس کے پس پشت ان کا شیطانی مقصد کارفرما ہے کیونکہ مغرب اپنی فاسد بنیاد پر جما ہوا ہے اور اسی پر مزید آگے بڑھتا ہے۔

اس طرح تطرُف (انتہا پسندی) اور غلو (زیادتی) اور اسراف یا افراط وہ شرعی الفاظ ہیں جنہیں اسلامی شریعت نے مخصوص معنی پہنائے ہیں اور ایک مسلمان اگر ان سے متفق نہیں ہوتا ہے تو وہ گناہگار ہوتا ہے، اسی طرح اعتدال اور اقتصاد (میانہ روی)، استقامت اور میانہ روی بھی اپنی شرعی معنی کے ساتھ اسلام میں موجود ہیں جن کا پابند ہونا مسلمان کے لئے لازمی ہے، اسی طرح اس کا اطلاق لفظ تفریط (کمی) اور تساہل (لا پرواہی) پر بھی ہوتا ہے، جب ہم ان الفاظ کے متعلق شرع کا حکم جاننا چاہتے ہوں تو ہم ان عقائد اور افکار کی بنا پر ان الفاظ کی تشریح اور ان کی سمجھ اختیار نہیں کر سکتے جس پر ایک سرمایہ دار (کیپٹلسٹ) کا یقین ہوتا ہے۔ ایسا کرنا حرام ہے اور یہ مغرب اور اس کے افکار کی خدمت ہے اور مغرب کے مقصد کی تکمیل کرتا ہے، ایسا کرنا ان اسلامی افکار اور اسلام کے متعلق فیصلہ کے لئے اسلام اور اس کے نظریات کی بنیاد کے علاوہ دوسری بنیادوں کو رجوع کرنا ہے۔

ایسے متعدد شرعی احکام ہیں جن کو اختیار کرنا مسلمان کے لئے لازم ہے اگر وہ انہیں چھوڑ دے تو گناہگار ہو گا لیکن مغرب انہیں اختیار کرنے کو انتہا پسندی، مجنونانہ جوش پسندی اور دہشت پسندی قرار دیتا ہے، مثال کے طور پر اللہ کی راہ میں جہاد کرنا، خلافت کے دوبارہ قیام کی جدوجہد کرنا، امر بالمعروف و

نہی عن المنکر کرنا جس میں حکمران کو نصیحت کرنا اور حق بات کہنا بھی شامل ہے، کفر کی مخالفت کرنا، اسلامی دعوت انجام دینا، جمہوریت کو مسترد کر دینا، سودی لین دین کو حرام کرنا، عورتوں کا حجاب اختیار کرنا اور اسی طرح دیگر مختلف فرائض جو ایک مسلمان کے لئے انجام دینا لازمی ہے، کیا ہمارے لئے جائز ہے کہ ہم ان معاملات پر مغرب کے فاسد اور بدبو دار نظریات کے مطابق فیصلہ کریں۔ بھی جن نظریات کی پیروی کرنے والوں کو انہیں اپنانے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا تو دوسروں کو ان نظریات کو اپنا کر کیا فائدے حاصل ہو جائیں گے؟ مزید سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان کے لئے جائز ہے کہ مغرب جن نظریات کا حامی ہو مسلمان بھی ان کی حمایت کرے؟

اس طرح لازمی طور پر ہمیں مغرب کے انتہا پسندی اور میانہ روی کے متعلق نظریات کو رد کرنا ہوگا، ہمیں ہمارے دین کے معاملات میں مغربی مداخلت کو مسترد کرنا ہوگا اور یہی وجہ رہی کہ آغاز سے یہ بحث شرعی نقطہ نظر سے نہیں آگے بڑھی، بلکہ یہ ایک سیاسی نقطہ نظر ہے جس کا مقصد امت میں دراڑیں ڈال کر انہیں مغربی مفاد کے لئے فائدہ مند سمت دینا ہے، یہ بحث لوگوں کے ذہنوں کی نوآبادیاتی غلامی برقرار رکھنے سے متعلق ہے۔

آج ہمیں لازمی طور پر اس موضوع کے متعلق اسلامی رائے کو شرعی نقطہ نظر سے سمجھنے کی کوشش کرنا ہوگا تاکہ دعوت میں مددگار ہو اور ہمیں اللہ سے مزید قربت دلا سکے۔

غلو (انتہا پسندی) اضافہ اور زیادتی کو کہتے ہیں۔ مذہبیت میں المغالہ کے معنی سختی و شدت پسندی میں شرع کی معین حد کے حکم سے تجاوز کرنا ہے اس کو افراط بھی کہتے ہیں مغالہ کے برعکس تفریط (غفلت) ہے جو لفظ فطر سے حاصل ہوتا ہے، معاملات میں تفریط کے معنی 'مطلوبہ مقدار سے کچھ کمی واقع ہونا' ہے، ضائع کرنا، اس میں کمزوری ظاہر کرنا ہے، دین میں تفریط کے معنی دین کے احکام

میں غفلت برتنا ہے، اس کے حقوق کو ضائع کرنا ہے، اور ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کمزوری جتنا نا ہے، اس بحث سے بیان ’لا افراط و لا تفریط فی الاسلام‘ حاصل ہوتا ہے اس کے معنی ہیں کہ اسلام میں نہ شدت پسندی ہے اور نہ ہی غفلت پسندی ہے۔

جہاں تک لفظ اقتصاد کا تعلق ہے تو یہ توسط، اعتدال، رشد اور استقامت ہے، دین میں معتدل وہ ہے جو اللہ کے احکام کی پابندی کرتا ہے اور اس راہ سے منحرف ہو کر نہ تو وہ افراط کرتا ہے اور نہ ہی وہ تفریط کرتا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ﴾ {مائدہ: 66} "(اگرچہ) ان میں ایک جماعت راہِ راست پر چلنے والی بھی ہے، مگر ان میں سے بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ ان کے اعمال خراب ہیں۔"

اس کی تفسیر یہ ہے کہ یہ ایک امت معتدلہ ہے جو اپنے رب کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے میانہ روی اختیار کرتی ہے جس کے لئے اللہ کا حکم ہے، الفیومیؒ اپنی کتاب ’المصباح المنیر‘ میں بیان کرتے ہیں کہ ”قصد فی الامر قصداً“ کے معنی ہوتے ہیں کہ اس نے درمیانی راستہ اختیار کیا، موزوں و مناسب کی تلاش کی اور حد سے زیادتی نہیں کی۔“

کوئی بھی جو ان اصطلاحات کی جانچ کرے تو سمجھ جائے گا کہ مسلمان سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اللہ کی حدود کی پابندی کرے اور اس کی معین کردہ حدود سے زیادتی و تجاوز نہ کرے، اور اسے اللہ کے حکم پر معتدل اور درست انداز سے رہنا چاہیے، اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: ((قل آمنت بالله ثم استقیم)) (رواہ مسلم و غیرہ) "کہو میں اللہ پر ایمان لایا ہوں، پھر اسی پر جیسے رہو۔"

اللہ نے جس کا حکم دیا ہے اسکی پابندی کرنا اور اُس سے باز رہنا جس سے منع فرمایا اور حرام کیا ہے۔ 'فاستقم' سے یہاں مراد 'اِتَّقِ' (اللہ کا خوف کرنا) ہے، چنانچہ اللہ کا ارشاد اس کے معنی کی وضاحت کرتا ہے ﴿وَاسْتَقِمَّ كَمَا أَمَرْتَ﴾ {الشوریٰ: 15} "(اسی دین پر) جیسے رہو"۔

پس اللہ ہی ہے جو حکم کرتا ہے اور مسلمان اس حکم کو بجالاتا ہے اور حکم کی پابندی کرتا ہے، مسلمان تقویٰ کی راہ اور صراطِ مستقیم کو خود جاننے سے قاصر ہے۔ اگر وہ اپنی مرضی پر چلے تو اس نے اپنی خواہشات اور وہم کی پیروی کی۔ اور وہ جس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اس نے واضح طور پر گمراہی اختیار کی۔ چنانچہ اللہ کے احکام کی پیروی کرنے اور اس کے احکام پر خود کو پابند کرنے اور خود کو احکام کی حدوں تک محدود کرنے اور زیادتی خواہ مطلوب عمل سے زیادہ کرنے یا اس سے کم کرنے کے متعلق ہو ایسی زیادتی سے گریز کرنے کے علاوہ کسی اور طریقہ سے استقامت حاصل نہیں کی جاسکتی ہے، اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے لازم ہو گا کہ ہم اس کی اساس یعنی بنیاد کو سمجھیں۔

مسلمان اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اسلام جو حل لے کر آیا ہے وہ اس کی فطرت کے مطابق ہے جو اللہ نے اس کی ذات کے اندر رکھی ہے کیونکہ یہ فطرت خالق نے پیدا کی ہے اور اس کی خصوصیات مقرر کئے اور وہ سب کچھ تخلیق فرمایا جو اس فطرت کے لئے بہتر تھی، ساتھ ہی مسلمان کا یقین ہوتا ہے کہ دوسرے مذاہب یا نظریہ زندگی جو حل پیش کرتے ہیں وہ تمام ناقص ہیں، غلطی پر ہیں اور گمراہ ہیں اور یہ تمام تباہی اور بربادی کی دعوت دیتے ہیں اور انسان کے لئے باعثِ اطمینان و سکون ہر گز نہیں ہو سکتے ہیں، یہ یقین یا تو اس بنا پر ہوتا ہے کہ انسان ناقص ہے اور یہ تمام حل اسی ناقص انسان کے پیش کردہ ہیں جو خود محتاج اور اس کا وجود خود کسی اور کے وجود پر منحصر ہے، فطرتاً کمزور، جلد باز اور محدود ہے اور جس کا ذہن خود اس کی ذاتِ انسانی کی حقیقت کا مکمل ادراک نہیں کر سکتا

اور نتیجتاً کسی جامع حل کو پیش نہیں کر پاتا ہے۔ یا پھر یوں ہو سکتا ہے کہ وہ حل الہامی ہو لیکن وہ ایک مخصوص زمانہ کے لئے اور مخصوص لوگوں کے لئے اُتارے گئے ہوں اور تمام لوگوں کے لئے نہیں ہوں اور ساتھ ہی اُن کی حقیقت یہ ہے کہ انسانی افعال نے ان میں بھی ملاوٹیں کیں، اور تبدیلیاں کیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام دوسرے نظریات زندگی اور مذاہب سے مختلف ہے کہ وہ ایک خالص اور الہامی دین ہے جو تمام انسانی افعال کے معاملات طے کرتا ہے اور ان کا اس طرح حل پیش کرتا ہے جو دونوں جہان میں اس کی خوشی کی ضمانت دیتا ہے: ﴿فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۖ وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ ۚ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَىٰ وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا ۚ﴾ قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَىٰ ﴿ طہ: 126-123 ﴾ "تو جو کوئی میری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہو گا اور نہ کسی مشکل میں گرفتار ہو گا۔ اور جو کوئی میری نصیحت سے منہ موڑے گا تو اس کو بڑی تنگ زندگی ملے گی، اور قیامت کے دن ہم اُسے اندھا کر کے اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ: "اے میرے پروردگار تو نے مجھے اندھا کر کے کیوں اٹھایا، حالانکہ میں تو آنکھوں والا تھا؟"، اللہ کہے گا: اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئی تھیں، مگر تو نے بھلا دیا، اور آج اسی طرح تجھے بھی بھلا دیا جائے گا۔"

اس طرح وہ جو اللہ کی ہدایات کی اس دنیا میں پیروی نہ کرے دراصل اندھا ہے اور سیدھی و سچی راہ سے بھٹک گیا ہے اور اس نے سچائی کو چھوڑ دیا ہے، ساتھ ہی اللہ نے اس دین کو کھوجانے اور نصوص کو تبدیل کرنے اور ملاوٹ کرنے والے ہاتھوں سے ہمارے لئے محفوظ کر دیا ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ {الحجر: 9} "حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

البتہ اللہ نے لوگوں کی نصوص کے فہم اور سمجھ کو گمراہ ہونے سے محفوظ نہیں کیا ہے۔ یہ حفاظت اور اس کو قائم و باقی رکھنا اللہ کی طرف سے انسانوں کے لئے اللہ کی ایک نشانی و معجزہ ہے، البتہ انسان بے راہ روی قبول کر کے گمراہی اختیار کر سکتا ہے، وہ نصوص کی تشریح ایسے معنی کے ساتھ کر سکتے ہیں جنہیں نص صحیح معنی قرار نہیں دیتی ہو اور وہ کتنی ہی بدعات گھڑ سکتے ہیں اور انہیں قبول کر کے اپنا سکتے ہیں لیکن یہ سب کمی و بیشی وہ صرف اپنی سمجھ کے اندر کر سکتے ہیں، وہ قرآن کی عبارتوں میں کچھ گھڑ نہیں سکتے، لہذا مسلمان پر لازم ہے کہ وہ ایک اچھے ایمان پر ہو اور مضبوطی کے ساتھ شرعی احکام پر پابند ہو اور راستی کے ساتھ اللہ السميع العليم کے فرمان پر استقامت کے ساتھ گامزن ہو اور مسلمان ذرہ برابر اس سے منحرف نہ ہو۔

یہ اسلام ہے جو ہر فیصلہ طے کرتا ہے اور مسلمان ہر اس فیصلہ پر ایمان لاتا ہے جو اسلام طے کرتا ہے۔ انسان کلی طور پر قانون سازی کے قابل نہیں، چاہے کوئی شخص کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو اور کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو کتنا ہی پختہ ایمان کیوں نہ ہو۔ حکم حاصل کرنے کے لئے انسان کو اپنے آپ کو نصوص (عبارتوں) کے سپرد کرنا ہو گا اور صرف عبارتوں کو استعمال کرنا ہو گا، چاہے وہ ابو بکر الصديقؓ ہی کیوں نہ ہوں، شاید یہی بات ابو بکرؓ بتلانا چاہتے تھے جب انہوں نے خلافت سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کی اطاعت کے تحت یہ فرمایا ”میری اطاعت کرو جب تک میں تمہارے متعلق اللہ کی اطاعت کروں اور اگر میں (اللہ کی) نافرمانی کروں تو مجھے کوئی حق نہیں کہ تم سے اطاعت طلب کروں، کیونکہ میں اطاعت گزار ہوں اور میں بدعتی نہیں ہوں۔“

ابو بکر الصديقؓ کا یہ بیان آپ ﷺ کے مندرجہ ذیل فرمان کی پابندی تھی: ((اتبعوا ولا تبتدعوا فقد كفيتم)) "تا بعد از بنو، نئی نئی چیزیں نہ گھڑا کرو، کیونکہ اب تمہیں سب کچھ مل چکا ہے۔"

یہ وہ اعلیٰ ترین باتیں ہیں جو ہم مسلمانوں کے افکار میں پاتے ہیں جب کہ دوسروں کے افکار میں ہمیں یہ باتیں نہیں ملتیں جو خود انسانوں کے مسائل کا حل پیش کرنے نکلے ہوں کیونکہ اسلام ان تمام افکار سے بنیادی طور پر جدا اور مختلف ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اطاعت کریں اور کبھی پست نہ ہوں اور پابند رہیں بجائے یہ کہ وہ کچھ نئی بدعت گھڑ لیں۔

اگر ہم نبی اکرم ﷺ پر وحی کے نزول کی شروعات سے لے کر آج تک دین کے متعلق مسلمانوں کی حالت دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں ہر ایک شے سے بڑھ کر دین کی محبت رہی ہے، ان میں سے کچھ نے خود کے متعلق یہ نظریہ قائم کیا کہ وہ اللہ کی عبادت میں دوسروں سے بہتر اور پکے ہیں اور وہ دوسروں کی باضابطہ اور صحیح عبادات کو حقیر جانتے تھے کیونکہ وہ دیکھتے تھے کہ وہ شرع کے تحت ان سے درکار عبادات سے کہیں زیادہ انجام دینے کے قابل ہیں، انہوں نے خود کو عبادات کرنے کے معاملے میں انتہا تک پہنچایا، مزید وہ اپنے نفس کی خواہش کے تحت عبادت کے ایسے نئے طریقہ کو گھڑ لیتے جس کے متعلق کوئی دلیل نازل نہیں ہوئی ہے، معاملہ پھر مزید آگے بڑھ جاتا جب وہ اس کو دوسروں پر نافذ کرنے کی کوشش کرتے اور جو قبول نہ کرتا اس کو عبادات میں ناقص و کم ظرف کے طور پر ظاہر کرتے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا شخص ہر معاملہ میں شرعی نصوص کی بنا پر اپنا ہر قول اور ہر عمل کو اپنی سمجھ بوجھ کی سختی اور رائے کی ہٹ دھرمی کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے، ایسا کرنا حرام ہے چاہے یہ اللہ اور اس کے دین کی محبت میں انجام دیا جائے، کیونکہ ایسا کرنے کو دین میں



تبدیلی پیدا کرنے کے عمل میں شمار کیا جائے گا اور اللہ الحکیم و حاکم کی متعین کردہ حدود ( دائرہ ) سے تجاوز کرنے میں شمار کیا جائے گا، چنانچہ اللہ وہ ہے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور ہم اس کی حکمت اور علم کا احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی ہم اس کی ذات و صفات کی حقیقت کو جانتے ہیں اور یہ معلومات کہ کون سی عبادات لازمی ہیں؟ البتہ اللہ ہی ان تمام معاملات کا جاننے والا ہے، چونکہ ہم اللہ کی خوشنودی کے خواہشمند ہیں تو اللہ کو اس کے فرمان پر ثابت قدمی اور استقامت سب سے زیادہ پسند ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے علم کے متعلق ہماری توجہ مبذول کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ {الملک: 14} "بھلا جس نے پیدا کیا وہی نہ جانے؟ پھر وہ باریک بین اور باخبر ہو۔"

بخاریؒ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں ”رسول اللہ ﷺ نے کچھ اعمال لوگوں کے لئے نرمی کے ساتھ انجام دیئے لیکن کچھ لوگوں نے اس کے لئے آپ ﷺ کی پیروی اختیار کرنے سے انکار کیا، نبی کریم ﷺ کو جب خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے اللہ کی حمد بیان کی اور فرمایا: ((ما بال أقوام يتنزهون عن الشيء أصنعه، فوالله إني أعلمهم بالله وأشدهم له خشية)) ”کچھ لوگوں کو کیا ہوا ہے جو ایک ایسی چیز سے احتراز برتتے ہیں جو میں کرتا ہوں؟ اللہ کی قسم! میں ان سب لوگوں سے زیادہ اللہ کے متعلق جانتا ہوں اور ان سب لوگوں سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں۔“

مزید یہاں زیادتیاں کرنے کے خلاف خبردار کیا جاتا ہے اور انہیں اسلام میں داخل ہونے کے لئے کہا جاتا ہے اور متانت و نرمی کے ساتھ اسلام سے سیراب ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، امام بخاریؒ رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((إن الدين يسر، ولن يشادَّ الدين أحد إلا غلبة، فسددوا وقاربوا، وبشروا، واستعينوا بالغدوة

والروحة وشيء من الدلجة)) " دین بہت آسان ہے اور جو شخص دین میں سختی اختیار کرے گا یہ دین اس کو مغلوب کر دے گا، پس سیدھے اور (اعتدال کے) قریب رہو، خوشخبریاں سناؤ اور صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے دین پر قوت حاصل کرو۔"

اور ایک روایت میں ہے کہ: ((وقاربوا وأعدوا وروحوا، وشيء من الدلجة، القصد القصد تبلغوا)) "(صراط مستقیم کے) قریب آجاؤ، سفر جلدی شروع کرو اور شام تک لوٹو اور رات کے اول اوقات کا استعمال کرو، میانہ روی اختیار کرو اور میانہ روی اختیار کرو تو تم اپنی منزل کو پا جاؤ گے۔"

اس نیک نیتی کے متعلق جو شدت پسندی اور زیادتی کے لئے جوش پیدا کرتی ہے، بخاریؒ اور مسلمؒ حضرت انسؓ سے لوگوں کے اس گروہ سے متعلق روایت نقل کرتے ہیں، جنہیں جب رسول اللہ ﷺ کی عبادت کے متعلق بتلایا گیا تو انہیں اپنی عبادت اُس کے مقابلے میں کم معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا "ہم رسول اکرم ﷺ سے کتنے دور ہیں، آپ کے لئے تو اللہ نے اگلے پچھلے تمام گناہوں کی مغفرت کی ہے۔" تو ان تمام نے مل کر عہد کیا کہ وہ اب رات میں قیام الیل کیا کریں گے اور تمام دن روزہ سے رہیں گے اور اپنی عورتوں سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ رسول اکرم ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا : ((أنتم القوم الذين قلتم كذا وكذا؟ أما اني أخشاكم لله وأنقاكم له، ولكني أصوم وأفطر، وأصلي و أرقد، وأتزوج النساء)) "تم وہی لوگ ہو جنہوں نے ایسا اور ایسا کہا ہے؟ بے شک میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور روزہ کھولتا بھی ہوں، میں نماز پڑھتا ہوں اور راتوں میں سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں۔"

اور پھر آپ ﷺ نے اس حدیث کو یہ فرماتے ہوئے ختم کیا : **((فمن رغب سني فليس مني))** ”جو کوئی بھی میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے“

یہ بتلاتا ہے کہ اللہ کسی بھی عمل کو قبول نہیں کرتا سوائے جس کے متعلق اللہ نے فرمان دیا ہو، انسان جو نئے معاملات گھڑتا ہے یا جس کا اضافہ کرتا ہے ایسا کرنا اللہ سے قربت اختیار کرنا ہرگز نہیں ہے، ابو داؤد اپنی سنن میں ایک ایسے شخص کے متعلق روایت کرتے ہیں جس نے اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا ”اے اللہ کے نبی ﷺ یہ کیسا ہے کہ ایک شخص ہمیشہ روزہ سے رہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: **((ما صام ولا أفطر))** ”وہ ایسا ہے کہ جس نے کبھی روزہ نہ رکھا اور نہ کبھی افطار کیا“

امام احمد روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ایک شخص جس کی ماں نے اللہ سے نذرمانی تھی کہ وہ پیدل حج کرے گی، اس سے فرمایا: **((مرها فلتركب، إن الله لغني عن مشيها))** ”اس کو کہو سواری پر سوار ہو جائے، اللہ کو اس کے پیدل چلنے کی کوئی ضرورت نہیں“

امام البخاری حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ”جب نبی کریم ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہوا ہے، نبی اکرم ﷺ نے اس کے متعلق دریافت کیا، انہوں نے آپ ﷺ کو بتلایا کہ ابو اسرائیل نے اللہ سے نذرمانی ہے کہ وہ کھڑا ہی رہے گا اور بیٹھے گا نہیں، وہ سایہ بھی استعمال نہ کرے گا اور کبھی بات چیت نہیں کرے گا اور وہ مستقل روزہ رکھے گا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا : **((مروه فليتكلم. وليستظل وليقعد وليتم صومه))** ”اس کو کہو بولے اور سایہ کو استعمال کرے، اسے بیٹھنے کا حکم کرو اور روزہ مکمل (ختم کرنے کا حکم دو“

شدت پسندی اور زیادتی اختیار کرنے کے نتیجہ میں جو تباہی و بربادی حاصل ہوگی اسے نبی اکرم ﷺ کی یہ حدیث بیان کرتی ہے جسے امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے: **((هَلِكِ الْمُتَنَطِعُونَ))** ”شدت پسند یا ہٹ دھرم ہلاک ہو گئے“

آپ ﷺ نے تین دفعہ یہی فرمایا۔ احمدؒ، النسائیؒ اور ابن ماجہؒ کی روایت میں ہے، مندرجہ ذیل الفاظ ابن ماجہؒ کے ہیں: **((يَا أَيُّهَا النَّاسُ، إِيَّاكُمْ وَالْغُلُو فِي الدِّينِ فَإِنَّمَا أَهْلُكَ مِنْ كَانَ قَبْلَكُمْ الْغُلُو فِي الدِّينِ))** ”اے لوگو! دین میں شدت سے باز رہو، بے شک تم سے قبل لوگوں کو دین میں غلو (حد سے تجاوز کرنے) نے تباہ کیا ہے“

سختی اور شدت پسندی کے متعلق جو بتلایا گیا ہے وہ ذمہ داریوں سے غفلت برتنے والوں پر بھی لازم آتا ہے، اس کے نتائج کا ان پر بھی اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ وہ دین میں اصلاً یقین تو رکھتا ہے لیکن اپنی ذمہ داریوں سے کوتاہی برتتا ہے اور اپنی خواہشات پر منحصر رہتا ہے بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا رہتا ہے اور موت سے قبل توبہ کا وعدہ خود سے کرتا ہے، جیسے کہ وہ اپنی زندگی کی مدت کے متعلق غیب کا علم رکھتا ہے! یہ حرام ہے، مسلمان پر لازم ہے کہ وہ جلد از جلد اسلام کو مکمل طور پر اختیار کر لے اور بہترین فرمانبرداری کے علاوہ خود سے راضی نہ ہووے، ورنہ اس کا برتاؤ اللہ کے سیدھے اور سچے رستے سے گمراہی اور بھٹک جانے میں شمار ہوگا۔

جس طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مسلمانوں کو انفرادی حیثیت میں زیادتی اور غلو (شدت پسندی) سے منع کیا اور اس پر انہیں تنبیہ دی، اسی طرح اس کے متعلق تمام مسلمانوں کو جماعت، ریاست اور علماء کی حیثیت میں بھی خبردار کیا ہے۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر داعیوں میں سے بہت سے مسلمان اور ان کے علماء اسلام کی محبت میں آگے بڑھتے ہوئے اسلام کی ایک نرم، آسان اور

غیر تکلیف دہ تصویر پیش کرنے کی کوشش میں اس معاملہ کے متعلق بہت دور نکل جاتے ہیں، وہ ساری حدیں پار کر لیتے ہیں اور اسلام کے متعدد احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اسلام کی شرعی عبارتوں سے بے تعلق رائے پیش کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کے ذریعے کھینچی گئی خط مستقیم سے بھٹک جاتے ہیں۔ انہوں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا تاکہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کریں جو زمانہ کی حقیقت کو قبول کرے اور زمانہ کے معیار کے مطابق ہو اور وقت کے ساتھ ترقی اختیار کرنے والی ہو اور جو زمانہ کے ہمنوا ہو، حتیٰ کہ انہوں نے اس تصویر کو اتنا چمکدار کر دیا کہ اسے تان کر شرعی احکام کو معطل کرنے کی حد تک لے گئے جن پر پابندی امت تسلیم کرتی ہے۔ حتیٰ کہ انہوں نے نصوص (عبارتوں) کی من مانی طریقے پر گمراہ کن تشریح بھی کی۔ وہ اس رائے پر پہنچے کہ مرتد (دین تبدیل کرنے والا) کو قتل نہیں کیا جاتا حالانکہ نبی کریم ﷺ کے واضح الفاظ موجود ہیں: **((من بدل دینہ فاقتلوه))** ”جو کوئی بھی اپنا دین (اسلام) تبدیل کرے اسے قتل کر دو“۔ (بخاری و احمد)

وہ اس رائے پر اس عذر کے ساتھ پہنچے کہ حالات اور زمانہ کی حقیقت جس میں رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا ہماری حقیقت اور ہمارے حالات سے مختلف تھی، یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تاکہ مذہبی آزادی کے مغرب کے موقف سے اس معاملہ کو ہم آہنگ بنایا جاسکے، وہ اس رائے پر پہنچے کہ عورت کے لئے امامت کا عہدہ اختیار کرنا جائز ہے حالانکہ نبی کریم ﷺ کی حدیث موجود ہے۔ **((لن یفلح قوم ولّوا أمرهم امرأة))** ”ایسی قوم ہرگز فلاح نہیں پاسکتی جو عورت کو حکمران بنائیں“ (بخاری، نسائی، احمد، ترمذی)

وہ اس رائے پر اس عذر کے تحت پہنچے کہ حدیث ایک مخصوص واقعہ کے تحت بیان ہوئی ہے اور اس کو عام نہیں کیا جاسکتا ہے، انہوں نے ایسا اس لئے کیا تاکہ اسلام کی ایک ایسی تصویر پیش کر سکیں

جوان کے زعم میں عورت کو عزت بخشی ہو، جو مغرب کے نظریہ آزادی نسواں کی موافقت میں ہو۔ مزید انہوں نے سودی لین دین کی اجازت دے ڈالی اس کے لئے انہوں نے یہ بہانہ تراشا کہ بین الاقوامی تعلقات کے دباؤ بھرے ماحول میں اس سے بچ پانا غیر ممکن ہے۔

ان تمام کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلام کے حقوق تباہ کر دئے جاتے ہیں اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ اسلام دنیا میں زندگی کے معاملات طے کرنے کا اہل نہیں ہے۔ کمزوریاں جو وہ ظاہر کرتے ہیں دراصل ان کی اپنی کمزوریاں ہیں اور اسلام کی اس میں کوئی کمزوری نہیں ہے۔ جو عامل افراط (زیادتی و شدت پسندی) کے پیچھے کار فرما ہوتا ہے، وہی تفریط (نظر اندازی) کے پس پشت بھی کار فرما ہوتا ہے یعنی ”دین سے جہالت اور انسان کے بارے میں لاعلمی“۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں صنف دین میں خود کو تباہ کر دیتے ہیں (ایک قسم کے افراد، تفریط (کمی کرنے) کا شکار ہوتے ہیں تو دوسری قسم کے افراد افراط (زیادتی اور شدت پسندی) کا شکار ہوتے ہیں)، یہ دونوں اقسام اپنے حواس و ہوس کے اسیر ہوتے ہیں۔ پہلی قسم کے افراد اپنی حیلہ پروری کو مطمئن کرنے کی خواہش کرتے ہیں اور دوسری قسم کے افراد لوگوں کو خوش کرنے کی کوشش میں اللہ کی خوشنودی سے بہت دور چلے جاتے ہیں۔

ان دونوں حالتوں کے مقابلے میں ہم پر لازم ہے کہ اللہ کے حکم کو مضبوطی سے تھام لیں اور کسی قسم کی غفلت (تفریط) زیادتی اور شدت پسندی (افراط) میں نہ پڑیں۔ اسی نقطہ نظر سے ہم اللہ کے اس فرمان کو سمجھتے ہیں: ﴿وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا﴾ {البقرة: 143} ”اور (مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ بنے۔“

دوسرے لفظوں میں اللہ نے اس امت کو لوگوں کے اوپر شاہد عدل (درست گواہی دینے والا) بنا کر بھیجا ہے جس طرح نبی کریم ﷺ امت پر گواہ ہیں، اس بنا پر یہ امت بہترین اور عظیم امت بن جاتی ہے، انسانوں کے درمیان اس کی مرتبہ و مقام ایک پہاڑ کی چوٹی کی طرح ہے جس کا مقام سب سے اونچا اور مرکزی ہوتا ہے۔ ہم اس آیت کی تشریح اس طرح نہیں کرتے جس طرح مغرب سمجھوتے اور حل وسط پر قائم نقطہ نظر کے تحت اس کی تشریح کرتا ہے، یہ حرام ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا۔ تو عقیدہ سمجھوتہ اور لین دین کی بنیاد پر حاصل شدہ حل پر قائم نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ حل خود کفر ہے۔ یہ معاملہ کفر اور ایمان، نور اور تاریکی، ہدایت اور گمراہی میں سے ایک ہے۔ جہاں تک شرعی حکم کے موضوع سے متعلق ہے تو پہلے یہ گزر چکا ہے اور ہم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا قانون بنانے والا اور اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا حاکم نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہے جو اس کے فیصلہ کو تبدیل کر سکے، وہ بہترین اور اعلیٰ منصف ہے۔

یہ ہے وہ سمجھ جو مغرب نے شدت پسندی اور میانہ روی کے متعلق اختیار کی ہوئی ہے، اور یہ ہے اس کا اسلامی مفہوم۔ تو اب آپ دیکھیں کہ آیا کہیں یہ دونوں آپس میں مل بھی پاتے ہیں؟ مغرب کے موقف کے پس پشت اس کی نیت ایسی ہر شے کو تباہ کرنے کی ہے جو اس کے وجود اور استعمار کے لئے خطرہ کے طور پر محسوس کرتا ہے، ایسے میں کیا ہمیں مغرب کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کو قابو میں رکھنے کے لئے مسلمانوں کی گردنوں پر مغرب کو تسلط اور غلبہ دلا دیں؟ مغرب سے تعاون کرنے کا مطلب ان مسلمانوں کے خلاف مغرب کی مدد کرنا ہے جو اسلام کے لئے سرگرم ہیں، اللہ سبحانہ و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءٍ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿113-112﴾ {ہود: 113-112} "لہذا (اے

پنچیر!) جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق تم بھی سیدھے راستے پر ثابت قدم رہو، اور وہ لوگ بھی جو توبہ کر کے تمہارے ساتھ ہیں، اور حد سے نہ نکلے۔ یقین رکھو کہ جو عمل تم کرتے ہو، وہ اسے پورے طرح دیکھتا ہے۔ اور (مسلمانو!) ان ظالم لوگوں کی طرف ذرا بھی نہ جھکنا، کبھی دوزخ کی آگ تمہیں بھی نہ آپکڑے، اور تمہیں اللہ کو چھوڑ کر کسی قسم کے دوست میسر نہ آئیں، پھر تمہاری کوئی مدد بھی نہ کرے۔“

ہمارے دلوں میں اس دین کے لئے خیر خواہی اور بھلائی موجزن ہے اور ہمارے دل اس کے غلبہ کی تمنا رکھتے ہیں، اللہ کی مدد اور توفیق سے لوگوں کے دل اور دماغ اس دین کو نصرت دینے کے لئے کھل جائیں گے، ان شاء اللہ۔ جو بھلائی ہم اپنے لئے چاہتے ہیں وہی بھلائی ہم دوسروں کے لئے بھی چاہتے ہیں اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اس خیر خواہی کو اس بارش کی طرح بنادے جس سے وہ لوگوں کے دلوں اور اذہان کو دوبارہ زندہ کر دے، اللہ ہی ہے جو صراطِ مستقیم دکھلا سکتا ہے۔